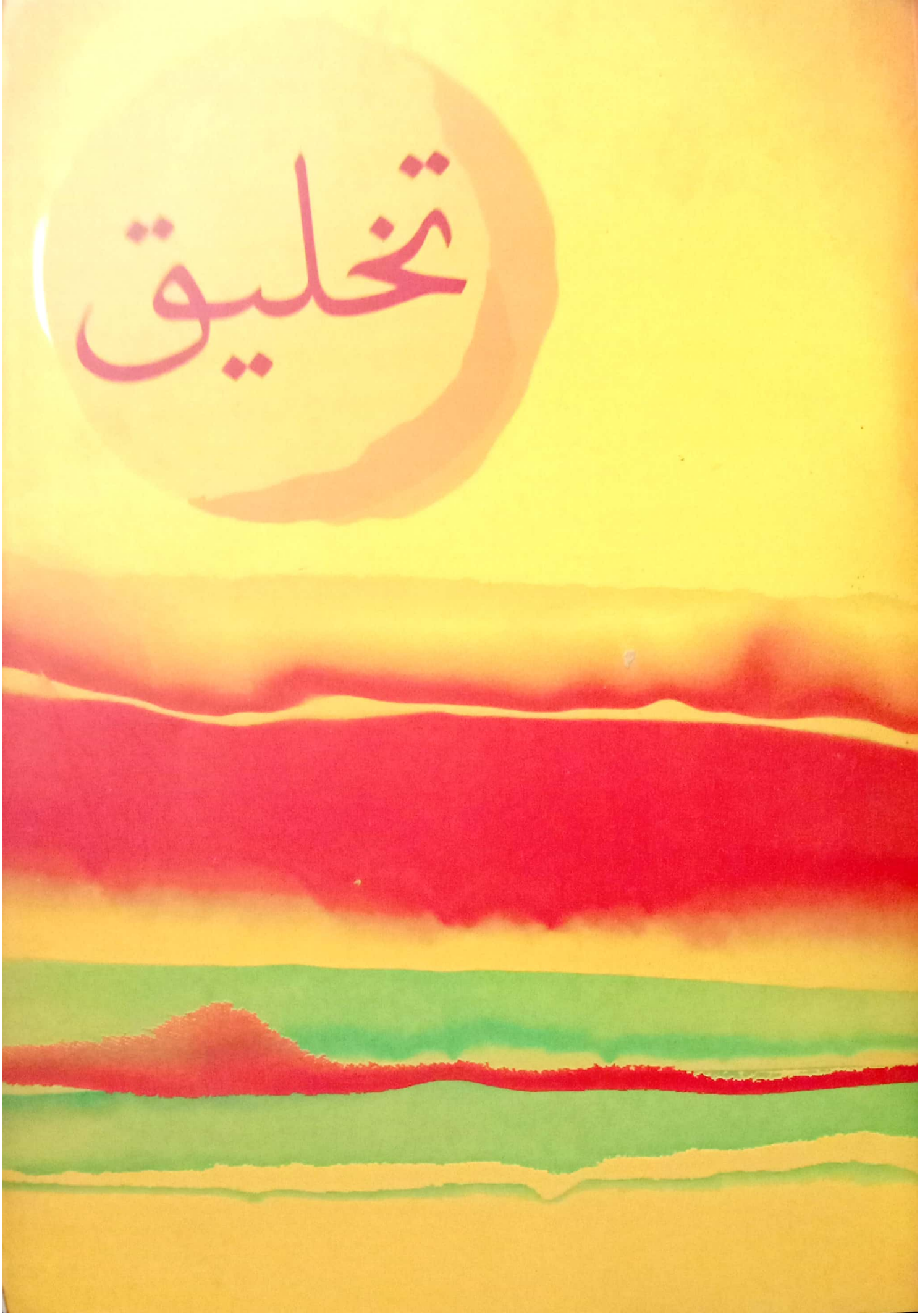

تخلیق

CamScanner

اشاعت کا مسلسل 44واں سال

ماہنامہ تخلیق لاہور

بانی مدیر اظہر جاوید

عرصہ ادارت 2012 - 1969ء

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 44	ستمبر 2013ء	شمارہ : 9

قیمت فی پرچہ : 100روپے ..... سالانہ : 500روپے (سالانہ100ڈالر بیرون ممالک)

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki,
Super Town, Lahore-Cantt.

فون نمبرز: 04236620499۔04236671007.....موبائیل فون:03218899007

ای میل:ajavedtakhleeq@yahoo.com.....ajavedtakhleeq@gmail.com

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخر سانس تک جاری رکھیں گے۔انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 رفروری 2012ء کو اپنی جان..... جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود..... میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔(انشا اللہ) جو مدیر اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کی باقاعدہ اشاعت کے لئے ''تخلیق فاؤنڈیشن'' قائم کی جا رہی ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے دفتر ''تخلیق'' کی تبدیلی اور پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ اور ہندوستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، تاشی ظہیر اور نارنگ ساقی نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لئے زرِتعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لئے زرِسالانہ صرف 1,000 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا نیا پتہ: **E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt**

PAKISTAN
Soonan Azhar
E/13/13C-1, Bismilla
Lane, Cavalary Ground, Officer
Colony, St.No.7 Walton
Lahore-Cantt.
Ph: 04236671007
Cell : 0321-8899007
Email:ajavedtakhleeq@gmail.com
Email:ajavedtakhleeq@yahoo.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: 0091-41517818
Email:narangsaqi@gmail.com

U.S.A.
Naiyar Jahan
721-Hill Street
111-Santa Monica
C.A. 90405, U.S.A.
Ph : 0013103969303
Email:Zihanat@hotmail.com
urdu@urdu markaz.com

U.S.A.
Tashie Zaheer
591-Sylvanave
Mountain View
C.A.94041
U.S.A.
Ph: 0015107503297
Email: tzaheer@gmail.com

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

نعت

نعتِ رسولِ مقبولؐ — نورین طلعت عروبہ — 7
نعتِ رسولِ مقبولؐ — حسن اعزاز — 7

مضامین

ادب، نظریہ اور تخلیقیت — مسلم شمیم — 8
مسلم فکری دھارے کا بہاؤ...... — ظفر سپل — 13
امیر الاسلام ہاشمی...... — ڈاکٹر غلام شبیر رانا — 21

منظومات

خواب سے بوجھل پلکیں — امین راحت چغتائی — 25
امرتا پریتم — حسن عسکری کاظمی — 25
نیا سال — شاہین — 26
رباعیات — مامون ایمن — 26
ایک مرتے ہوئے آدمی کے لیے — ایوب خاور — 27
قطعات — اعزاز احمد آذر — 28
گونگے لوگ — انوار فیروز — 28
سچائی کا زہر — ڈاکٹر محبوب راہی — 29
ماہیے — سلطان کھاروی — 30
بَن — ڈاکٹر طاہر سعید ہارون — 30
تروینیاں — فوقیہ مشتاق — 31
چشمہ پھوٹ نکلے — آفتاب راجہ — 31

افسانے

اپنی اپنی بلّی — ڈاکٹر رشید امجد — 33
کالی اور گوری عقل مند لڑکیاں — سلمیٰ اعوان — 38
اعتراف — پیروز بخت قاضی — 45
تین آنکھوں والی لڑکی — محمد طارق علی — 49
خدا سب یاد رکھتا ہے — آصفہ نشاط — 59
بے بس — عزیز جبران انصاری — 75
پرانی پوستین — سلمان ڈار — 79
ڈھونگ — زہیرہ سمن علی — 83
اک رُلانے والا لطیفہ — اظہر جاوید — 85

غزلیں

ظفر اقبال، سیّد مشکور حسین یاد، اسلم گورداسپوری، امجد اسلام امجد، محمود شام، ناصر زیدی، بسمل صابری، زہیر کنجاہی، قیصر نجفی، ڈاکٹر شیخ اقبال، خورشید بیگ میلسوی، نسیم سحر، ڈاکٹر خالد اقبال یاسر، انوار فیروز، صفدر صدیق رضی، عرفان صادق، ناصر علی سیّد، سیفی سرونجی، پرتپال سنگھ بیتاب، کرشن کمار طور، حفیظ انجم کریم، نجمہ عثمان، رشیدہ عیاں، مرزا شبیر بھیروی، اکرام تبسم، فرزند علی شوق، ندیم ہاشمی، اوصاف شیخ، پروین بسمل، آسناتھ کنول — 88 تا 103

یادنگاری

دوسرا رُخ — ڈاکٹر رشید امجد — 104
گورنمنٹ کالج...... چند بھولی بسری یادیں — سرفراز سیّد — 108

آپ بیتی

بھارت سے پاکستان تک — علی سفیان آفاقی — 113

تمھیں یاد ہو..... عزیز میرٹھی 116

سفرنامہ

سفرِ شمال طارق محمود 120

سورج کے رُخ پر ڈاکٹر ابدال بیلا 123

طنز و مزاح

پڑیے ''گھر'' بیمار ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی 128

آئینے ڈاکٹر محسن مگھیانہ 131

جائزے

''بابونگز'' کا مزاح نگار..... انور سدید 134

خس و خاشاک زمانے سیمی کرن 140

خوابیدہ خطوط

اظہر جاوید کے خطوط۔ معاصرین کے نام 144

پنجاب رنگ

نعت مامون ایمن 147

تن نظماں حنیف باوا 147

اچھے سنگ ساتھی نُور زمان ناوک 148

اِک نظم منزہ شاہد 148

تبصرے

ڈاکٹر انور سدید 149

آفتاب خان

شفیع عقیل

محمد متین ندوی 153

انجمن خیال (خطوط)

ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، ڈاکٹر سلیم اختر، انوار فیروز، ڈاکٹر محبوب راہی، حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، سکندر حیات میکن، پروفیسر زہیر کنجاہی، اکرام تبسّم، خورشید بیگ میلسوی، عزیز میرٹھی، نجیب عمر، ناصر زیدی، نذیر فتح پوری، آفتاب راجا، اسلم سحاب ہاشمی، تصور اقبال، ندیم ہاشمی، مسعود تنہا، نعیم الرحمٰن، فصیحہ آصف خان 166

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب 167-168

ملکی اور غیر ملکی

سرورق

انیس یعقوب

ناشر سونان اظہر جاوید

طابع بیدار سرمدی

قانونی مشاورت لطیف قریشی، سیّد شاہد بخاری

مطبع بُکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقامِ اشاعت

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk,
Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt

o بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط o

پہلی بات

اپنی تعلیم کی تکمیل اور عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد میرے دل میں دو تمنّائیں ہمیشہ پرورش پاتی رہیں:

اوّل: میرے والدِ محترم اظہر جاوید مجھے ''تخلیق'' کی ادارت میں شامل کرلیں۔

دوم: اللہ میرے نصیب میں اپنے گھر (**بیت اللہ**) اور **روضۂ نبویؐ** کی زیارت لکھ دے۔

میری پہلی آرزو اظہر جاوید کی زندگی میں پوری نہ ہوئی۔ انہوں نے 14 رفروری 2012ء کو اچانک اپنا رختِ حیات سمیٹ لیا اور میں نے ادارتی عدم تربیت کے باوجود ''تخلیق'' کی وراثت کو سنبھالنا اور اس کی اشاعت کا تسلسل برقرار رکھنا ضروری سمجھا۔ جون 2013ء کا شمارہ حلقہ ''تخلیق'' میں تقسیم کر کے اپنے رب کے حضور میں شکرانے کے نوافل پڑھ کر ''تخلیق'' کے کرم فرماؤں، لکھنے والوں اور قارئین کے لئے دعا مانگ رہا تھا کہ میری بیوی سعدیہ نے کہا ''اللہ سے درخواست کرو کہ شکرانے کے نوافل اپنے گھر میں ادا کرنے کا موقعہ عطا کرے۔'' قبول دعا کی اس ساعتِ سعید میں مجھے سعدیہ کا پاسپورٹ بنوانے کا خیال آیا تو اس کے ساتھ میں نے اپنی درخواست بھی نتھی کر دی۔ حالاں کہ سعدیہ کے پاسپورٹ کے اجراء کے لئے ارجنٹ کی درخواست دی گئی اور اپنے پاسپورٹ کے لئے روٹین کی درخواست جمع کروائی تھی۔ اب خدا کی شان دیکھیے کہ بہت قلیل سے وقت میں دونوں پاسپورٹ بن کر آ گئے۔ اپنی تمناؤں کے دوسرے مرحلے کی تکمیل کے لئے میں اور سعدیہ جون کے مہینے میں ہی عمرہ کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں 14 دن قیام کا تجربہ اتنا روح پرور تھا کہ میں اسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا اور حیرت زدہ ہوں کہ اس تجربہ سے گزرنے والے سفرنامہ کیسے لکھ لیتے ہیں؟ میں نے کعتبہ اللہ اور مسجد نبویؐ میں ہر حاضری کے دوران سب سے پہلے اپنے والد کی مغفرت اور ''تخلیق'' کی اشاعت کے تسلسل کی دعا کی اور اس کے ساتھ ساتھ اظہر جاوید کے دوستوں، تخلیق کے کرم فرماؤں اور قلمی معاونین کی صحت مند زندگی اور قلم کی توانائی برقرار رکھنے کی دعائیں بھی کیں۔ ہر دعا کے بعد مجھے قلبی طمانیت محسوس ہوتی اور مجھے یقین سا ہو جاتا کہ ربِ جلیل نے میری دعا قبول کر لی ہے اور ''دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رہے گا''۔

عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد لاہور واپس آیا تو دیکھا کہ جون کے شمارے پر خطوط کا انبار دفتر میں جمع ہو چکا تھا۔ مجھے بے پایاں خوشی ہوئی کہ اُردو دنیا کے نامور اہلِ قلم نے میری معمولی ادارتی خدمت کو سراہا تھا اور ''تخلیق'' میں شمولیت کو اپنا اعزاز قرار دیا تھا اور اس کے ساتھ قلمی تعاون جاری رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں سے چند خطوط زیرِ نظر اشاعت میں ''انجمنِ خیال'' میں پیش کیے جا رہے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اظہر جاوید کی دوسری برسی 14 رفروری 2014ء میں ادبی دنیا کی دو نامور شخصیات کی خدمت میں ''تخلیق ایوارڈ'' پیش کیا جائے گا۔ 2013ء میں پہلی برسی پر **جناب شفیع عقیل** اور **ڈاکٹر انور سدید** اس ایوارڈ کے لئے منتخب ہوئے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ''تخلیق'' کے قارئین نے اس انتخاب کی بھرپور تائید کی۔

سابقہ پرچوں میں متعدد مرتبہ لکھا گیا ہے کہ ''تخلیق'' لکھنے والوں کا پرچہ ہے اس کا دل وسیع لیکن ضخامت محدود ہے۔ یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ الفاظ کی دولت کو کفایت سے استعمال کیا جائے اور ''انجمن خیال'' میں ''تخلیق'' کے سابقہ پرچے کے مضامین نظم و نثر پر دیانت دارانہ، صحت مند تنقید کی جائے اور مدیر کی کاوش پر مبالغہ آمیز تحسین و تعریف سے گریز کیا جائے۔ اس گزارش پر عمل

کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ادارہ ''تخلیق'' اس حقیقت سے آشنا ہے کہ رسائل ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں اور قلم کاروں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تخلیق زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچے۔اس خواہش کی تکمیل کے لئے بعض لکھنے والے اپنی نگارشات ایک سے زیادہ ادبی رسائل کو بھجوانے کی عادت میں مبتلا ہیں جبکہ ہر ادبی رسالہ اپنے معزز قارئین کو نئی اور غیر مطبوعہ تخلیقات پیش کرنے کا دعوے دار ہوتا ہے۔حال ہی میں ایک ایسی مثال بھی سامنے آئی ہے کہ ایک معروف ادیب نے تین مختلف نام (ان میں ایک نسوانی نام بھی ہے) اختیار کر رکھے ہیں جو ادبی اخلاقیات کے خلاف ہے۔رسالے کی محدود ضخامت کی وجہ سے یہ دوسرے قلم کاروں کے حقوق اشاعت پر **''ڈاکے''** کے مترادف ہے۔

''تخلیق'' کے لکھنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی نگارشات کے آخر میں **''غیر مطبوعہ''** ہونے کا اظہار ضرور کریں اور ''تخلیق'' کو بھیجے گئے مضامین کسی دوسرے رسالے کو ارسال کرنے سے پہلے اشاعت کے لئے عدمِ قبولیت کی تصدیق کو نظر انداز نہ فرمائیں۔

.....

یوم آزادی پر ادبی ایوارڈز

14/اگست 2013ء کو یوم آزادی پر صدر پاکستان نے مندرجہ ذیل ادیبوں کو سرکاری ایوارڈز سے سرفراز کیا۔ادارہ ''تخلیق'' انہیں مبارک باد پیش کرتا ہے۔

(الف) **ہلال امتیاز (ادب)** 1- جناب ظفر اقبال 2- جناب عرفان صدیقی 3- جناب عطاالحق قاسمی

(ب) **ستارۂ امتیاز (ادب)** 1- جناب شہزاد احمد (مرحوم) 2- ڈاکٹر طارق رحمان

(ج) **حُسن کارکردگی (پرائیڈ آف پرفارمنس) ادب**

1- ڈاکٹر تبسّم کاشمیری 2- ڈاکٹر یونس جاوید 3- ایوب خاور 4- آغا خالد سلیم 5- پروفیسر ولی محمد سیال کاکڑ

(د) **تمغۂ امتیاز (ادب)**

1- پروفیسر ڈاکٹر نذیر تبسم 2- جناب غوث بخش کاکیاری 3- جناب افضل مراد 4- پروفیسر قلندر شاہ

واضح رہے کہ اظہر جاوید ''مدیر تخلیق'' کو 14/اگست 2011ء کو ان کی زندگی میں ''پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ'' دیا گیا تھا لیکن وہ 14/فروری 2012ء کو وفات پا گئے اور 23 مارچ 2013ء کو یہ ایوارڈ راقم سونان اظہر جاوید نے وصول کیا۔

.....

وفیات : 2013ء کا سال ادبی دنیا کے لئے بے حد غم ناک ثابت ہو رہا ہے۔گزشتہ چند مہینوں کے دوران پاکستان اور ہندوستان کے جو نامور ادبائے کرام اس دنیا سے اُٹھ گئے ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، قنبر علی عباسی، انوار فیروز، ریاض الرحمٰن ساغر، ڈاکٹر نذیر قیصر، اختر پیامی، پروفیسر حنیف نقوی، اصغر علی انجینئر، سیّد امین اشرف، کبیر احمد جائسی، پروفیسر تنویر احمد علوی اور نقاد سکندر احمد شامل تھے۔ان کی وفات پر سوگوار ''ادارۂ تخلیق'' شدید احساس غم میں مبتلا ہے کہ **''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے''**

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

نورین طلعت عروبہ

نعتِ رسولِ مقبولؐ

طیبہ کی فضاؤں سے وہ انوار بُلائیں
کیا اس میں عجب ہو کہ جو سرکار بُلائیں

دُنیا کے گُل و لالہ سے رغبت نہیں رہتی
جب شہرِ مدینہ کے چمن زار بُلائیں

تقدیر کی خُوبی کو مَیں نزدیک سے دیکھوں
گر بارِ دگر، سیّدِ ابرار بُلائیں

یارب! کبھی عشّاق کے جذبے پہ نظر کر
خوابوں میں اُنھیں طالبِ دیدار بُلائیں

کیسے نہ خیال اُن کا مسیحائی کو آئے
رو رو کے نبی پاکؐ کو بیمار بُلائیں

ہے غم کا مداوا تو وسیلے سے اُنہی کے
کہہ کہہ کے اُنھیں آپ جو غم خوار بُلائیں

لپکو کو یہ اعزاز سبھی کو نہیں مِلتا
دوڑو کہ اگر آپؐ کے افکار بُلائیں

OOO

حسن اعزاز

نعتِ رسولِ مقبولؐ

آپؐ سرکار موتیوں والے
میں خطا کار! موتیوں والے

خواب افضل مری حقیقت سے
ہو جو دیدار موتیوں والے

آپ کا شہر، امن کا گہوارہ
یہ مرا دیار موتیوں والے

چاند، سورج کو روشنی بخشے
وہ حسیں غار موتیوں والے

آپؐ رحمت، سراپا رحمت ہیں
ہم گنہگار موتیوں والے

آپؐ کا عشق، دوستی، ایثار
اور ''وہ چارؓ'' موتیوں والے

OOO

مضامین

ادب، نظریہ اور تخلیقیت

مسلم شمیم

عہدِ جدید، جس کا آغاز یورپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) سے ہوتا ہے، کی خصوصیات میں اہم ترین خصوصیات مختلف نوعیت اور جہت کی دریافتیں (Discoveries)، سائنسی ایجادات (Scientific Inventions) اور انقلابات (Revolutions) شامل ہیں۔ دریافتوں اور ایجادات کی ایک طویل فہرست ہے جس نے حالاتِ زیست کے ساتھ سوچ اور اقدار کی دنیا کو بڑی بنیادی تبدیلیوں سے روشناس کرایا۔ اہم ترین انقلابات میں اٹھارویں صدی میں برطانیہ میں برپا ہونے والے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution)، انقلابِ فرانس (1789ء) اور روس کے اشتراکی انقلاب (1917ء) نے نئے عہد کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا اور معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی میں دوررس انقلابی تبدیلیوں اور امکانات کے لیے راہیں ہموار کیں۔ اِن انقلابات کے بطن سے متعدد منفی اور مثبت نظریات کا عالمی منظر نامے پر ظہور ہوا۔ اِن نظریات کے دائرے میں فسطائیت (Fascism) اور اشتراکیت (Socialism) بیسویں صدی میں رونما ہونے والے وہ نظریات ہیں جن سے کرۂ ارض کا چپا چپا متاثر ہوا اور فکر و شعور کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ مذکورہ نظریات کے علاوہ جہانِ فکر و دانش میں متعدد متنازعہ نظریات اور رجحانات ابھرے اور اپنے اثرات مرتّب کیے جن میں نراجیت (Anarchism) اور وجودیت (Extentialism) کے نظریات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر اور قابلِ توجہ رہے ہیں۔ وجودیت کے فلسفے کا اظہار ادب و فن میں جدیدیت (Moderinity) کے نام سے ہوا۔ وجودی فلسفے کے مطابق انسان صرف فردِ واحد ہے، نہ فردِ واحد سے کم اور نہ فردِ واحد سے زیادہ اور اِس کائنات میں وہ تنہا ہے۔ اُس کے اطراف خوف، دہشت اور اندیشوں کے گہرے سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے وجود یا ہونے کا کرب تنہا برداشت کرتا ہے۔ وجودیت کا یہی روّیہ اور تصوّر مختلف انداز میں گوگول، دوستووسکی، کافکا، نطشے اور سارتر کے یہاں پایا گیا وجودی مفکّروں کے نزدیک انسان کا ہونا اور مرنا جبر ہیں۔ اِس روّیے نے ادب میں فردیت (Individualism) ابہام، احساسِ تنہائی اور مسلمہ ادبی قدروں سے انحراف کی صورت پیدا کی۔ معاشرے میں اِس سے نراجیت کا رجحان پیدا ہوا، سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں فرد کی آزادی کے نام پر فرد پرستی اور معاشرہ بیزاری کے رجحانات کا فروغ ہوا۔ اِس کی وجہ یہ نہیں کہ فرد اور معاشرہ دو متضاد چیزیں ہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اِس منفی رجحان کا اصل سرچشمہ ہے اور یہ فکر کہ فرد ہی سب کچھ ہے اور معاشرہ اُس پر ایک جبر ہے، اِسی نظریہ کا تنہا شاخسانہ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ فرد اور معاشرہ کوئی دو الگ الگ اور باہم متضاد حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ افراد کے باہمی رشتوں کی کلی عملی صورت کو معاشرہ کہتے ہیں جو بہتر زندگی کے حصول کی جد و جہد میں استوار ہوتا ہے۔ فردیت کے نظریے کے مدِمقابل اجتماعیت

(Collectivism) کے نظریے مختلف صورتوں میں مختلف ادوار میں صفحۂ تاریخ پر ابھرے جن میں مذکورہ فسطائیت کا منفی نظریہ اور اشتراکیت کا مثبت نظریہ غالب موضوعات کے طور پر بیسویں صدی میں زیرِ بحث رہے۔

بیسویں صدی خاص طور پر عہدِ جدید کی وہ صدی ہے جس میں دریافتوں اور ایجادات یعنی سائنسی معجزوں نے انسانی معاشرے میں ایسی تیز رفتار تبدیلیاں پیدا کیں کہ اِس صدی میں نئے نظریات کی نشو ونما اور اُن کے زیرِ اثر انقلابات کا برپا ہونے کا ایک لامتناہی سلسلہ ملتا ہے۔ مذکورہ نظریات میں اشتراکیت اور فسطائیت نے خصوصیت کے ساتھ دنیائے ادب کو کثیر الجہت عمل اور ردِ عمل کے عوامل سے دوچار کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران 1917ء میں انقلابِ اکتوبر کا ظہور پذیر ہونا اور پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد 1930ء کے عشرے میں فسطائیت کا بھیانک جن جرمنی، اٹلی اور جاپان کی سرزمین پر نمودار ہوا اور اُس نے دنیا کو دوسری عالمی جنگ کی ہولناکیوں سے دوچار کیا۔ فسطائیت نے جہاں قوموں کی آزادی کو سلب کرنے کی مہم کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا، وہیں ادب وثقافت پر شب خون مارنے کی منظّم حکمتِ عملی اپنائی اور اِس طرح انسانی تہذیب وتمدن کو سنگین خطرات سے دوچار کیا۔ چنانچہ دنیا کے ادیبوں، دانش وروں اور شاعروں نے پیرس میں منعقدہ عالمی کانگرس برائے تحفظِ ثقافت میں فسطائی نظریے سے نبرد آزما ہونے کی ٹھانی۔ ایک اعلان نامہ جاری ہوا اور فسطائیت کی تھوپی ہوئی جنگ کے خلاف آواز بلند کی گئی اور 'امن' ادب کا ایک اہم موضوع بنا۔ اِس جنگ میں اشتراکی اور سرمایہ دارانہ جمہوری قوتوں نے متحد ہو کر فسطائیت کا مقابلہ کیا اور اُسے شکستِ فاش ہوئی۔ اِس معرکہ آرائی میں جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت کے نظریات کے درمیان ہونے والے تصادم میں دنیا کے ادیبوں نے اپنے کردار متعین کیے، اُن میں کچھ فسطائی کیمپ کے حامی ٹھہرے اور قلم کاروں کی بھاری اکثریت نے جمہوریت اور اشتراکیت کے اتحاد کا ساتھ دیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد یعنی ۱۹۴۵ء کے بعد جلد ہی ایک نئی جنگ سرمایہ دارانہ دنیا اور اشتراکی دنیا میں چھڑ گئی یعنی سرد جنگ جو اشتراکی دنیا کی شکست وریخت پر 1991ء میں منتج ہوئی۔ تاریخ کے اِس موڑ پر بیسویں صدی میں، جو نظریات کی نشو ونما اور فروغ کی صدی قرار پائی تھی، نظریات کی شکست وریخت کی بات کی گئی، بعد ازاں End of History کا شوشہ چھوڑا گیا اور پھر تہذیبوں کے تصادم کے نام پر سرمایہ دارانہ دنیا کے قائد ریاست ہائے متحدہ امریکا کو اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل کی راہیں ہموار کرنے کا جواز فراہم کیا گیا۔

ادب کا مرکزی موضوع انسان اور انسانی سماج ہے۔ انسان کے مسائل اور مشکلات عہد بعہد پیچیدہ تر ہوتے رہے ہیں۔ انسان کا شعور تاریخ کے ارتقائی سفر میں وسیع سے وسیع تر دائرے میں پھیلتا رہا ہے۔ انسان تسخیرِ کائنات کی مہمات میں آج جن بلندیوں پر ہے اور سماجی زندگی اُن کے زیرِ اثر جن حالات اور امکانات سے دوچار ہے، یہ سب کچھ ہمارے شعور کا حصہ ہونا چاہیے اور اِس شعور کا اظہار جمالیاتی تقاضوں اور اور معیارات کے مطابق ادب میں ہونا زندگی آموز اور زندگی آمیز ادب کا خاصہ ہے۔ مذکورہ بیشتر جدید نظریات مغرب سے ہم تک پہنچے ہیں اردو شعر وادب میں مغربی فکر اور سماجی نظریات کا سب سے پہلے خیر مقدم ہمیں مرزا غالبؔ کے ہاں ملتا ہے۔ ''آئینِ اکبری'' کی منظوم تقریظ میں خصوصیت کے ساتھ مرزا غالبؔ نے مغرب میں رونما ہونے والے تغیّرات وایجادات کی روشنی میں نئے عہد کی نوید سنائی تھی اور سرسید کو مشورہ دیا تھا کہ ماضی کے کھنڈروں سے نکلیں اور نئے عہد کا ادراک حاصل کریں اور اُس کے فیوض وبرکات سے اپنے سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں۔ تقریظ کی تمہید میں مرزا غالبؔ سرسیّد کی تعریف کرتے ہیں کہ ایک دیدۂ بینا نے کہنگی کو نیا لباس پہنایا ہے لیکن ''آئینِ اکبری'' کی تصحیح اُن کی ہمتِ والا کے لیے باعثِ ننگ وعار ہے۔ مرزا نے نئے عہد کی نوید اور نئے نظامِ حیات یعنی نئے

نظریۂ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے مذکورہ تقریظ میں کہا کہ ''انگریزوں نے ایسے قوانین اور آئین کا اجرا کیا ہے جو پہلے سننے میں نہ آیا تھا۔ فنون میں فن کاروں نے وہ کمال حاصل کیا کہ اپنے بزرگوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ آئین کی پاس داری اُسی قوم کا حق ہے۔ اُن سے زیادہ انتظام و انصرام کو کوئی نہیں جانتا۔ اُنھوں نے حکومت اور انصاف کے بل بوتے پر ہندوستان میں قانون کی عمل داری کو سوگنا بڑھا دیا ہے۔ لوگ پتھر سے آگ جلاتے ہیں جبکہ انگریز تنکے (دیا سلائی) سے آگ پیدا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے پانی کو رام کر لیا ہے اور اُس میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ اُن کے آگے پانی اور طوفان بے بس نظر آتے ہیں۔ وہ ہوا (گیس) کو آگ لگا دیتے ہیں جو گولوں کی طرح جلتی ہے۔ اُن کے دستور میں سیکڑوں دسا تیر سموئے ہوئے ہیں۔ میرے دوست! کیا تمھارے دستور میں بھی ایسی عمدہ باتیں ہیں؟ مردہ لوگوں کی پوجا کرنا وقت گزاری کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ کیا تمھیں نظر نہیں آتا کہ تمھارا دستور محض لفاظی ہے؟'' اِس طرح مرزا غالبؔ نے سرسید کی رہ نمائی کی۔ سرسیّد کی سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ تحریک اِسی فکر کی عملی شکل ہے، اِس طرح مرزا غالبؔ اور سرسیّد کے بعد مغربی نظریات اردو ادب میں حالیؔ اور اقبالؔ کی وساطت سے واضح خطوط کے ساتھ نظر آئے، خاص طور پر اردو شاعری میں جدید نظریات کی کارفرمائی اقبالؔ کی شاعری میں پہلی مرتبہ پورے سیاق وسباق کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ علامہ اقبالؔ کی شاعری کا وقیع حصہ اُن نظریات سے مزّین ہے جو اُنھوں نے مغرب سے سیکھے تھے۔ اِس تناظر میں ادب اور نظریے کے باہمی روابط اور رشتے ڈھونڈنا سراب کا نظارہ کرنا نہیں ہے۔

اِس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے انتظار حسین کی ایک تحریر کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ تحریر اُن کا ایک کالم ہے جو ایک معروف انگریزی روزنامے میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان "Creativity Versus Ideology" تھا، جس میں اُنھوں نے فرمایا تھا کہ ہم لوگ نظریہ زدہ وقت میں جی رہے ہیں، ادیب خصوصیت کے ساتھ اِس صورتِ حال کا شکار ہے، لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ ادیب کا تخلیقی تجربہ اُس کی نظریاتی سوچ کے تابع نہیں ہوتا اور نہ اُس کے نظریاتی تصوّر کے سامنے سپر انداز ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے دعوے کی دلیل میں یہ فرمایا ہے کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ فیضؔ کی شاعری سے وہ لوگ بھی محظوظ اور مستفید ہوتے ہیں جو اُن کے نظریّات سے اتفاق نہیں کرتے۔ آخری فقرے اُن کے الفاظ میں یہ ہیں :

> ''IN FACT THE IDEOLOGICAL THINKING OF THE WRITER COMES TO A STOP THE MOMENT HIS CREATIVE EXPERIENCE COMES INTO OPERATION. CREATIVITY IS FIT REPLY TO IDEOLOGY."

گویا انتظار حسین کے نزدیک نظریہ اور تخلیقیت میں تضاد ہے اور ادب اور نظریہ ایک دوسرے کے مدِمقابل ہیں۔ انتظار حسین نے فیضؔ کی فکر کو رد کرتے ہوئے فیضؔ کی ثنا خوانی کی ہے۔ وہ دراصل ترقّی پسند نظریے سے اپنے دیرینہ اختلاف کا اظہار کرنے کے لیے موقع اور محل ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک ٹیلیوژن کے پروگرام میں، جو مشہور و معروف افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کے حوالے سے نشر ہوا تھا، اپنے اظہار میں اُنھوں نے قرۃ العین حیدر کو غیر ترقی پسند تخلیق کاروں میں شمار کیا۔ دراصل انتظار حسین کو ترقّی پسند نظریے سے Obsession ہے، ہر چند کہ سماج اور زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا Vision اُنھیں اِسی نظریے اور تحریک نے دیا ہے۔ جہاں تک دیگر نظریات کا تعلق ہے، اُن کی سوچ کے دھارے وجودیت کے نظریے سے ملتے ہیں جو زندگی بیزار روّیوں کا علم بردار اور انسان کے تنہا ہونے کے المیے کا ترجمان نظریہ ہے۔ اُن کی روایت پسندی دراصل ماضی پرستی سے عبارت ہے۔ وہ زندگی جس دور میں گزار رہے ہیں اور یہ زندگی جس سماجی ارتقائی

سفر کا نتیجہ ہے، اُس کی طرف سے اُنھوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تخلیقیت کا سرچشمہ کسی اور دنیا میں دیکھتے اور کسی اور زندگی میں ڈھونڈتے ہیں۔ فیضؔ کا آدرش اُنھیں ناپسند ہے، کیونکہ فیضؔ کا آدرش زندگی کو تاریخی ارتقائی سفر کے تناظر میں دیکھنے کی بصیرت عطا کرتا ہے۔ یہاں میں ایک غیر ترقی پسند ناقد کلیم الدین احمد کی رائے پیش کر رہا ہوں جو موضوعِ زیرِ بحث کے حوالے سے معنویت کی حامل ہے: ''شاعر اپنے عہد میں ادراک کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے۔ وہ بلبل کی طرح عالمِ بے اختیاری میں گاتا نہیں، وہ جو کچھ کہتا ہے سوچ سمجھ کر کہتا ہے۔ میں اِس وقت آرٹ اور تحت الشعور کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آرٹسٹ جو کچھ کرتا ہے، شعوری طور پر کرتا ہے اور فنی کارنامہ ایک شعوری عمل ہے''۔

کلیم الدین احمد کی مذکورۂ بالا رائے کی روشنی میں عالمی ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو خواہ وہ شعری ادب ہو یا افسانوی ادب، اُس میں شعور کی کارفرمائی بدرجۂ اتم نظر آتی ہے بلکہ شعور کی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ قدیم کلاسیکی ادب میں ہومر اور ورجل کی تخلیقات ہوں یا ڈانٹے کی تخلیق، ولیم شیکسپیئر کی شاہکار تخلیقات ہوں یا گوئٹے کی معجز بیانی، ٹالسٹائی کے ناول ہوں یا چیخوف، گورکی اور شولوخوف کی عالمی شہرت کے حامل تخلیقی جواہر پارے، ہر جگہ سماجی شعور کی بلندیاں نظر آتی ہیں اور سماجی شعور کا اِن تخلیقات میں اظہار عالمِ جذب و کیف میں سرشاری کا بیان نہیں بلکہ زندگی اور سماج کے حوالے سے ظہور پذیر ہونے والے نظریات کا ادب میں پرتو نظر آتا ہے۔ فارسی شاعری کی شاہکار تخلیقات فردوسی کا شاہ نامۂ ایران اور مولانا رومی کی مثنویاں، یہ سب کچھ فکر و شعور، جس کا منبع نظریات ہوتے ہیں، کا ہی کرشمہ ہے۔ اردو شاعری میں مسدسِ حالیؔ اور علامہ اقبالؔ کی شاہکار نظمیں، یہ سب کچھ اعلیٰ شعور کے تحت عملِ تخلیق کی کارپردازی ہے۔ تخلیق وظیفۂ حیات نہیں بلکہ سلیقۂ حیات ہے، وہ سلیقہ جو فطرت اور جبلت دونوں پر قابو پا کر زندگی کو مجموعی حیثیت سے حسین تر بناتا ہے۔

تخلیقیت اور نظریے میں تضاد کی نشان دہی کرنے والا مکتبۂ فکر اور ادب اور نظریے کو متصادم قرار دینے والے اربابِ فکر و نظر فردیت (Individualism) کو اجتماعیت (Collectivism) پر فوقیت دیتے ہیں اور اُن کے نزدیک فرد کا انفرادی تجرباتی سفر فن کا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔ فرد کا انفرادی تجرباتی سفر بھی سماج سے باہر نہیں ہوتا بلکہ سماج کے اندر رہ کر ہوتا ہے۔ اِس نکتے کی وضاحت کے لیے میں رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ ہو: ''سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوعِ انسان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے، الگ رہ کر ادیب اُس سے محروم رہ جاتا ہے۔ سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اُس کے دل کی دھڑکنوں کو سنیں۔ یاد رکھو! تخلیقِ ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ حق اور حسن کی تلاش کرنا ہے تو پہلے انا کی کینچلی اتارو، کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو، پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سیانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے''۔

نظریۂ ادب کے درمیان تضادات اور تخلیقیت سے متصادم ہونے کی بات دراصل ادب کو اُس عظیم منصب سے محروم کرنے کے مترادف ہے جو ادب کا سماجی منصب ہے۔ ادب کا سماج کو بدلنے کے کردار کا نظریہ دراصل اُن کے نزدیک محلِ نظر ہے جو تخلیقیت کی راہ میں نظریے کو حائل یا ضرر رساں سمجھتے ہیں اور ادب کو سماجی زندگی کی ترجمانی کرنے سے محروم رکھنے کے قائل ہیں اور ادب کو محض تفننِ طبع و تسکینِ ذوق کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اِس کے برعکس ادب کو سماجی عمل قرار دینے والے ادب کو منصبِ پیغمبری پر فائز جانتے ہیں اور شاعری جزویست از پیغمبری کے نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ اِس کے مخالف نقطۂ نظر کے نزدیک شاعری کو پیغمبری کہنا ایسا ہی ہے جیسے کہ شعر کے فکری عنصر کو علیحدہ کر کے جانچنا اور کسی خاص نظامِ فکر سے اُس کو مربوط کر کے شاعری کو فلسفے کے پہلو میں جگہ دینا۔ شعر میں خواہ خطابت کی روح

ہو، خواہ فکر کا عنصر، جذبے کی آمیزش ہو کہ احساسِ جمال کا رچاؤ، شعر اوّل و آخر شعر رہتا ہے اور اُس کو شعر کے طور پر دیکھنا ہی صحیح ترین عمل ہے۔ یہ نقطۂ نظر دراصل ادب کی خودمختاری (Autonomy) کا نظریہ ہے جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ ادب کو کسی خاص مقصد، مشن اور آدرش سے دور رکھنا چاہیے اور بالفاظِ دیگر ادب برائے ادب ہونا چاہیے۔ اِس گروہ کے نزدیک ادب کو کسی سماجی ذمہ داری اور منصب سے تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اِس کے مدِ مقابل ادب کا وہ نظریہ اور کردار ہے جس کے نزدیک ادب برائے ادب کی اساس لایعنیت (Absurdity) پر استوار ہے جس کو دنیائے شعر و ادب مدتوں پہلے رد کر چکی ہے اور اُس کی جگہ زندگی آموز اور زندگی آمیز ادب کو فروغ حاصل ہوا ہے جس کو ترقی پسند ادب کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک اپنی ابتدا سے ایک نظریاتی تحریک رہی ہے اور یہی اِس کا سب سے بڑا مثبت پہلو ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس کے باوصف وہ تحریک آج بھی زندہ و توانا ہے اور ایک وقیع ادبی سرمایہ اور ورثہ اُس سے منسوب ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ترقی پسندی کسی فردِ واحد کی ایجاد نہیں ہے اور نہ ترقی پسندی کے آغاز کو کسی مخصوص عہد سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ انسانی تہذیب کی سرگزشت کا بابِ اولین ترقی پسندی سے شروع ہوتا ہے، کیونکہ ترقی پسندی تبدیلی اور ارتقا پر مبنی نظامِ فکر یعنی نظریہ ہے۔ ادب کا نظام سماجی زندگی کے حصار میں فکر و احساس اور حسن و صداقت کی قدروں پر قائم ہے دردمندی اور انسان دوستی کا شدید جذبہ، معاشرتی مسائل سے گہری دلچسپی، یہ خیال کہ غلامی ظلم اور ناانصافی کے خلاف جہاد ادیبوں کا فرضِ منصبی ہے اور یہ تصور کہ غمِ ذات اور غمِ زمانہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ترقی پسند ادب کی امتیازی خصوصیتیں ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ مگر یہ کہ ادب کو ادب رہنا چاہیے اور یہ کہ جمالیات سے محروم کوئی ادب نہیں ہوتا۔ ادب کے منصب میں سماج میں پائی جانے والی بدصورتیوں اور اندھیروں کے خلاف آرٹ اور فن کو صف آرا کرنا شامل ہے، مگر فن کے معیار کی پاس داری شرطِ اول ہے۔

موضوعِ زیرِ بحث کے حوالے سے میرا واضح نقطۂ نظر یہ ہے کہ نظریے کی قدر و قیمت سے انکار اور ادب کو نظریے سے بے گانہ رکھنے کی بات کے نتیجے میں بیشتر ادبِ عالیہ ادب کے زمرے سے نکل جائے گا۔ اردو شاعری میں علامہ اقبالؔ کی شاہکار تخلیق 'مسجدِ قرطبہ' علامہ کے نظریاتی تبحر اور شاعرانہ عظمت کی ترجمان ہے۔ یہ نظم نظریے سے وابستگی اور اُس کا جمالیاتی اظہار، ادب اور نظریّے کے بارے میں تضاد کی بات کو رد کرنے کے لیے سب سے بڑا حوالہ ہے اور تخلیقیت کی ''مسجدِ قرطبہ'' سے بہتر مثال پیش کرنا شاید ممکن نہیں جو نظریے سے وابستگی اور نظریّے سے بالیدگی حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔ علامہ اقبالؔ کی فکر و نظر میں اسلامی نظریے کی کلیدی اہمیت ہے اور اِس نظم کی تفہیم کے لیے اسلامی نظریے سے آشنا ہونا میرے نزدیک ناگزیر ہے۔ واضح رہے کہ علامہ اقبالؔ نے سجاد ظہیر سے ملاقات کے دوران ترقی پسند تحریک کے لیے نیک تمناؤں اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اِسی طرح رابندر ناتھ ٹیگور نے اِس تحریک کے لیے پُرجوش حمایت کا اظہار اپنے اُس خطبے میں کیا تھا جو کلکتہ کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا، کیونکہ وہ اپنی ناسازیِ طبع کے سبب کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ یاد رہے کہ ترقی پسند تحریک کے اعلان نامے پر دستخط کرنے والوں میں رابندر ناتھ ٹیگور شامل تھے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تمام بڑی نظموں میں نظریے کی تپش نے ادبی جمالیات کو ابھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ آخر میں اِس باب میں آلِ احمد سرورؔ کا ایک جملہ موضوع کے حوالے سے معنویت کا حامل ہے، ملاحظہ ہو: ''ادب میں نظریے کی وہی اہمیت ہے جو زندگی میں نظر کی ہے۔ ادب فکر و فن دونوں کا مجموعہ ہے''۔

◆◆◆

مسلم فکری دھارے کا بہاؤ ـــــ ایک اجمالی جائزہ

ظفر سپل

جس وقت سرزمینِ عرب پر طلوعِ اسلام کا نہایت اہم تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا تو دو طاقتیں تھیں جو حقیقی معنوں میں اس وقت کی سپر پاور کہلانے کی سزاوار تھیں۔ ایک تو ایران تھی اور دوسری روم۔ ظاہر ہے یہ دونوں محض فوجی طاقتیں نہیں تھیں بلکہ پر اثر تمدن تھے، جو فکری اور ثقافتی سطح پر باقی دنیا کو متاثر کرتے تھے۔ ذرا پیچھے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت سے قریباً بارہ سو سال قبل چار تمدنی مراکز تھے جنہوں نے بے پناہ فکری توانائیوں کا اظہار کیا تھا اور وہ تھے چین، ہندوستان، ایران اور یونان۔ مگر اسلامی فکر کے طاقتور سرچشمے نے جس فکری دھارے کو اپنے اندر سمویا، وہ یونانی فلسفیانہ فکر کا دھارا تھا۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ریگِ صحرائے عرب پر مسلم فکر کا خیر سے لدا ہوا بادل برسا اور جہالت کے ریگستانوں کو ایسے گلزار میں بدل گیا، جس سے آنے والے سارے زمانے مستفید ہوئے..... دراصل اس کے پیچھے اس الٰہیائی عقیدے کی طاقت تھی جو اسے قرآن و حدیث کی صورت میں غیر مصالحت پسندانہ توحیدی نظریے نے عطا کی تھی مگر اس توحیدی نظریے میں سائنسی، ارتقا پذیر اور ترقی پسند عالمگیر رویوں کے سوتے پھوٹتے تھے اور وہ اس طرح کہ یہ نظام اس سوال پر تو کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا کہ خدا واحدہ لاشریک ہے مگر اس طرح کے باقی سوالوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتا کہ زمان و مکان کے ساتھ اس کے رشتے اور تمام کائناتی اعمال کے صدور سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ مزید برآں، آیا وہ کائنات سے ماورا کوئی ذات ہے یا اسی کے اندر جاری و ساری کوئی طاقت۔

سو یہ سائنسی، ارتقا پذیر اور ترقی پسند عالمگیر رویے رکھنے والی روح اسلام قرآن و حدیث سے اپنی قوت محرکہ اخذ کرتی ہے۔ قرآنِ مجید کے مطابق:

> ''انسان کو جو فضیلتیں عطا ہوئی ہیں، ان میں علم کی فضیلت ایسی ہے جس کی بدولت انسان کو فرشتوں سے افضل ہونے اور زمین پر خدا کا نائب بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔'' (س 3-30) یا
>
> .....
>
> ''جو لوگ علم سے بے بہرہ ہیں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو علم سے بہرہ ور ہیں۔'' (س 39-9)

احادیث نبویؐ کی صورت میں کلامِ پیغمبر شہادت دیتا تھا:

> ''سب سے پہلے عقل پیدا کی گئی اور اللہ نے عقل سے بہتر کوئی شے پیدا نہیں کی۔'' (اور)

''جو علم کی جستجو میں رہتا ہے، اس کو موت فنا نہیں کر سکتی۔''

یہ محض الفاظ نہیں تھے جو علم کی اہمیت اور تعریف میں بیان کئے گئے تھے بلکہ وہ بنیاد تھی جس پر ایک نئے فلسفے، نئے تمدنی نظام، نئے سیاسی نظریے اور نئی حیرت انگیز اور انقلابی اخلاقیات کی عمارت تعمیر ہونا تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب فکر کی روشنی تو بہت دور کی بات ہے، لندن کی سڑکوں پر رات کے اندھیرے میں کوئی چراغ نہیں جلتا تھا۔ ان کے کسی تمدن کی عمارت کا تو ذکر ہی کیا، ان کے حکمرانوں کے محلات ہنوز جانوروں کے اصطبلوں سے بہتر نہ ہوئے تھے۔ پس یہی وہ منبع تھا، جس نے علم فکر و فلسفے کو بال و پر عطا کئے اور قرآن و حدیث کے اسی منبع کی روشنی میں مسلم فکر کا غیر متعصب قافلہ منزلیں مارتا ہوا ہر اس علمی سرچشمے سے مستفید ہوا، جس کی قابل قدر فکری روایت موجود تھی اور ظاہر ہے کہ اس وقت یہ قابل قدر علمی فکری وراثت یونان اور یونانیوں کی مفتوحہ سرزمینوں میں مدفون تھی۔

سکندر اعظم یونان سے اٹھا اور مشرق میں دور تک مار کرتا چلا گیا مگر وہ چیز جو اسے عظیم فاتح سے زیادہ اہم اور تاریخی طور پر قابل ذکر بناتی ہے، وہ اس کی مشرق و مغرب میں تمدنی اور علمی ربط کی خواہش ہے۔ اسی پس منظر میں ظہور اسلام سے قبل مصر میں سکندریہ سکول، ایران میں جندیسا پور سکول اور عراق میں خرانی سکول کا قیام عمل میں آیا۔ ان تینوں سکولوں نے علوم طبیعہ کی اشاعت میں گراں قدر خدمان انجام دیں، گو کہ ان کے تمام مباحث میں علمِ نجوم اور علمِ سحر کی آمیزش بھی پائی جاتی تھی۔ اسلامی دور تک یہ تینوں سکول موجود تھے اور یہی سکول مسلمانوں میں فلسفیانہ افکار کی اشاعت کا سبب بنے۔ اس سے پہلے کہ تینوں مدرسوں کے مسلم فکر و فلسفہ پر مرحلہ وار اور تدریجی اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ پس منظر کو ذرا زیادہ واضح کرنے کے لیے یونانی فلسفیوں کے تین فرقوں کا ذکر ضروری ہے۔

ان میں ایک فرقہ تو دہریوں کا تھا۔ جن کا نمائندہ طالیس ملطی ہے۔ یہ لوگ سمجھ نہ آنے والی تمام پیچیدگیوں سے صرف نظر کرنے کی غرض سے عالم یا مادے کو قدیم اور غیر مخلوق کہتے تھے۔ اور خدا کے وجود کے منکر تھے۔ اسی فرقے نے کیمونسٹ فلسفیانہ نظریے کو ''سائنسی'' جڑیں فراہم کیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرا فرقہ حکمائے طبعین کا ہے جو کائنات کو پیدا کرنے والے قادرِ مطلق اور حکیم خدا کے وجود کو تو تسلیم کرتا تھا مگر موجودات کے فنا ہونے کے مشاہدے نے اس کی اس رائے کو پختہ ہونے میں مدد دی کہ انسان بھی چونکہ عناصر سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے طبعی پختگی حاصل کرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ پس انہوں نے حشر و نشر کے فلسفے کو مسترد کر دیا۔ مذہبی نقطہ نظر سے یہ فرقہ بھی مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ تیسرا فرقہ حکمائے الٰہین کا ہے۔ جس کے نمائندے سقراط، افلاطون اور ارسطو ہیں۔ اسی فرقے نے پہلے دو فرقوں کے نظریات کی منطقی جانچ پرکھ کرتے ہوئے ان کے ساتھ مناظرہ کیا اور یہی وہ لوگ تھے جو مستقبل کی فکر پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے تھے۔

تاریخی جائزے سے تو لگتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی عرب جندیسا پور سکول سے رابطے میں آیا اور وہ اس طرح کے حارث بن کلاہ، جس نے جندیسا پور جا کر طب کی تعلیم حاصل کی تھی، عہد رسالت میں موجود تھا۔ ایک دفعہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص حجتہ الوداع کے موقع پر بیمار ہوئے تو پیغمبر خداؐ نے ان کو حارث بن کلاہ سے علاج کا مشورہ دیا۔ حارث چونکہ مسلمان نہیں تھا، اس لیے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی علمی منبع سے مستفید ہونے کی روایت عین دورِ پیغمبر اسلام سے چل نکلی تھی۔ مگر مسلمانوں کی سب سے پہلی علمی آشنائی حضرت عمرؓ کے دور میں فتح اسکندریہ کے بعد اسکندریہ سکول سے ہوئی۔ اسکندریہ کا نامور فلسفی یحییٰ نحوی اس وقت زندہ تھا۔ وہ خود فاتح مصر عمر بن العاصؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے فلسفیانہ خیالات اور منطقی استدلال اس وقت کے مسلمانوں کے لیے ایک عجوبہ سے کم نہ تھے۔ اس لیے

اہلِ عرب اس کے گرویدہ ہو گئے۔[3]

اگرچہ دورِ بنوامیہ میں بھی اسی مذہبی و علمی بے بغضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امیر معاویہؓ نے ایک عیسائی طبیب ابن آثال کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔ جس سے وہ پہروں علمی گفتگو بھی کیا کرتے تھے۔ مگر پہلی واضح فلسفیانہ آواز جس سے مسلمانوں کے کان آشنا ہوئے، سکندریہ ہی سے آئی تھی۔ وہی یحییٰ نحوی جس نے عمر بن العاصؓ سے ملاقات کی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس نے خالد بن یزید بن معاویہ کو بھی طب کی تعلیم دی۔ اگرچہ شہرزوری کی روایت کے مطابق وہ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے تک زندہ رہا۔ خیر یہ غلط نہیں ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کی ابتدا دور بنی امیہ میں خالد بن یزید سے ہوئی جو بلاشبہ اسکندریہ سکول سے مستفید ہوا۔ محرومِ خلافت خالد بن یزید کو علمِ طب اور علمِ کیمیا سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اس نے عربی جاننے والے ان یونانی فلسفیوں کو جو مصر میں رہتے تھے، اپنے پاس بلایا اور فنِ کیمیا کی یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ یہ اسلامی عہد میں ترجمے کی پہلی مثال ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اسکندریہ کے ایک اور طبیب اصطفن کا بھی ذکر کیا ہے جس نے خالد بن ولید کے لیے کیمیا کی کتابوں کے ترجمے کیے، ڈی بوئر کا خیال ہے کہ ''سب سے پہلے ضرب الامثال، حکیمانہ اقوال، خطوط، وصیت نامے اور عموماً تاریخ فلسفہ کے متعلق کتابیں جمع کی گئیں اور ان کا ترجمہ ہوا۔ لیکن یونانی طب، سائنس اور منطق کی کتابوں کا ترجمہ منصور کے زمانے میں جا کر ہوا''

زیادہ متمدن عباسی دور میں اسکندریہ سکول نے اپنے اثرات کھو دیے۔ اس لیے کہ مصر عراق سے نہ صرف دور تھا بلکہ اس کے علمِ سحر اور رہبانیت میں ڈوبے ہوئے فلسفیانہ خیالات زیادہ ترقی یافتہ بغداد کو متاثر کرنے کے اہل نہیں تھے۔ اب جندیسا پور اور خرانی سکول کی باری تھی۔ جندیسا پور سکول کا اثر خلیفہ منصور سے شروع ہو کر مہدی اور ہارون الرشید کے زمانے تک گیا۔ مامون الرشید، موفق باللہ اور اس کے بیٹے معتضد باللہ کے دور میں حرانی سکول نے کام دکھایا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مشہور طبیب اور منجم ثابت بن قرہ حرانی (221-288ھ) کا نام آتا ہے جو حران میں پیدا ہوا اور بعد میں بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہی ثابت بن قرہ تھا جو باپ کی طرف سے گھر ہی میں قید کیے گئے معتضد باللہ کو بغرض دل بستگی روزانہ ملتا تھا اور فلسفیوں کی کہانیاں سناتا تھا۔ ثابت بن قرہ کے بعد اس کے بیٹے سنان بن ثابت اور پوتے ابراہیم بن سنان نے علومِ طبیعہ کے حوالے سے شہرت حاصل کی۔

اب عباسی دور آتا ہے..... یہی وہ دور ہے جب تراجم کی طرف باقاعدہ سنجیدگی سے توجہ دی گئی، مگر یہاں ایک سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟ پہلی وجہ تو بادشاہوں کی طبی ''ضرورتیں'' نظر آتی ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ طبی ضرورتوں نے انہیں محض اطباء کی ضرورت تک محدود نہیں رکھا۔ وہ علم نجوم کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ کیونکہ کوئی شخص اس وقت تک طبیب نہیں بن سکتا تھا جب تک وہ علمِ نجوم کا ماہر نہ ہو، مگر یہ حقیقت انہیں ایک قوم اور آگے لے گئی کہ کوئی منجم فلسفی ہوئے بغیر علم نجو کا ماہر نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری وجہ گوشہِ گمنامی میں پڑی اقلیدس اور طبیعیات کی ان کتابوں کو دیکھنے اور پڑھنے کا اشتیاق تھا جو قیاصرہِ روم کے کتب خانوں میں مقفل پڑی تھیں اور جن کو ان کا مذہب یا پادری پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ابن خلدون اس طرف سے پہلے ہی اشارہ کر گیا تھا۔ اب خلیفہ منصور نے ان کے بارے میں ذمی پادریوں سے سنا تو اس نے قیصرِ روم سے ان کتابوں کو طلب کیا۔ ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ ایک نومسلم شخص عبداللہ بن مقفع کی نمائندگی میں ایک ایرانی جماعت تھی جو اپنے قدیم عقائد، اخلاق اور تمدن کو مسلمانوں میں رائج کرنے کی خواہش مند تھی، سو منطق اخلاق، تاریخ اور مجوسیوں کے قدیم مذاہب مثلاً مانویت وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے فارسی زبان سے عربی میں کیے گئے۔ یہ وہی عبداللہ بن مقفع ہے جو ابتداً

مجوسی تھا اور پہلے عباسی خلیفہ سفاح کے چچا کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اگرچہ شعائر اسلام کی پابندی بھی کرتا تھا لیکن اندر سے زندیق تھا۔ سفاح کا کاتب بھی رہا۔ اسی شہ پر ابتدائی عباسی دور کے ان عرب امراء پر طنز و مزاح و تشنیع اور اہانت کے تیر چلا کر دل کا بغض نکالا کرتا تھا جو ابھی اپنے عہدوں پر قائم تھے۔ بصرہ کے گورنر سے ملتے وقت ہمیشہ ایسا فحش فقرہ کستا تھا جس سے اُس کی ماں کی عفت پر حملہ ہوتا تھا۔ یہ اہانت ایک عرب اشراف کے لیے ناقابلِ برداشت تھی سو اس نے موقع ملتے ہی اسے 142 یا 143 ھ میں قتل کروا دیا۔

منصور کے عہد میں سب سے پہلے ہیئت کی ایک کتاب سدہانت کا ترجمہ سنسکرت سے عربی میں کیا گیا۔ ان علوم کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جو فارسی زبان میں موجود تھے اور جن کا ترجمہ عبداللہ بن مقفع وغیرہ نے عربی میں کیا تھا۔ طب کی کتابیں اس کے علاوہ تھیں۔ منصور کے عہد میں ارسطو کی منطق کی کتابوں کے عربی ترجمے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جنہیں عبداللہ ہی نے کیا تھا۔ عبداللہ بن مقفع کا شاندار کارنامہ علم الاخلاق کی معروف کتاب ''کلیہ ودمنہ'' کا فارسی سے عربی میں ترجمہ ہے۔ کلیہ ودمنہ کو نوشیرواں کے دور میں ہندوستان سے لا کر سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا گیا۔

منصور کے بیٹے مہدی کے دور میں تراجم کا کام نہیں ہوا۔ دراصل مہدی نے محسوس کیا کہ کتب کی اشاعت نے مسلمانوں میں الحاد کی ایک لہر کو جنم دیا ہے سو اس نے ملحدوں اور زندیقوں کے استیصال کے لیے ایک محکمہ بنایا جو ملحدوں کو سزائیں دیتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک علمی کام کر گیا اور وہ یوں کہ اس نے اس فتنہ کا مذہبی اور علمی طور پر خاتمہ کرنے کی خواہش میں علماء کو حکم دیا کہ وہ ملحدوں کی تردید میں کتابیں لکھیں۔ سو مہدی کے دور میں علم الکلام کی بنیاد پڑی۔ ہارون الرشید کے دور میں کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ سنبھلنے میں نہ آتا تھا۔ یوحنا بن ماسویہ کی نگرانی میں کاتبوں کی ایک جماعت نے دل جمعی کے ساتھ بیٹھ کر تراجم کرنے شروع کیے۔ ایک اور مشہور مترجم فضل بن نوبخت کا ذکر بھی ملتا ہے جو فارسی زبان سے فلسفہ و حکمت کی کتابوں کا ترجمہ کرتا تھا۔ دوسری طرف برامکہ کی بدولت بہت سے ہندوستانی حکماء ہارون الرشید کے دربار میں آئے اور سنسکرت کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ کہنا چاہیے کہ اسی دور میں فلسفہ نے علم الکلام پر سایہ کیا۔

مامون کے دور میں تراجم کا کام اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ مامون نے پہلی بار یونانی علوم و فنون پر اپنے پیشروؤں سے کہیں زیادہ توجہ دی۔ کتب کا ذخیرہ تو ہارون کے زمانے ہی میں جمع ہو گیا تھا۔ اسے منظم کر کے باقاعدہ کتب خانے کی شکل دی گئی اور اسے بیت الحکمت کا نام دیا گیا۔ اس کے علاوہ مامون نے خود قیصر روم کو خط لکھ کر یونانی علوم و فنون کی قدیم کتب منگوائیں اور ان کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ مامون کے تذکرہ نگار اس کے ایک خواب کا بھی ذکر کرتے ہیں، جس میں اس نے ایک وجیہہ بڈھے کو جو اپنا نام ارسطو بتاتا تھا، منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیتے دیکھا۔ مامون کے اسی خواب کو اس کی یونانی فلسفے کی طرف توجہ کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بات ایک افسانہ ہو۔ مگر یہ بات دوسری طرح بھی درست ہو سکتی ہے کہ مامون یونانی حکماء اور علوم میں اس قدر دلچسپی لینے لگا تھا کہ خواب میں بھی اس کو ارسطو نظر آیا۔

مامونی دور نے بہترین مترجم پیدا کیے۔ مثلاً یحییٰ بن ماسویہ کا شاگرد ابوزید حنین بن اسحاق، حنین کا بیٹا اسحاق بن حنین، حنین کا بھتیجا ابن الحسن اور ابو بشر مطا بن یونس وغیرہ۔ حنین ابن اسحاق نے کتب، اقلیدس، جالینوس، بقراط اور ارشمیدس کی کتب کے بعض حصص، افلاطون کی ری پبلک اور ارسطو کی ''کیٹی گوریز'' کے تراجم کیے۔ اسحاق بن حنین نے افلاطون کی ''سومنط''، ارسطو کی ''میٹا فزکس'' اور فرفوریوس کی شرحیں لکھیں۔ باپ کو زیادہ شوق طب سے جبکہ بیٹے کو فلسفے سے تھا۔ لیکن جیسا کہ ڈبی بوئر نے لکھا ہے: یہ چونکہ سب لوگ مل کر کام کرتے تھے، اس لیے بعض کتب ایسی ہیں جو کبھی کسی کی طرف منسوب ہو جاتی تھیں اور کبھی کسی دوسرے کی طرف۔ ڈی بوئر کا یہ کہنا بھی معقول

لگتا ہے کہ ''ان مترجموں کو بہت بڑے فلسفی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ یہ اپنے شوق سے کام کرتے ہیں۔ زیادہ تر خلیفہ، وزیر یا کسی اور جلیل القدر شخص کے حکم سے انہیں تصنیف و تالیف کی توفیق ہوتی تھی۔ علاوہ اپنے خاص فن کے اکثر فنِ طب ہوتا تھا، ان لوگوں کو حکیمانہ پند و موعظت کی کتابوں سے بہت دلچسپی تھی۔ مثلاً کہانیاں جو اخلاقی نتائج رکھتی ہوں، مفید حکایتیں، ناصحانہ اقوال''۔ موفق باللہ اور اس کے بیٹے معتضد اللہ کے دور میں ہم ثابت بن قرہ کا ذکر پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ سو اس طرح قیامِ بغداد کے 80 سال کے اندر اندر بیشتر یونانی و دیگر علوم و فنون عربوں کی دسترس میں آ چکے تھے۔ عباسی عہد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس عہد میں خود خلفاء، وزراء اور امراء تحصیلِ علم و ادب میں مصروف تھے۔ بقول ڈی بوئر منصور، ہارون اور مامون ادبی حیثیت سے کارل اعظم سے فاضل تر تھے۔ اور ایم ایم شریف صاحب نے مئی کے حوالے سے کمال کی بات لکھی ہے:

''یہاں مشرق میں ہارون الرشید اور المامون یونان و فارس کے فلسفے کی جھین بین کر رہے تھے تو وہاں مغرب میں ان کے ہم عصر شارلیمان (فرانس) اور اس کے امراء و عمائدین حروف تہجی لکھنا سیکھ رہے تھے''۔

اب اسلامی فکر نے اپنے بنیادی داخلی منبع قرآن و حدیث اور خارجی ماخذ خصوصاً یونان کی فلسفیانہ وراثت کے موتی اپنے دامن میں سمونے کے بعد ان کی اشاعت اور پھیلاؤ کی طرف توجہ دی۔ مسجد کی صورت میں اسلام کے پاس ایک انقلابی ''مرکز'' پہلے ہی موجود تھا۔ یہ محض ایک روایتی عبادت گاہ نہیں تھی بلکہ مسجد اور اس کے ملحقات لوگوں کی اخلاقی و سیاسی اور خصوصاً علمی تربیت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ابتدائی مکاتب کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ ان مکتبوں کا نصاب تعلیم قرآنی تعلیمات، پیغمبرؐ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کے فرامین، منطق اور حساب، اور صرف و نحو کی مبادیات پر مشتمل ہوتا تھا۔ سب سے پہلا باقاعدہ مدرسہ (کالج) المامون نے بغداد میں قائم کیا۔ 1065ء میں سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان کے ایرانی وزیر نظام الملک کا قائم کردہ اقامتی مدرسہ ''نظامیہ'' ایک ایسا قابل رشک مدرسہ تھا جس کے تنظیمی ڈھانچے کی نقالی بعد میں یورپ کی بعض قدیم جامعات نے کی۔ مدرسہ نظامیہ میں پڑھائی جانے والی دینیاتی تعلیم کا وہی مرتبہ تھا جو بعد میں یورپی جامعات میں ادبیات عالیہ کو دیا گیا۔ شام میں الرشیدیہ، امانیہ، ترخانیہ اور شریفیہ اور مصر میں ناصریہ اور صلاحیہ کے نام سے اسی طرز پر معروف مدرسے قائم کئے گے۔ جہاں تک ہسپانیہ کا تعلق ہے، اس کے صرف ایک شہر قرطبہ میں کئی سو مدرسے تھے اور یہ ہسپانیہ ہی کی سرزمین تھی جہاں ان اداروں کی بنیاد پڑی جو آجکل یونیورسٹیاں کہلاتے ہیں۔ جامعہ قرطبہ کے داخلی دروازے پر لکھا تھا:

''دنیا صرف چار چیزوں پر قائم ہے۔ عالموں کا علم، اکابر کا عدل، عابدوں کی عبادت اور بہادروں کی شجاعت''

یہ علم اور اس کی اشاعت کی خواہش ہی تھی جو کاغذ کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے عباسی دور میں کاغذ سازی کی صنعت کے قیام پر منتج ہوئی اور ہزارہا نجی اور پبلک لائبریریاں وجود میں آ گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ہسپانیہ میں تین پبلک لائبریریاں تھیں۔ دسویں صدی عیسوی میں قرطبہ لائبریری میں تقریباً چار لاکھ کتابیں تھیں۔ اس زمانے میں یورپ کے کسی کتب خانے میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود نہیں تھیں۔ کیتھولک انسائیکلو پیڈیا کے مطابق کینٹر بری کا کتب خانہ اپنی اٹھارہ سو کتابوں کے ساتھ مسیحی کتب خانوں میں سرفہرست تھا جب کہ ان دنوں قاہرہ کے بیت الحکمۃ میں بیس لاکھ اور طرابلس کے کتب خانے میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔

.....

بے شک عرب حریت انسانی کے جوہرے لیں تھے مگر ان کے یہاں اسلام سے قبل کسی فکری تحریک کی خبر نہیں ملتی۔ قرآن کی

صورت میں پیغمبرامیؐ کا پیش کردہ اسلام اپنے اندر فکری توانائیوں کا سمندر سمیٹے ہوئے تھا۔ آسمانی رہنمائی اور ہدایت پر مبنی دین یہ سبق لے کر آیا تھا کہ آنے والی نسلوں کو قرآنی اصولوں کے وسیع تر کائناتی دائرے میں رہتے ہوئے اب اپنے فیصلے خود کرنے ہیں۔ اسی منشور پر عمل کرتے ہوئے مسلمان مفکرین نے وہ کارنامے سرانجام دیے ہیں، جن سے فکری تاریخ پر کام کرنے والا کوئی عالم صرفِ نظر نہیں کرسکتا..... مسلمان مفکرین کو آسانی سے تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اسلامی الٰہیاتی مفکرین یا متکلمین ۲۔ صوفیاء ۳۔ فلاسفہ

متکلمین آغاز اسلام میں سیاسی تنوع فکر یا زیادہ صحیح الفاظ میں سیاسی اختلافات کے نتیجے میں سامنے آئے اور علم الکلام کے منظرنامے پر چھاگئے۔ ان میں سب سے اہم گروہ معتزلہ کا تھا جو یونانی عقلیت پرستی سے شدید متاثر تھے۔ ان کا بنیادی نعرہ عدل تھا اور فلسفیانہ فکر کے حوالے سے ان کا خیال تھا کہ وحی اور عقل دونوں ہی علم کے ماخذ ہیں، سوانہیں ہم آہنگ بھی ہونا چاہیے اور اگر ان میں کوئی تناقص وتضاد پایا جائے تو ایسی صورت میں وحی کو عقل کے میزان پر پرکھنا چاہیے۔ کائنات کی ابتدا کیونکہ زمان میں ہوئی ہے اس لیے وہ قدیم نہیں بلکہ حادث ہے۔ اس مکتبہ فکر کے ممتاز فلاسفہ واصل بن عطا، نظام، جاحظ اور اخوان الصفاء کا گروہ شامل ہے۔

فوراً ہی عقلی متکلمین کے خلاف ردعمل سامنے آیا اور نمایاں لوگ معتزلہ کے اندر ہی ابھر کے سامنے آئے۔ ان کا سرخیل ابوالحسن الاشعری ہے، جس نے مکتب اشاعرہ کی بنیاد رکھی۔ یہ لوگ متکلمانہ فلسفیانہ طریقہ کار محض اس لیے استعمال کرتے تھے تاکہ یونانی عقلیت پسندی کے پرزے خود انہی کے ایجاد کردہ ہتھیاروں سے اڑائیں۔ ان کا بنیادی دعویٰ تھا کہ وحی، الہام اور وجدان ہی علم کا واحد ماخذ ہیں غزالی اسی مکتب فکر کے نمائندہ ہیں۔

فلاسفہ سوائے غزالی کے کسی نہ کسی طور یونانی عقلیت پسندی سے ہی متاثر تھے۔ انہوں نے مردہ یونانی دانش کو اس کے مقبرے سے نکال کر اس میں دوبارہ روح پھونکی، اسلامی دانش سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور آخر کار یہ ورثہ یورپ کو منتقل کردیا۔

الکندی / (لاطینی الکندیوس۔ المتوفی ۸۷۳ء) نے فکری تاریخ میں سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ فلسفیانہ تحقیق کے لیے ریاضیاتی منہاج کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعد میں یورپ نے اسے ڈیکارٹ کے نظریے کے طور پر قبول کیا۔ اسی طرح اس دعویٰ کو بھی طرّہ افتخار کے ساتھ پیش کرنے کا سزاوار الکندی ہے کہ علم تین ذریعوں سے منتقل ہوتا ہے۔ عقل، حواس اور تخیل۔ تخیل سے کل کا علم حاصل ہوتا ہے، حواس سے جز کا، اور تخیل عقل اور حواس کا واسطہ ملکہ ہے۔ بعد میں کانٹ (المتوفی 1804ء) وہ پہلا مغربی فلسفی ہے جس نے تخیل کو دوسرے دو ملکات یعنی عقل اور ادراک بالحواس کا واسطہ قرار دیا۔

فلسفے کی تاریخ میں ارسطو کو اگر ''معلّم اوّل'' مانا جاتا ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ الفارابی / (لاطینی الفارابیوس۔ المتوفی 950ء) ''معلّم ثانی'' ہے۔ منطق فارابی کا خاص موضوع ہے۔ فارابی نے کندی کے اٹھائے ہوئے تمہیدی، منطقی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کو نقطہ کمال پر پہنچادیا۔ ابن مسکویہ یا ابن مسکوہ (المتوفی: ۱۰۳۰ء) اپنے نظریہ ارتقاء اور نظام اخلاق کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ابن مسکویہ کا نظام اخلاق یہ کہتا تھا کہ مذہب کا اولین فریضہ لوگوں کو با اخلاق بنانا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب مذہب بنی نوع انسان کو آپس میں محبت کی تربیت دے گا۔ ابن مسکویہ درویش کی رہبانہ زندگی کو اپنے اخلاقی میزان پر کوئی وقعت نہیں دیتا۔ یہ ابن مسکویہ ہی تھا، جس نے نظریہ ارتقاء کی اولین نقش گری کی۔ نوسو سال بعد ڈارون، جس نے سائنسی بنیادوں پر نظریہ ارتقاء کو مرتب کیا، مجملاً وہی تھیسس پیش کرتا ہے جس کی تشریح ابن

مسکویہ بہت پہلے کر چکا تھا۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا (المتوفی: ۱۰۳۰ء) نے فلسفہ مشرق کی تکمیل کر دی۔ اس نے پہلی دفعہ ایسا مربوط نظامِ فکر پیش کیا۔ جس کیا ندرارسطا طالیسی اور نو اولاطونی اسالیبِ فکر باہم متوافق ہو گئے۔ فلسفی اور طبیب دونوں حیثیتوں سے اس کی شہرت کا ڈنکا صدیوں تک یورپ کے علمی اداروں میں بجتا رہا۔ اٹھارہ جلدوں پر مشتمل اس کی تصنیف ''الشفا'' طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور ریاضیات کی قاموس ہے۔ ابن سینا کے نزدیک معقولات موضوعی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کانٹ کا یہ خیال کہ معقولات موضوعی ہوتے ہیں اور معروضات کا عمل حسی ادراک اور منطقی فہم کے باہمی امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے، ابن سینا کے بیان کردہ خیالات پر تعمیر کردہ نظر آتا ہے۔ اسپائی نوزا کے اس نقطہ نظر کو، کہ ذات باری میں عقل، عاقل اور معقول تینوں عین ہیں، علماء نے یہودی مترجم اور عالم میمون کے واسطے سے ابن سینا میں ڈھونڈ نکالا ہے۔

الغزالی (المتوفی ۱۱۱۱ء) مسلم فکر کی دنیا میں ان کے صحیح صحیح مقام کا تعین کرنا ہو تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ غزلی عقلی متکلمین کے ردعمل میں ابھرنے والے اسنادی متکلمین اور صوفیاء کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کی کتاب ''احیاء العلوم'' کو مشرق و مغرب میں ابھی تک نہایت اہم علمی حوالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈیکارٹ سے لے کر برگساں تک کے تمام فلاسفہ کے خیالات پر غزالی کے افکار کی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ ڈیکارٹ کے خیالات تو بغیر کسی تردد کے غزالی کے خیالات کا چربہ محسوس ہوتے ہیں۔ غزالی کہتا ہے ''میں ارادہ کرتا ہوں۔ اس لیے میں ہوں''۔ اب ڈیکارٹ کے نہایت مشہور و مقبول قول کو دیکھئے ''میں سوچتا ہوں۔ اس لیے میں ہوں''۔ لاک اور ہیوم جیسے تمام تجربین علم کی بنیاد عقلی تصورات کی بجائے تجربے پر رکھتے ہیں مگر غزالی زیادہ وسیع تناظر میں کہتے ہیں کہ صرف حواسی تجربہ ہی علم کی بنیاد نہیں۔ نبی صوفی اور ولی کا وجدانی تجربہ بھی قابل اعتماد علمی سند رکھتا ہے۔

مشرق میں فلسفے پر ایک صوفیانہ رنگ تلاش کیا جا سکتا تھا لیکن جب فلسفہ مغرب میں آیا تو یہاں ہمیں پہلا قابل ذکر فلسفی ابن باجہ (المتوفی 1138ء) نظر آتا ہے اور اس پہلے مغربی مسلم فلسفی ابن باجہ نے صوفیانہ رجحان کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ اس نے اعلان کیا کہ صوفی کا حسی مخیلہ صداقت کو آشکار کرنے کی بجائے مخفی کر دیتا ہے۔ اس لیے باوجود اس سرور کے جو اس تجربے کے دوران ملتا ہے، فکر محض کو حسی مخیلہ پر ترجیح دینی چاہیے۔ ابن باجہ کے بعد آنے والا ابن طفیل (المتوفی 1185ء) اپنی ایک فلسفیانہ تمثیل ''حیّ بن یقظان'' کی بدولت بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس تمثیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ وحی و روایت کے بغیر بھی انسانی فطرت کا علم اور پھر اس کی وساطت سے خدا کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے۔ عوام الناس کو گرویدہ بنا لینے والی یہ کتاب ایک عرصہ تک مشرق و مغرب میں مقبول رہی۔ اس کے ترجمے روسی، ہسپانوی اور انگریزی میں ہوئے۔ 1708ء میں اس کے انگریزی ترجمے کی اشاعت کے گیارہ سال بعد ڈیفو نے اپنی کتاب ''رابن سن کروسو'' پیش کی، جس پر حیّ بن یقظان'' کا اثر تلاش کرنا نہایت معمولی دریافت ہے۔

اندھے مغرب کو فلسفے کی آنکھیں عطا کرنے والا ابن رشد (المتوفی: 1198ء) مسلم فلاسفہ میں آخری اہم فلسفی، بلکہ فلسفے کی دلہن کے ماتھے کا جھومر ہے۔ وہ ارسطو کا سب سے سچا، بڑا اور عظیم المرتبت شارح اور مقلد ہے۔ جن اہم خیالات کی بنا پر ابن رشد مبتلائے آزمائش ہوا، وہ درج ذیل ہیں:

1۔ کتب سماوی کی تمثیلی تعبیر 2۔ نظریہ صداقت

ابن رشد اس نظریے کا موید تھا کہ مذہب صداقت کو تمثیلی پیرائے میں پیش کرتا ہے تا کہ عام آدمی کے لیے قابل قبول بن سکے۔

وہ کہتا ہے کہ صحیفہ آسمانی کی ہر تمثیل عوام کی عقلی استعداد کے عین مطابق ہوتی ہے مگر فلسفہ صداقتِ مشترک کے اظہار میں مختلف ہے۔اس لیے جب فلاسفہ صداقت کو اپنے عقلی تصورات کے رنگ میں پیش کرتے ہیں جو دراصل حقیقی رنگ ہے،تو چونکہ یہ عوام الناس کی عقل سے ماوراء ہوتے ہیں اس لیے وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ابن رشد کا نظریہ عقول وروح بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے مگر یہ نہایت پیچیدہ اور اصطلاحی ہے اور ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے۔

.....

سچی بات یہ ہے کہ ابن رشد کے بعد مشرق ومغرب میں مسلم فلسفے کا چراغ گل ہو گیا۔ابن رشد کے بعد ابن خالدون کا نام لیا جاسکتا ہے جو فلسفہ تاریخ کا پہلا نظریہ ساز ہے مگر وہ حقیقی معنوں میں فلسفی نہیں،تاریخ داں ہے۔اب فلسفے کی وراثت کو دوبارہ غیر مسلم مغرب میں منتقل ہونا تھا اور یہ ان یہودیوں نے ممکن بنایا جو عربی بولنے اور عربی سیکھنے کو باعث افتخار سمجھتے تھے،عربی لباس پہنتے تھے اور عربی تمدن کو پوری طرح اپنے اوپر اوڑھے ہوئے تھے۔ظاہر ہے یہ کسی زندہ تمدن کی قوت کا نتیجہ ہے۔یعنہ جیسے آج ہم انگریزی بولنے اور انگریزی تمدن کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ابن رشد نے بڑی تیزی کے ساتھ مغرب میں مروجہ اسلوب فکر کی حیثیت حاصل کر لی۔وہ چار سو سال تک یورپ کی اقلیم ذہن پر حکومت کرتا رہا اور پھر یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی بنیادیں بھی اسی کے ہاتھوں رکھی گئیں۔سچ تو یہ ہے کہ مغربی فلسفہ کی پرشکوہ عمارت مسلم فلسفے کی پائیدار بنیادوں پر ہی اٹھائی گئی تھی۔

.....

ماخذ

۱۔ پروفیسر میاں محمد شریف:مقالات شریف۔بزم اقبال۔لاہور ۲۔ پروفیسر میاں محمد شریف:مسلمانوں کے افکار:مجلس ترقی ادب۔لاہور

۳۔ ڈی اولیری:فلسفہ اسلام۔ترجمہ احسان احمد۔بک ہوم۔لاہور ۴۔ ڈی بوئر:تاریخ فلسفہ اسلام۔ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین۔ادارہ ثقافت۔

۵۔ مولانا عبدالسلام ندوی:حکمائے اسلام ۶۔ محمد لطفی جمعہ:تاریخ فلاسفہ الاسلام۔ترجمہ میر ولی الدین۔

۷۔ ظفر سپل۔مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقاء:بک ہوم۔لاہور۔

◆◆◆

معروف کالم نگار فصیح الدین کی نادر تخلیق

خامہ بہ جوش

شائع ہوگئی ہے

قیمت-/495روپے

رابطہ: گوشۂ ادب،جناح روڈ۔کوئٹہ (فون:092-81-2843229)

امیر الاسلام ہاشمی (گزر گیا جو جہاں سے عجب مسافر تھا)

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

اردو کی ظریفانہ شاعری کے نامور تخلیق کار امیر الاسلام ہاشمی نے عدم کے کوچ کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اردو زبان و ادب کا وہ نیّرِ تاباں جو 9۔ جولائی 1932 کو بدایوں (بھارت) سے طلوع ہوا پوری دنیا میں سدا بہار مسکراہٹیں، مسرّتیں اور شادمانیاں بکھیرنے کے بعد 18۔ مارچ 2013 کی شام کراچی کے اُفق سے غروب ہو کر عدم کی بے کراں وادیوں میں ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا۔ امیر الاسلام ہاشمی کی وفات سے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور علم و ادب کا زندہ دائرۃ المعارف تھے۔ اپنے عہد کے ممتاز ادیبوں میں انھیں منفرد اور ممتاز مقام حاصل تھا۔ انھوں نے اردو کی ظریفانہ شاعری کی اس درخشاں روایت کو استحکام بخشا جسے اپنے عہد کے اردو کے نامور مزاح نگاروں اور شہرہ آفاق ادیبوں سید ضمیر جعفری، دلاور فگار، مجید لاہوری، خضر تمیمی، رئیس امروہوی، ضیا الحق قاسمی، مرزا محمود سرحدی، نذیر احمد شیخ، نیاز سواتی اور ابن انشا نے پروان چڑھایا۔ امیر الاسلام ہاشمی کی ظریفانہ شاعری کے درج ذیل مجموعے شائع ہوئے:

1۔ گر تو برا نہ مانے 2۔ وعلیکم السلام 3۔ ضرب ظرافت 4۔ یہ عرض پھر کروں گا 5۔ مجھ کو سمجھے خدا کرے کوئی

طنز و مزاح کے ذریعے زندگی کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے بارے میں ہمدردانہ شعور کو اجاگر کرنے میں وہ اپنی تخلیقی فعالیت کو روبہ عمل لانے اور اس کے فن کارانہ اظہار کی بھرپور کوشش ان کے اسلوب کو ایک شان دل ربائی عطا کرتی ہے۔ اردو نظم، غزل اور قطعہ میں ان کی تخلیقی مہارت قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ان کے اسلوب کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر انھوں نے مزاحیہ نظم نگاری پر زیادہ توجہ دی۔ ان کی مزاح نگاری کے جوہر نظم میں زیادہ کھلتے ہیں۔ خاص طور پر تحریف نگاری میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں۔ انھوں نے اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال اور اسرار الحق مجاز کی کچھ مشہور نظموں کی بڑی مہارت سے تحریف کی ہے۔ یہ تحریف نگاری زبان و بیان پر ان کی خلاقانہ دسترس اور قدرت کلام کی مظہر ہے۔

امیر الاسلام ہاشمی کی شاعری میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی ظریفانہ شاعری میں طنز و مزاح کو اس طرح شیر و شکر کر دیا گیا ہے کہ قاری کے لیے اس حد فاصل کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے جو طنز و مزاح کے مابین پائی جاتی ہے۔ اشک آور کیفیت میں بھی وہ تبسم انگیز اسلوب سے سماں باندھ دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ظریفانہ شاعری کے سوتے ان کے دل حزیں سے پھوٹتے ہیں۔ امیر الاسلام ہاشمی کی شاعری میں مزاح میں وہ اپنی خامیوں پر ہنستے ہیں جب کہ طنز میں وہ دوسروں کی کم زوریوں کو ہدف بناتے ہیں:

تکلّف برطرف

پیش لاکٹ کیا تو فرمایا — یہ تو مجھ سے بھی خوب صورت ہے
جب دیا دل تو بولیں رہنے دو — اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے

پیغام عمل

رات کا وقت ہے اور ہے مسجد بھی قریب — اٹھیے جلدی سے کہ پیغام عمل لایا ہوں
گھر میں فی الحال ہیں جتنے بھی پرانے جوتے — آپ بھی جاکے بدل لیں میں بدل لایا ہوں

.....

منہ میں اب اپنے مسوڑھوں کے سوا کچھ بھی نہیں — پان ہم نے کھائے ہیں اتنی فراوانی کے ساتھ
منہ میں دو بھی دانت ہوتے پھر تو بک سکتے تھے ہم — عید کے موقع پہ یارو کتنی آسانی کے ساتھ

اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں امیر الاسلام ہاشمی نے اپنے عہد کے معاشرتی حالات اور سماجی تضادات اور بے اعتدالیوں کی لفظی مرقع نگاری بڑی خوش اسلوبی سے کی ہے۔ان کے پر لفظ اسلوب شعر میں طنز ومزاح کا حسین امتزاج قاری کو جہان تازہ کی نوید سناتا ہے:

ذرا سی چھیڑ خانی چاہتے ہیں — محبت درمیانی چاہتے ہیں
عزیزان گرامی سے یہ کہہ دو — کہ اب تو مہربانی چاہتے ہیں
اکھاڑے میں چلو اہل زباں کے — لڑائی منہ زبانی چاہتے ہیں
یہ رشوت ہے تو پھر رشوت سمجھ لو — مگر ہم چائے پانی چاہتے ہیں
ہمیں شادی کی کچھ جلدی نہیں ہے — مصیبت ناگہانی چاہتے ہیں

امیر الاسلام ہاشمی کی طنزیہ شاعری میں اصلاح کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے۔وہ طنز ومزاح کے امتزاج سے اصلاح وتعمیر کے پہلو تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

یہ عرض پھر کروں گا

گھر میں ہوا تھا کیا کیا یہ عرض پھر کروں گا — کیا عرض پھر کروں گا یہ عرض پھر کروں گا
لڑکی کلاسیکل تھی لڑکا کلاس کا تھا — اب کسی گلاس کا تھا یہ عرض پھر کروں گا
عرض النسا کا نسخہ مہرالنسا نے لکھا — نسخے میں کیا لکھا تھا یہ عرض پھر کروں گا
لڑکی نے بھی قبولا لڑکے نے بھی قبولا — دونوں نے کیا قبولا یہ عرض پھر کروں گا
جب تک رہے گا رسّہ، رسّہ کشی رہے گی — کب تک رہے گا رسّہ یہ عرض پھر کروں گا
رشوت جو روکنا ہے جائز اسے کرالو — یہ جائزہ ہے کس کا یہ عرض پھر کروں گا
تعویذ تو دیا تھا لڑکے کا پیر جی نے — تعویذ نے دیا کیا یہ عرض پھر کروں گا

اہل نظر کو شک ہے سرمہ نہیں لگاتا یہ ہاشمی ہے کیسا یہ عرض پھر کروں گا

اپنی طنزیہ نظموں میں امیرالاسلام ہاشمی نے سیاسی و سماجی زندگی کے تضادات اور مناقشات پر کھل کر لکھا ہے۔ ان کی نظمیں ''قائداعظم دیکھا تم نے اپنا پاکستان'' اور ''اقبال ترے دیس کا کیا حال سناؤں'' ان کی جب الوطنی، قومی دردمندی اور خلوص کی مظہر ہیں۔ ان کا اندرونی کرب ان کی طنزیہ شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں خندہ آور کیفیات، شگفتہ خیالات اور شستہ خیالات اور شستہ اور برمحل پیرایۂ اظہار کی دلکش کیفیت قاری کے لیے نشاط آور لمحات کی نوید لاتی ہے۔ اردو کی ظریفانہ شاعری کے ساتھ ان کا خلوص اور بے تکلفی پر مبنی رویہ جہان تازہ کا نقیب ہے۔

اک چھوڑو ہو اک اور مسمات کرو ہو ہر سال یہ کیا قبلۂ حاجات کرو ہو
سمجھو ہو کہاں اوروں کو تم اپنے برابر بس منہ سے مساوات مساوات کرو ہو
کیا حسن کی دولت بھی کبھی بانٹو ہو صاحب سننے میں یہ آیا ہے کہ خیرات کرو ہو
مل جاؤں تو کرتے ہو نہ ملنے کی شکایت گھر آؤں تو خاطر نہ مدارات کرو ہو
ہم ذات شریف آتے ہیں اس در پہ یہ سن کر تم ہنس کے شریفوں سے ملاقات کرو ہو
اٹھے کہاں بیٹھے کہاں کب آئے گئے کب بیگم کی طرح تم بھی حسابات کرو ہو

اللہ تعالیٰ نے امیرالاسلام ہاشمی کو اعلیٰ جمالیاتی حس سے متمتع کیا تھا جس کی عکاسی ان کی شاعری میں بھی ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں حسن بیان کے وسیلے سے جمالیاتی سوز و سرور کے حصول کے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیل زماں کے تھپیڑوں میں اقوام و ملل کا جاہ و جلال اور عروج و اقتدار تو خس و خاشاک کے مانند بہہ جاتا ہے لیکن تہذیبی اقدار پر ابلق ایام کے سموں کی گرد نہیں پڑ سکتی۔ ان کی یہ کوشش رہی کہ طنز و مزاح کے ذریعے شگفتہ انداز میں نئی نسل کو تہذیبی میراث کے بارے میں مثبت شعور آگہی عطا کیا جا سکے۔ ان کی شاعری اصلاح اور تعلیم و تربیت کے متعدد نئے امکانات سے لبریز ہے۔ تاریخ کے مسلسل عمل پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ گہرے غور و خوض کے بعد اپنی ظریفانہ شاعری کے ذریعے قارئین کے ذہنی شعور کو مثبت انداز میں پروان چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے شگفتہ اسلوب کے وسیلے سے وہ قارئین کو زندگی کی اقدار عالیہ کے تحفظ اور بقا کی اہمیت کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

امیرالاسلام ہاشمی نے تخلیق ادب کو ایک اہم اور موثر سماجی عمل کی حیثیت سے اپنے فکر و فن کی اساس بنایا۔ ان کی ظریفانہ شاعری میں مزاح ایک فطری آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ شاعری کئی داخلی اور خارجی حقائق کی آئینہ دار ہے۔ اس کے مطالعے سے تہذیب و معاشرت، سماجی اور عمرانی حقائق اور علم البشریات کے بارے میں حقیقی صورت حال کا علم ہوتا ہے۔ اس کے وسیلے سے پژمردگی اور اضمحلال کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ان کی شاعری خوشیوں اور راحتوں کی نقیب ثابت ہوگی۔ اپنی ذات کے حصار میں رہنے والے اس زیرک تخلیق کار کے افکار و خیالات میں کائنات کی وسعت اور سمندر کی موجوں کی طرح تلاطم موجود ہے۔ ان کی یاد تا ابد دلوں کا مرکز مہر و وفا کرتی رہے گی۔

پھیلی ہیں فضاؤں میں اس طرح تری یادیں جس سمت نظر اٹھی آواز تری آئی

◆◆◆

"مجھے لوگوں میں
مُنفرد بنائے...
میری نرم و ملائم
اور شگفتہ جِلد"
تبت سنو کے تازگی بخش اجزاء
جلد کو ریشم کی طرح نرم و مُلائم بنائے۔
چھائیاں، داغ دھبے دور کرے۔
چہرے کی زائد چکنائی کو جذب کرے۔
جلد کو گرد و غُبار سے بچائے۔
جلد کو عمر کے اثرات اور جھریوں سے عرصہ دراز تک محفوظ رکھے۔
Rs. 3/-
Tibet
Keeps skin soft and smooth
Tibet
Kohinoor Chemical Co. (Pvt) Ltd.
Tibet
REPLACE LID TIGHTLY AFTER USE
Tibet
Tibet
تبت سنو۔ ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

TS/03/33/2K

امین راحت چغتائی

خواب سے بوجھل پلکیں

خواب سے بوجھل پلکیں آنکھیں موندرہی ہیں
تندو تیز ہوائیں جیسے تھم سی گئی ہیں
ہر جانب سنّاٹا، ہر سو ہُو کا عالم
سانسوں کے اب زیرو بم میں کوئی بھی پیغام نہیں ہے
اِس لمحے کا شاید کوئی نام نہیں ہے

شاید یہ لمحہ بھی نہیں ہے
لمحے تو رنگوں کی آمیزش ہوتے ہَیں
لمحے رنگ نئے لاتے ہَیں
پھر رنگوں کے رنگ میں ڈھل کر
رنگ کو انگ نیا دیتے ہیں

خواب سے بوجھل پلکیں آنکھیں موندرہی ہیں
لیکن آنکھیں سوچ رہی ہیں
خواب کے رنگ گھڑی کے مہماں
انگ بھگوئیں
انگ بھگو کر خواب اُڑائیں
ہاتھ نہ آئیں

خواب کے رنگ گھڑی کے مہماں
بیداری کے رنگوں کو جو آب ملی ہے
نسلوں تک وہ ساتھ رہی ہے

آنکھیں، بوجھل پلکوں کو سمجھا سی رہی ہیں
ہر سنّاٹے میں اک جادو جاگ اُٹھتا ہے
سو جائیں تو یہ نظّارہ کون کرے گا

OOO

حسن عسکری کاظمی

امرتا پریتم

دھرتی پیار کی، دُکھ سکھ سانجھے
جیون ہار سنگھار
آس کے سنگھاسن پر بیٹھی
جوت جگاتی نار
مست پَون میں گھر سے نکلی
پہن گلے میں ہار
دریاؤں کا بہتا پانی
جائے سمندر پار
پریتم امر کہانی جیسے
ہرنوں کی اک ڈار
مٹیاروں کی آنکھ میں دیکھی
کاجل کی اک دھار
وارث شاہ کی ہیر کا دُکھڑا
درد بھرا اسنسار
اس دھرتی پر خون کی ندی
دیکھ کے مور کھ روئی
روئی ہاتھ پسار
بَین کسی نے کیا سننے تھے
کوئی نہ مانے ہار

OOO

شاہین (کینیڈا)

نیا سال

اک بگولہ سا اُٹھا
ریت کے ٹیلے کی اک تہ اُڑ گئی
اور نیچے
پھر وہی
تہ بہ تہ محرومیاں
ذرّے ذرّے کی زباں پر تشنگی کی داستاں
تشنگی جس کا ازالہ بادلوں پر قرض ہے
اور بادل
کج ادائی جن کی فطرت ہے ازل سے
تشنگی کی آنچ سے بیگانہ ہیں
بیگانہ تھے
بیگانہ رہنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں

اور پھر اک دن یونہی
اک بگولہ سا اُٹھے گا
ریت کے ٹیلے کی
پھر اک اور تہہ اُڑ جائے گی
اور نیچے
پھر وہی
تہہ بہ تہہ محرومیاں
ذرّے ذرّے کی زباں پر تشنگی کی داستاں

OOO

مامون ایمن (نیویارک)

رباعیات

ہستی کے لیے جگ نے سنواری ہستی
عالم میں بنی خوب عیاری ہستی
نظارہ کیا کرتی ہے خود سے چھپ کر
پت جھڑ کا تماشا ہے بہاری ہستی

موہوم حقیقت سے مفر ہے ہستی
بن مانگی دُعاؤں کا اثر ہے ہستی
آ جائے اگر پیش قدم کو مشکل
رستہ میں کبھی زیر، زبر ہے ہستی

شاخوں کے لیے سبز شجر ہے ہستی
کانٹا ہے کہیں پھول، ثمر ہے ہستی
دیکھیں تو اِدھر جان کا تحفہ بے شک
سوچیں تو حسیں موت اُدھر ہے ہستی

انجان سی خبروں کی خبر ہے ہستی
اِس دہر میں اُس جگ سے دگر ہے ہستی
ہر سانس ہے مربوط کسی مقصد سے
بے وجہ بھی سانسوں کا سفر ہے ہستی

وجدان کی دیوار ہے، دَر ہے ہستی
جرأت کا سراپا ہے، خطر ہے ہستی
کھلتا ہے نہیں راز شناسائی کا
قسمت پہ جمی برف، شرر ہے ہستی

آنکھوں میں کبھی شام، سحر ہے ہستی
کرنوں کی ادا، خاک بہ سر ہے ہستی
اَفلاک بھی جُھک جاتے ہیں اس کے آگے
تخیل کا ہر بحر ہے، بَر ہے ہستی

OOO

ایوب خاور

ایک مرتے ہوئے آدمی کے لیے نظم

یہ جو تم سانسیں رواں رکھنے کی کوشش کر رہے ہو
کس لیے ہے؟
اور تمھارے ہاتھ میں یہ ٹہنیاں پھولوں کی
سر نیوڑ ہائے کس کو دیکھتی ہیں
یہ تمھاری چشمِ نم آلود میں
کس خواب کے ریزے ہیں
جو پلکوں تک آ آ کر پلٹتے
ہیں، پگھلتے اور
بہتے کیوں نہیں ہیں!
اِک ذرا سینے پہ رکھی درد کی سِل ہاتھ سے سرکا کے دیکھو
سنسناتے، یخ اندھیرے میں یہ اتنی ڈھیر ساری
چیونٹیاں کیوں چل رہی ہیں
کون ہے وہ!
کس کے کہنے پر تمھارے سینۂ خالی کی
محرابوں سے یہ لشکر چمٹتا جا رہا ہے!
اور تمھارے لشکر و طبل و علَم
کیوں سرنگوں ہیں، تم شکستِ ذات کے
کن مرحلوں میں ہو، اِدھر دیکھو، تمھارے
ہونٹ اتنے سرد کیوں ہونے لگے ہیں!
کیوں رگوں میں دوڑتی پھرتی
لہو کی ندیاں جمنے لگی ہیں!
موسمِ گل پر اچانک برف باری کا سبب کیا ہے!
کہو! کچھ تو کہو وہ کون ہے
کس سے تمھاری دشمنی ہے!
کس نے پل بھر میں تمھارے جسم و جاں میں
موت بھر دی ہے، تمھیں معلوم ہے
اُس حسن زادی کا کوئی نام و پتا معلوم ہے
کچھ تو کہو بھائی کہو، کچھ تو کہو نا!
میرے بھائی!
اب تمھیں مرنے سے تو شاید بچایا جا نہیں سکتا
مگر آنکھیں کھلی رکھنا کہ میں اُس حسن
زادی (ذات کی صحباں) کا عکس مطمئن
ان بے صدا آنکھوں میں پڑھنا چاہتا ہوں

OOO

اعزاز احمد آذر

قطعات

رات عجب اک کھیل ہُوا اے جانِ جاں
تیری یادیں اک نقطے میں سمٹ گئیں
سرما کی پہلی بارش نے دستک دی
در کھولا تو، بوندیں مجھ سے لپٹ گئیں

.....

پھر یوں ہوا کہ لوگ گھروں کو چلے گئے
اور میں نے خود کو خود ہی تماشہ بنا لیا
میں نے تو بات کی تھی زمیں کے سکون کی
تم نے تو آسمان ہی سر پہ اُٹھا لیا

.....

روز الجھے ہوئے حالات سے لڑنا ہو گا
اپنی ہر سوچ ہر اک بات سے لڑنا ہو گا
اک نئی رات، ہر اک رات کے بعد آ جائے
اس مسلسل سی سیاہ رات سے لڑنا ہو گا

.....

اے میرے خوش نظر تری دلداریوں کی خیر
آ، میں ترے جمال کا صدقہ اُتار دوں
اک مہلتِ وصال جو تُو دے تو جانِ جاں
تیری شبِ گداز کی زُلفیں سنوار دوں

OOO

انوار فیروز

گونگے لوگ

ظلم اور جبر کو دیکھ کے
چُپ ہیں
جیسے ہم ہیں راہ کے پتھر
دل میں جذبہ، بپھرا سمندر
لیکن ہم تو چُپ سادھے ہیں
کیسے آدم زادے ہیں
اس بستی کے لوگ تمام
جن کی اپنی صبح نہ شام
لوگو ہم سب گونگے ہیں

OOO

ڈاکٹر محبوب راہی (انڈیا)

سچائی کا زہر

دوست کہتے ہیں سچ بولنا چھوڑ دوں
یعنی کھوٹا کھرا تولنا چھوڑ دوں
وہ جو قاتل ہے اس کو مسیحا کہوں
یعنی جو ہے بُرا اس کو اچھا کہوں
کانچ کو ہیرا، پیتل کو سونا کہوں
اپنے دشمن کو بھی دوست اپنا کہوں
دشمنی کے سبب بولنا چھوڑ دوں
دوست کہتے ہیں سچ بولنا چھوڑ دوں

.....

ریگزاروں کو گلزار لکھتا رہوں
نفرتوں کو بھی میں پیار لکھتا رہوں
بے پروں کو بھی پر دار لکھتا رہوں
زندگی بخش اشعار لکھتا رہوں
پول ہر جھوٹ کا کھولنا چھوڑ دوں
دوست کہتے ہیں سچ بولنا چھوڑ دوں

.....

ہر قدم ذکر ہر گام سچائی کا
تھام کر ہاتھ میں جام سچائی کا
تذکرہ صبح اور شام سچائی کا
پی کے شام و سحر جام سچائی کا
جھومنا چھوڑ دوں ڈولنا چھوڑ دوں
دوست کہتے ہیں سچ بولنا چھوڑ دوں

دوست کہتے ہیں سچ بولنا چھوڑ دوں
دور تک سارے منظر جو ہیں جھوٹ کے
یہ جو مسکن ہیں، یہ گھر جو ہیں جھوٹ کے
جس قدر جتنے منظر جو ہیں جھوٹ کے
ان میں گہرے سمندر جو ہیں جھوٹ کے
زہر سچائی کا گھولنا چھوڑ دوں
دوست کہتے ہیں سچ بولنا چھوڑ دوں

.....

جن سے پیہم اُبھرتی ہیں سرگوشیاں
راز سربستہ ہوتے ہیں جس سے عیاں
جن سے کھلتی ہیں ان دیکھی سچائیاں
جن کے کھلنے پہ ہیں سخت پابندیاں
اِن دریچوں کو میں کھولنا چھوڑ دوں
دوست کہتے ہیں سچ بولنا چھوڑ دوں

.....

چاہے پھر ذہن و دل میں کوئی رزم ہو
انبساط و حسرت کی وہ بزم ہو
دل میں جذبہ کوئی اور نہ کچھ عزم ہو
اب غزل ہو نہ راہیؔ کوئی نظم ہو
فکر و فن کے گہرےولنا چھوڑ دوں
دوست کہتے ہیں سچ بولنا چھوڑ دوں

سلطان کھاروی

ماہیے

ہو خیر سفینے کی
روشن دِل میں ہے
اب یاد مدینے کی

ہے جگت مُرید ترا
جیوے پاک پتن
اے شیخ فرید ترا

مَن بیکل کہتا ہے
گڑھ مہاراجا میں
مرا باہور رہتا ہے

دُنیا کے خرابے میں
ہے روشن عالم پور
اُس پار دوابے میں

کوئی بھی قیامت ہو
بستی ولیوں کی
ملتان سلامت ہو

مِل چاہنے والے کو
اکھیاں ترس گئیں
وارث جنڈیالے کو

سینے میں یاد رہے
کوٹ مِٹھن تیرا
خواجہ آباد رہے

OOO

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون

بَن

رُت آئی برسات کی نکھرا بَن کا رُوپ
اُجلا سورج جھانکتا پھیلی سندر دھوپ

برکھا برسی ناز سے پُروائی کا ساز
دب گئی بَن کے شور میں رِم جھم کی آواز

چیتا بیٹھا گھات میں گیدڑ ہے انجان
کاگ پکارے ڈال سے بھاگ ارے نادان

چندن بَن چل سانورے منوا آج اُداس
من بگیا بکھراندہے لے کر آئیں باس

پُروا نہ پہچانتی غنچے بھئے پرائے
تیور بن کے دیکھ کر تتلی روتی جائے

جنگل میں کِت جاؤں میں چار دشائیں جال
آگے میرے شیرنی پیچھے میرے بھال

سوکھے پیڑ بہار میں ہاتھ اُٹھائیں مور
پیارے مولا بھیج دے بادل بَن کی اور

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

ترویناں

وجہ رسوائی نہ بن جائے یہ آواز مری
بس یہی سوچ کے آواز نہیں دی تم کو
آج گنبد میں صدا گونج رہی ہے میری

دیر تک سوچتا رہا کوئی
اور پھر اُٹھ کے خودکشی کر لی
ہو گیا خون اک تمنا کا

خبر ہے بے اماں کر دے گی مجھ کو
محبت رائیگاں کر دے گی مجھ کو
نہ کچھ ہونے سے کچھ ہونا ہے بہتر

دھواں آنکھوں میں میری بھر گیا ہے
مجھے ماں یاد میری آ رہی ہے
کہیں لکڑی پہ کھانا پک رہا ہے

OOO

آفتاب راجا

چشمہ پھوٹ نکلے

تمہیں یہ تو خبر ہو گی
کہ دریا پاس بہتا ہو
تو پھر بھی
پیاس کے ماروں کو
پانی نہیں ملتا
جو پہرے دار ہوتے ہیں
وہ پانی تک رسائی کو
بنا دیتے ہیں ناممکن
کوئی بچہ اگر
تپتی ہوئی مٹی پہ
لیٹ کر
اپنے ہونٹوں پر زباں رکھ کر
یہ باور بھی کرا دے
میں پیاسا ہوں
اُسے پانی نہیں ملتا
وہی بچہ اگر
رگڑ کر ایڑیاں اپنی
اُس مٹی سے کہہ دے
میں پیاسا ہوں
مجھے پانی پلا دے
تو اُس کے پاؤں کی ٹھوکر سے
یہ ممکن ہے
کہ چشمہ پھوٹ نکلے
آبِ حیواں کا

OOO

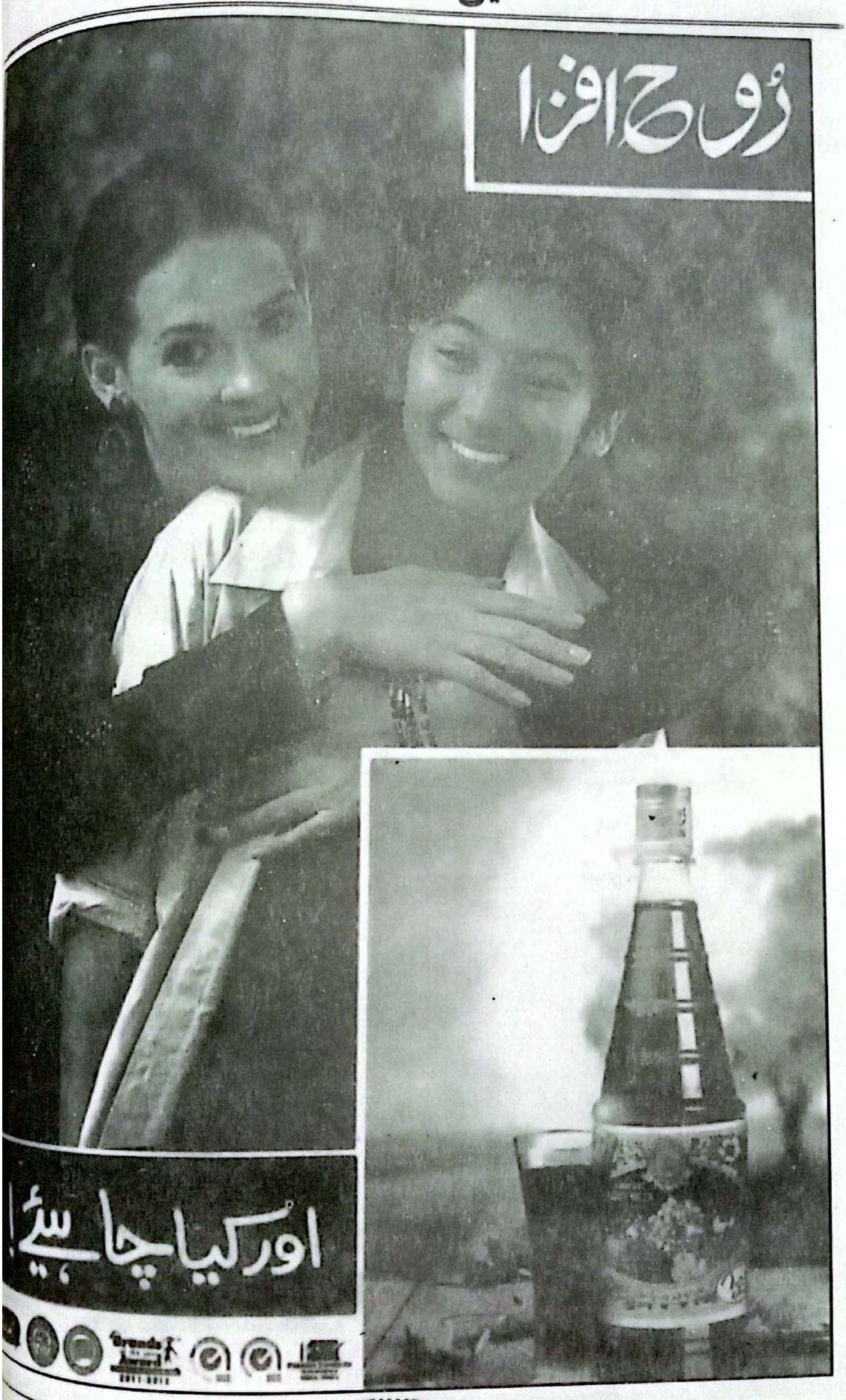
روح افزا
اور کیا چاہیئے!

افسانے

اپنی اپنی بِلّی

ڈاکٹر رشید امجد

سارا تماشا خواب اور حقیقت کے درمیان تھا، حقیقت یوں کہ وہ سمجھ اور جان رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، خواب یوں کہ جو کچھ ہو رہا تھا اس پر کوئی اختیار نہیں تھا، ایک تیز لہر تھی کہ جس میں ہر شے بہے چلی جا رہی تھی۔ وہ تنکا تھا لیکن وجود رکھتا تھا، ملک چھوڑ کر یہاں آنا، لمحہ لمحہ سب کچھ سامنے تھا، ویزے سے ٹکٹ لینے اور جہاز میں بیٹھنے تک کا سارا عمل بیک وقت اختیاری اور عدم اختیاری تھا، وہ چاہنے اور نہ چاہنے کے درمیان آسمان سے باتیں کرتی بلڈنگوں کے اسی جنگل میں آن پہنچا تھا، مجبوری تھی یا خواہش، کچھ فیصلہ نہ ہو پاتا۔ صبح ناشتے سے رات سونے تک جو کچھ ہوتا اس میں شامل تو تھا لیکن صرف ظاہری طور پر، اندر کے سناٹوں میں، نیم تاریک راستوں پر کچھ مسلسل ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

بیٹا روز صبح ناشتے پر پوچھتا..... ''خوش تو ہیں نا، کیسی شاندار جگہ ہے''

اس کا سر ہلتا لیکن اندر کچھ ٹوٹنے لگتا۔

آسمان کو چھوتی عمارتوں، سڑکوں پہ تیز دوڑتی شور مچاتی گاڑیوں اور لوگوں کے اژدحام میں بھی وہ اکیلا اور سونا سونا سا تھا۔ شاپنگ مالوں میں کندھے سے کندھا چھوتے ہجوم میں اسے اپنا آپ تنہا اور اجنبی لگتا۔ بہو روز شام کو بچوں کو پارک میں لے جاتی تھی کہنے لگی..... ''آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تازہ فضا میں انسان ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے''۔

اپنے شہر میں تو ہر طرف تازگی تھی، کھلی فضا، ہلکا پھلکا ہونے کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا لیکن یہاں کی چکا چوند، ہاؤ ہو اور ہنگاموں میں شاید اس کی ضرورت تھی'

ساٹھویں منزل کے فلیٹ سے نکل کر پارک میں آیا تو لگا پہلی بار پاؤں زمین سے لگے ہیں۔ لش لش کرتی سبز گھاس، پھولوں کی قطاریں اور مدھم مدھم قدم رکھتی ہوا کا رقص، لمبا سانس لیا۔ لگا سارا وجود سرمئی روشنی اور پھولوں کی مہک سے کھل اٹھا ہے۔ بہو اور بچے بچوں کے پلے ایریا کی طرف نکل گئے تھے۔ میں قریب کے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ جوتے اتار کر پاؤں مخملی گھاس پر رکھ دیئے، عجیب سکون ملا۔

''تو میں ابھی تک ہوں'' اس نے لمبے سانس لیتے ہوئے سوچا۔

آسمان کو چھوتی عمارتوں کے اس تاریک جنگل میں یہ پارک ایک اور ہی دنیا تھا۔

''یہ ہوا ہی ہے'' اس نے پھر ایک لمبا سانس لیا۔

''یہ خوشبو ہی ہے'' اس نے سونگھا، ''اور یہ رنگ ہی ہیں'' اس نے دیکھا۔

دفعتہً احساس ہوا کہ کوئی قریب ہی موجود ہے، رنگوں سے نظر ہٹا کر دیکھا، دس بارہ سال کا ایک بچہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔
''ہیلو'' اس کے منہ سے نکلا۔
''ہیلو'' بچہ کھل اٹھا اور اس کے قریب آ گیا
''میں یہاں بیٹھ جاؤں آپ کے ساتھ'' بڑی شستہ انگریزی میں بولا۔
''کیوں نہیں'' وہ ایک طرف ہو گیا۔
''میرا نام سعد ہے اور آپ کا؟''
''میں.....'' اسے احساس ہوا اس کا تو کوئی نام ہی نہیں۔ اپنا نام تو وہ دور کہیں چھوڑ آیا تھا، یہاں تو ایک بے نام شخص تھا۔
''نام تو شناخت ہوتی ہے'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا.....'' اور یہاں میری کوئی شناخت نہیں''۔
سعد کو اس کی بات سمجھ نہیں آئی لیکن اس نے اپنا سوال دہرایا نہیں۔ کچھ دیر ایک عجب بھاری خاموشی چوکڑی مار کر ان کے درمیان آ بیٹھی۔
دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اس نے پوچھا.....''پڑھتے ہو''
سعد کے چہرے پر روشنی کھل اٹھی.....''ساتویں میں''
''گڈ.....''
''مجھے کبھی ڈانٹ نہیں پڑی'' سعد کے چہرے پر پھول مہک رہے تھے.....'' میں اپنا کام کر کے جاتا ہوں، ٹیچر بہت خوش ہوتی ہے''
''ویری گڈ''
کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے جیسے ایک دوسرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں، پھر وہ بولا.....'' کہیں قریب ہی رہتے ہو؟''
سعد نے اثبات میں سر ہلایا.....'' وہ جو سامنے مارکیٹ ہے نا اس کے پیچھے والی سٹریٹ میں ہمارا وِلا ہے''
اس نے رشک سے اس کی طرف دیکھا.....'' وِلا میں تو آدمی زمین پر ہوتا ہے نا''
سعد کو اس کی بات سمجھ نہ آئی، کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا.....'' تو آپ زمین پر نہیں رہتے''
وہ ہنس پڑا.....''نہیں میں تو فلیٹ میں رہتا ہوں، وہ بھی ساٹھویں منزل پر''
سعد کو اب بھی اس کی بات سمجھ نہ آئی، بولا.....''فلیٹ زمین پر نہیں ہوتے؟''
''ہوتے ہیں اور نہیں بھی ہوتے'' اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔
دفعتہً احساس ہوا کہ سعد عجب الجھی الجھی نظروں سے اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔
اس نے بات شروع کرنے کے لئے پوچھا.....''تمہارے ابو امی اور.....''
سعد نے بات کاٹ دی.....''میری دو بہنیں بھی ہیں''

''اور بھائی''

''میں اکیلا بھائی ہوں'' اس کے چہرے پر سایا سا لہرایا، اس نے گھاس کے اس قطعے کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ابو امی اور دو بہنیں گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک اس کے ابو کھڑے ہو گئے اور اسے آواز دی۔

جانے سے پہلے سعد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا..... ''کل آئیں گے نا''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بہو بھی بچوں کو لے کر آ رہی تھی۔ قریب پہنچی تو بولی..... ''آپ بور تو نہیں ہوئے''

''نہیں نہیں'' وہ جلدی سے بولا..... ''یہاں آ کر تو تازہ ہو گیا ہوں، کیا شاندار پارک ہے''

''تو بس اب آپ روز ہمارے ساتھ آیا کریں'' بہو اس کو ہشاس بشاش دیکھ کر کھل اٹھی۔

اس رات وہ اپنے شہر کی گلیوں اور کھلی فضاؤں میں پھرتا رہا۔

صبح ناشتے پر بیٹے نے کہا..... ''آج آپ خوش لگ رہے ہیں''

بہو بولی..... ''شام کو انہیں پارک لے گئی تھی''

بیٹے نے کہا..... ''اب انہیں روز ساتھ لے جایا کرو۔ چھٹی والے دن تو میں بھی جاتا ہوں''

دوسری شام ابھی وہ پارک میں داخل ہی ہوئے تھے کہ سعد بھاگتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔ بہو بچوں کو لے کر آگے نکل گئی۔ وہ دونوں اپنی بنچ پر آ بیٹھے۔ اس نے دوسرے کونے کی طرف دیکھا۔ سعد کے امی ابو بنچ پر بیٹھے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بہنیں گھاس پر بیٹھی تھیں۔

اس نے پوچھا..... ''تم سب سے چھوٹے ہو''

سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔ بولا..... ''میں نے امی ابو کو آپ کے بارے میں بتایا ہے''

پھر کہنے لگا..... ''آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں''

''پاکستان سے''

''اوہ، پاکستان، وہاں تو ہر وقت ڈز ڈز ہوتی ہے'' اس نے انگلیوں سے پستول کی شکل بنائی اور منہ سے ڈز ڈز کی آوازیں نکالنے لگا، پھر خوب ہنسا۔

''وہاں اتنے دھماکے کیوں ہوتے ہیں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

جی چاہا کہ کہوں کہ تمہاری ہی مہربانیوں سے، تم ہی تو انہیں پیسے دیتے ہو، لیکن چپ رہا، تا دیر چپ، پھر بولا..... ''یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں، ان کو بھی نہیں جو یہ سب کچھ کرتے ہیں''

سعد نے کہا..... ''اب آپ واپس نہ جائیں''

کہنے لگا..... ''میرا بیٹا بھی یہی کہتا ہے، لیکن دل نہیں لگتا''

سعد نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے..... ''ہم دوست..... روز ملیں گے تو آپ کا دل لگ جائے گا''

لگا جیسے اس کے اندر کوئی بند کلی دفعتہً کھل اٹھی ہے۔

کھانا کھاتے ہوئے بیٹے نے بیوی سے کہا.....''لگتا ہے ابو کا دل لگ گیا ہے''

بہو نے کہا.....''سارا دن بند فلیٹ میں ٹی وی دیکھ دیکھ کر اکتا جاتے تھے۔اب ذرا پارک میں جاتے ہیں تو ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں،اور ہاں انہوں نے وہاں اپنا ایک دوست بھی بنا لیا ہے''

''وہ کون''۔بیٹے نے تجسس سے پوچھا۔

''ایک بچہ ہے'' پوتہ بولا.....''یہ اس کے ساتھ گیمیں لگاتے ہیں''

سب ہنسنے لگے۔

سناٹے کی برف تھوڑی تھوڑی پگھلنے لگی تھی۔صبح ناشتہ کے بعد اونگھنا،ٹی وی دیکھنا،پھر اونگھنا،اس سونے جاگنے کے درمیان شام ہو جاتی۔سعد اپنی عمر سے زیادہ کی باتیں کرتا،کہتا.....''یہ سب کیا ہے،مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہر شے آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہے''

اداس سا ہو جاتا،ایسے میں اس کے چہرے کی پیلاہٹ نمایاں ہو جاتی۔

ایک شام کہنے لگا.....''کل میں نہیں آؤں گا''

''کیوں؟''وہ چونکا

''ڈاکٹر کے پاس جانا ہے''

''کس لئے؟''

''میرے سر میں درد رہتا ہے،کل سے درد بہت ہو گیا ہے''

اس نے پہلی بار غور سے اس کی طرف دیکھا،اس کے چہرے پر اذیّت کے آثار تھے۔

سعد کھڑا ہو گیا اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا.....''اللہ حافظ''

پھر وہ دوڑتا ہوا باغ کے دوسرے کونے میں بیٹھے اپنے گھرانے کی طرف چلا گیا۔بہو بچوں کو لے کر آ گئی تھی۔گیٹ کی طرف جاتے ہوئے وہ مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھتا رہا۔گیٹ سے نکلتے ہوئے اسے لگا سعد ہاتھ ہلا کر بائی بائی کر رہا ہے،اس نے بھی ہاتھ اٹھایا۔

وہ رات عجب پریشانی میں گزری۔ناشتہ کرنے کو بھی جی نہ چاہا۔

بیٹے نے پوچھا.....''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا''

اس نے کہا.....''ٹھیک ہوں،نیند پوری نہیں ہوئی''

بہو بولی''تو ناشتہ کر کے آرام کر لیں''

سارا دن سوتے جاگتے میں گزرا،شام کو بہو بچے پارک جانے لگے تو اس نے کہا''تم لوگ جاؤ میں گھر ہی رہوں گا''

ٹی وی میں بھی مزہ نہ آیا۔رات کروٹیں لیتے گزری۔اگلا دن بھی بے چین بے چین سا رہا۔شام ہوئی تو وہ بچوں سے بھی پہلے پارک جانے کے لیے تیار ہوا بیٹھا تھا۔

بنچ پر ساتھ والی جگہ خالی رہی،سعد اور اس کا خاندان نظر نہ آیا۔دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے۔

''شائد کل آ جائے''اس نے پوچھا.....''کل تو آ ہی جائے گا''

کل، پرسوں، ترسوں..... کئی دن گزر گئے سعد اور اس کا خاندان پارک میں نہ آیا۔ سارا دن شام کا انتظار کرتے گزرتا، بڑے اشتیاق سے لپک کر پارک میں داخل ہوتا اور مرجھایا ہوا وہاں سے نکلتا۔ پارک کی ساری مہک اور رنگ ہوا ہو گئے تھے۔ بہت سارے دن گزر گئے، میں اداسی سے بنچ پر اکیلا دور کھیلتے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک شخص پاس سے گزرا، ٹھٹکا، ذرا سا چلا، پھر رک گیا اور مرجھائی ہوئی آواز میں بولا..... ''وہ اب کبھی نہیں آئے گا''

چونکا، سر اٹھایا

وہ شخص جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا..... ''بڑا بہادر بچہ تھا'' برین ٹیومر تھا.....''

کچھ دیر تکلیف دہ خاموشی رہی، پھر اتنی دھیمی آوازیں جسے وہ بمشکل سن سکا، وہ بولا..... ''آخری لمحوں میں بھی آپ کو یاد کر رہا تھا''

سارا پارک پلک جھپکنے میں الٹ پلٹ ہو گیا۔ معلوم نہیں بہو بچے کب آئے اور اسے ساتھ لے کر فلیٹ میں آ گئے۔ اس رات نیم سوتے نیم جاگتے اس نے دیکھا، ایک خوفناک بلّی سعد کے اردگرد گھوم رہی ہے، وہ اس سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر ہو رہا ہے لیکن بلّی کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے سعد آنکھیں بند کر لیتا ہے، بلّی لمحہ بھر اسے دیکھتی ہے اور پھر جست لگا کر.....!

اس دن اسے اپنا شہر بہت یاد آیا..... بار بار یاد آیا، گندی گلیاں، دھول میں اٹے بازار، پسینہ بہتے لوگ، پنکھوں اور بجلی کے بلبوں کو دیکھتی پتھرا چکی آنکھیں..... یہاں کی چکا چوند، گلیمر، آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کا جنگل، گھنا جنگل، تاریک میں جگمگ کرتا سناٹا..... کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کب فلیٹ سے نکلا اور لفٹ سے ہوتا نیچے آ گیا۔ بغیر کسی ارادے کے چل پڑا۔ چلتا ہی رہا، چلتا ہی رہا۔

رات گہری ہو گئی، بھوک اور پیاس سے انتڑیاں سوکھنے لگیں، زبان باہر نکل آئی، پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کیسے گرا۔ بس یہ احساس ہوا کہ کسی چیز سے نیم ٹیک لگائے زمین پر پڑا ہے، نیم کھلی آنکھوں سے بلّی کو دیکھا جو اس کے گرداگرد چکر لگا رہی تھی، اس کی غرّاہٹ میں سانپ کی سی پھنکار تھی، آنکھیں بند کرنے سے پہلے آخری بار، ایک آنکھ ذرا سی کھول کر..... بڑی مشکل سے کھول کر دیکھا، بلّی نے جست بھر لی تھی۔

◆◆◆

ممتاز افسانہ نگار سیما پیروز کی نئی تخلیق

طوفان کے بعد

شائع ہو گئی ہے

قیمت:-/290 روپے

ملنے کا پتہ: دوست پبلی کیشنز، پلاٹ 110، سٹریٹ 1-9/215، اسلام آباد۔ (سیل: 0300-4358796)

کالی اور گوری عقل مند لڑکیاں

سلمیٰ اعوان

سچی بات ہے Divide and rule کبھی میری پالیسی نہیں رہی۔ایک بڑے تعلیمی ادارے میں گذشتہ پندرہ سال سے بطور پرنسپل کام کر رہی ہوں۔کوئی سو کے قریب اساتذہ میری نگرانی میں کام کرتے ہیں۔میں نے اپنے آپ کو ان کی خوشیوں اور غموں میں ہمیشہ شامل رکھا ہے۔کسی نے میرے پاس آ کر آنسو بہائے تو میں نے اس کی اشک شوئی کی، دلاسہ دیا، حوصلہ بڑھایا اور اگر کوئی خوشی کی خبر سنانے آیا تو میں نے بھی مسکراہٹیں بکھیر دیں۔ٹیچرز کے آپس کے جھگڑوں کو پیار اور محبت بھری ڈانٹ سے نپٹایا۔یقیناً یہ میرا طرز عمل ہے کہ میری ٹیچرز مجھ سے اپنے دکھ سکھ کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں۔

یہ بڑی گرم دوپہر تھی۔لُو کے تھپیڑوں نے میرا چہرہ جھلسا دیا تھا۔میں آخری راؤنڈ سے فارغ ہو کر ابھی آفس میں آ کر بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ذرا اس فائل کو کھولوں جس میں انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کی رپورٹ نتھی کی گئی تھی۔ابھی میں نے رپورٹ پڑھنی شروع کی ہی تھی کہ مس تہمینہ دفتر میں داخل ہوئی۔

تہمینہ کے بارے میں مختصراً عرض کر دینا چاہتی ہوں۔مخلص، ہمدرد، عام سے نقش و نگار والی لڑکی ہے۔ایم اے بی ایڈ تک تعلیم ہے۔خاندانی پس منظر اچھا ہے۔چھوٹی سی فیملی جس میں دو بہنیں ایک بھائی ماں اور باپ شامل ہیں۔باپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا گھر خریدا تھا۔معاشی حالات نارمل سے ہیں۔زندگی سکون سے گزر رہی ہے۔بس اگر پریشانی ہے تو تہمینہ کے لئے موزوں رشتے کی۔تہمینہ کی عمر تیس کے قریب قریب ہے مگر نک سک سے آراستہ رہنے اور اپنا خیال رکھنے کی وجہ سے اتنی دکھتی نہیں۔

وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔آج صبح سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا اب بغور دیکھا تو کچھ پریشان سی نظر آئی۔

''کوئی بات؟ پریشان لگتی ہو'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''میڈم مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔''

''کتنے چاہئیں؟''

''یہی کوئی پچاس ہزار۔بس دو تین ماہ میں لوٹا دوں گی۔''

پچاس ہزار اچھی معقول رقم تھی۔میں نے ذرا گہرائی میں اتر نا مناسب خیال کیا۔

''کہاں ضرورت ہے؟''

اوراس کے تفصیلی جائزے سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ گومگو کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

''کھل کر بات کرو میں تمہاری باس ہی نہیں بہن بھی ہوں۔ٹھیک مشورہ دوں گی۔''اوراس نے بتانا شروع کیا۔

''ہمارے دائیں ہاتھ جولوگ رہتے ہیں وہ شیخ ہیں۔شیخ اقبال احمد کے دو بچے ہیں توصیف اور نجمہ۔توصیف میڈیکل کے تیسرے سال میں اور نجمہ فائن آرٹس میں ایم اے کررہی ہے۔بہت گھلنے ملنے والے اور مخلص لوگ نہیں ہیں۔بس کبھی کبھار ہی آنا جانا ہوتا ہے یا آتے جاتے ٹکراؤ ہوجائے تو ہیلو ہائے ہوجاتی ہے۔کوئی تین دن پہلے اماں ہمارے ماموں کے گھر گئی ہوئی تھیں۔بھائی ٹیوشن پڑھنے چلا گیا اور میں گھر میں اکیلی تھی۔کبھی کبھی اکیلا پن بھی کیسی اداسی پیدا کردیتا ہے؟ آدمی ڈپریشن کا شکار ہوجاتا ہے۔میں نے کچھ وقت لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ پر ضائع کیا۔کچھ وقت گھر میں اِدھراُدھر گھومنے پھرنے میں کاٹا اور بالآخر میں نے نجمہ کے گھر کی طرف قدم اٹھا دیئے۔میں اپنی بوریت کو کچھ کم کرنا چاہ رہی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے بات وات نہ کریں گے تو بھی خیر۔تھوڑا سا وقت تو کٹے گا۔''

میں اپنے گھر سے نکل کر ان کے گیٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔گیٹ بند تھا اور میرا ہاتھ اطلاعی گھنٹی پر جانے ہی والا تھا جب ایک سائیکل سوار لڑکے نے میرے پاس آ کر پوچھا۔

''توصیف احمد شیخ کا گھر یہی ہے۔''

میں نے گھنٹی بجانے کے بجائے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔۲۱،۲۲ برس کا کمزور سا لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا۔سائیکل کو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔زرد چہرہ، گال پچکے ہوئے، آنکھیں موٹی موٹی مگر اداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔بے ترتیب سے بال۔لباس بھی عام سا تھا۔

''یہی گھر ہے۔تمہیں توصیف سے ملنا ہے کیا؟''

اور میں نے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ساز بجا اور گیٹ کھل گیا۔دروازے پر ملازمہ تھی۔میں نے نجمہ اور توصیف کے بارے میں پوچھا۔دونوں گھر پر تھے۔میں نے اندر جاتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔''توصیف کو بتادو کہ اس سے کوئی ملنے آیا ہے؟''

نجمہ اپنے کمرے میں تھی میں کچھ سوچ کر وہیں چلی گئی۔وہ غالباً چائے پینے لگی تھی۔ٹرالی سامنے رکھی تھی۔کمرہ ٹھنڈا تھا اور ماحول بہت خوشگوار سا۔میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔

''میرا خیال ہے میں ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔''

''آیئے آیئے۔''نجمہ نے خاصی خوش دلی سے کہا۔

''بھئی گھر میں بور ہورہی تھی تھوڑے سے وقت کو خوش گوار بنانے کے لئے آئی ہوں امید ہے محسوس نہیں کروگی۔''

اور نجمہ نے جواباً خاصی فراخ دلی سے کہا۔''ارے نہیں کیسی بات کرتی ہوں آپ۔اکٹھے چائے پیتے ہیں اور تھوڑی سی گپ شپ بھی لگاتے ہیں۔''

چائے پی اور گپ شپ لگی۔نجمہ نے یونیورسٹی کے لطیفے سنائے اور میں نے بھی اسے سکول کی باتیں بتائیں اور تھوڑی سی بات چیت فلم اور ٹی وی پر ہوئی اور گھنٹہ گزر گیا۔میں نے وقت دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔نجمہ نے بیٹھنے کے لئے کہا مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے

بتایا۔''گھر میں کوئی نہیں۔نوکر بھی نہیں ایسے ہی کھلا چھوڑ آئی ہوں اماں آ گئیں تو ناراض ہوں گی۔''

جب میں گیٹ سے نکلی اور اپنے گھر کی طرف بڑھی تو وہی لڑکا میرے سامنے آ گیا میں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہماری لین میں مرکزی ٹیوبیں نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا وقت سے پہلے ہی چھانے لگتا ہے۔

''میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھ سے۔''حیرت میری آنکھوں میں نمایاں تھی اور میرا دا ہنا ہاتھ میرے سینے پر تھا۔

''جی میں توصیف کا کلاس فیلو ہوں۔''

گویا وہ میڈیکل کا سٹوڈنٹ تھا اور میڈیکل کے سٹوڈنٹ سے بات کرنے میں قطعی ہرج نہ تھا۔ میں نے سوچا۔

''بات لمبی ہے تو گھر آ جاؤ۔''

میں نے گھر کی طرف اپنے قدم بڑھا دیئے۔ وہ سائیکل کو گیٹ کے پاس کھڑا کرنے لگا تو میں نے کہا۔

''اسے اندر لے آؤ کوئی اٹھا لے جا سکتا ہے۔''سیاہ گیٹ کا ایک پٹ میں نے کھول دیا۔اس نے سائیکل دیوار کے ساتھ ٹکائی۔ جب تک وہ فارغ نہ ہوا میں اس کے پاس کھڑی رہی۔

اس کا حلیہ اسے کسی بہت غریب گھر سے تعلق کا پتا دیتا تھا۔ڈرائینگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر میں نے بغور اسے دیکھا اور پوچھا۔

''کہو کیا بات ہے؟''

''مجھے میٹرک یا ایف ایس سی کی کوئی ٹیوشن دلانے میں آپ کچھ مدد کر سکتی ہیں۔''

''توصیف کے پاس تم اسی کام کے لئے آئے تھے۔''میں نے پوچھا۔

''جی نہیں ان کے پاس میں کسی اور کام کے لئے آیا تھا۔''

''کیا کام تھا وہ۔''میں اس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھی۔

اور مجھے احساس ہوا جیسے وہ تذبذب میں پھنس گیا ہے، کہے یا نہ کہے۔ میں خاموش بیٹھی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔

''غریبی بھی خدا کا بہت بڑا عذاب ہے۔ میں اپنی دو سالہ بیاہی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ پڑھنے میں بہت لائق ہوں۔ ہمیشہ وظیفہ لیا۔ میڈیکل کرنا میری بہت بڑی تمنا ہے۔ ٹیوشنوں اور وظیفوں کے بل پر ڈاکٹری کی لائن میں تو آ گیا اس کے بے شمار اخراجات کو برداشت کرنا اب میرے لئے بہت مشکل ہو رہا ہے۔ بیس ہزار کسی واقف کار سے پکڑا تھا کتابوں کی ضرورت تھی۔ کچھ دوسرے سال میں میں نے ٹیوشنز نہیں کیں۔ پہلے سال وقت بہت ضائع ہو گیا اور اپنی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکا۔ان پیسوں سے ضرورت پوری کرتا رہا۔ اب اس نے ناک میں دم کر دیا ہے کہ میرے پیسے واپس کرو۔ میں توصیف کے پاس آیا تھا مگر اس نے معذرت کر دی ہے۔''

تہمینہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''یہ روپے مجھے متین کو دینے ہیں۔ایک ہفتہ کا وعدہ کیا تھا میں نے۔ میرے خیال میں متین جیسے ہونہار نوجوان کی مالی اعانت کرنا نیکی ہی نہیں اس ملک کی بھی خدمت ہے۔''

مجھے تہمینہ کے نظریئے سے بالکل اتفاق تھا۔مگر میں اسے دیکھنا چاہتی تھی اور اپنی اس خواہش کا اظہار میں نے اس سے بھی کر دیا جس پر وہ بولی۔

''میں کہہ دوں گی وہ آپ سے مل لے۔''

اگلے دن میں نے رقم بینک سے نکلوا کر اسے دے دی۔

تہمینہ اور متین کے درمیان طے پا گیا تھا کہ وہ اسے پیسے دینے کہاں آئے گی؟ یہ مقام ہسپتال کا تھا جو میڈیکل کالج کے ساتھ ملحق تھا۔

گیارہ بجے وہ سکول سے چھٹی لے کر چلی گئی۔متین اسی جگہ اس کا منتظر تھا وہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔تہمینہ نے پرس سے پیسوں کا لفافہ نکالا اس کی طرف بڑھایا اور آہستگی سے کہا۔

''اسے قرض مت سمجھنا۔یہ مدد ہے ایک انسان کی دوسرے انسان کو۔آئندہ بھی جہاں تک ممکن ہو سکا میں تمہارے لئے کچھ کرتی رہوں گی۔ٹیوشنز کے چکروں کو چھوڑو اور اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو۔''

معلوم نہیں یہ جذبہ ممنونیت کی انتہا تھی یا وہ صورت حال سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔تہمینہ کو اس کی آنکھوں میں نمی سی محسوس ہوئی اس کے ہونٹ میں پھڑ پھڑانے لگے تھے۔وہ ایک ٹک تہمینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔اس نے گھبرا کر اسے دیکھا اور بولی۔

''کیا بات ہے متین؟''

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''اس نے بے بسی سے کہا۔

''یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے؟ آخر انسان ہی ایک دوسرے کا دکھ بانٹتے ہیں۔جانور تو آ کر احوال پرسی کرنے سے رہے۔''

وہ اسے کنٹین میں لے گیا جہاں اس نے تہمینہ کو چائے پلائی اور یہ پوچھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے کہاں مل سکتی ہے؟ تہمینہ نے اسے سکول کا پتہ بتایا اور مجھ سے ملنے کو بھی کہا۔

یہ اکتوبر کے خوشگوار دن تھے۔آفس کے سامنے چھوٹے سے باغیچے میں گلاب کے پھول مسکرا رہے تھے۔میری نظریں بہت دیر سے ان پر جمی ہوئی تھیں۔ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے وہ دائیں بائیں لہراتے خوبصورت لگ رہے تھے۔جب میری محویت ''میں اندر آ سکتا ہوں۔''جیسے اجازتی جملے سے ٹوٹ گئی۔ایک نوجوان سا لڑکا میرے سر کو اثبات میں ہلتے دیکھ کر اندر آ گیا۔آتے ہی اس نے سر کو قدرے جھکایا اور بولا۔

''میں متین احمد ہوں مس تہمینہ نے شائد میرا ذکر آپ سے کیا ہو۔''

میں نے یک دم خوش ہو کر کہا۔''اچھا اچھا تو آپ متین ہیں بیٹھئے۔''

وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔میں نے گہری تنقیدی نگاہ اس پر ڈالی۔اس کی آنکھیں موٹی موٹی سی تھیں مگر معلوم نہیں مجھے وہ کچھ عجیب سی لگیں۔اس کا چہرہ معصومیت بھرا نہیں تھا۔میں کچھ پریشان سی ہو گئی۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے بارے میں اتنی جلدی فیصلے نہیں ہوتے۔اس کی ذات کی اتنی تہیں ہیں کہ بعض اوقات سالوں ساتھ

رہ کر بھی پتہ نہیں چلتا، مگر پھر بھی میں جو عمر کی درمیانی منزل میں ہوں۔ چہرے مہروں سے تھوڑا بہت جاننے کا دعویٰ ضرور رکھتی ہوں۔

اس کے چہرے نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی باتیں بڑی حقیقت پسندانہ تھیں۔ ان میں غم کی جھلک تھی اور حوادث سے نمٹنے کا عزم بھی۔ میں نے تہمینہ کو بلایا۔ میرا خیال اسے چائے پلانے کا تھا مگر تہمینہ کی موجودگی میں۔

اور میں نے دیکھا تہمینہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی، متین کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں اور رخساروں پر جیسے گلاب سے کھل اٹھے اور جس انداز میں اس نے متین کو دیکھا تھا وہ مجھے یہ سمجھانے اور بتانے کو کافی تھا کہ وہ ہمدردی سے آگے بڑھ گئی ہے۔ میں نے متین کے چہرے پر جو کچھ بکھرا دیکھا تھا اس سے صرف یہی جان سکی کہ وہاں مسکراہٹ ضرور تھی مگر سنجیدہ سی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے رخصت چاہی۔ تہمینہ اس کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ میں نے کھڑکی کے شفاف شیشے میں سے دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خاموش سا یہ اندازِ دیدان کی محبت کی چغلی کھاتا تھا۔ مجھے قدرے حیرت بھی تھی کہ تہمینہ اچھی بھلی سمجھ دار لڑکی کیسے بیوقوف بن گئی ہے؟ اسے اپنی اور اس کی عمروں کے درمیان فرق کا احساس نہیں۔ زمانہ کون سا جا رہا ہے۔ یہ اسے مالی لحاظ سے سپورٹ کرتی رہے گی اور وہ اسے بیوقوف بناتا رہے گا۔ ڈاکٹر بن کر کسی اچھی خوبصورت لڑکی سے بیاہ رچا لے گا اور یہ بیٹھی قسمت کو روئے گی۔

اسے رخصت کرنے کے بعد جب تہمینہ واپس آئی تو میرے پاس ہی آ گئی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

''مسز محسن کیسا لگا آپ کو متین؟''

''اچھا ہے۔'' میں نے قدرے توقف سے کہا۔

''تہمینہ دیکھو میں ایک بات تم سے ضرور کہنا چاہتی ہوں۔ انسانی فطرت مطلب برآری کے لئے گدھے کو باپ بنانے سے نہیں چوکتی۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہمدردیوں کی لپیٹ میں اپنا آپ لٹاتی رہو اور وہ ایک دن احسان فراموشی کی داستان بن کر تمہارے سامنے آ جائے اس وقت تم دکھ اور کرب کی جس منزل سے گزرو گی اس کا اندازہ مجھے ابھی سے ہو رہا ہے۔''

اس نے میرے ان خدشات کے جواب میں کچھ نہ کہا بس سر جھکائے چپ چاپ میری باتیں سنتی رہی۔ بریک کی گھنٹی بجی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

بہت عرصے تک مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا مگر ایک بات میں نے ضرور محسوس کی تھی کہ تہمینہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ ایک دو بار میں نے اس سے پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئی۔ ایک دن اتفاق سے جب میں ٹیچرز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تہمینہ زیرِ بحث آ گئی۔ مسز رحمان نے تنگ کر میرے اس اندیشے کی تردید کی جو مجھے اس کی صحت کے بارے میں تھا۔

تین ٹیوشنز تو وہ سکول ختم ہو جانے کے بعد پڑھاتی ہے اور تین چار کے گھروں میں جاتی ہے۔

اور جیسے میرے دل پر گھونسہ پڑا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اس مشقت کی چکّی میں کس لئے پس رہی ہے؟ میں خاموش تھی اور مسز رحمان غالباً منتظر تھی کہ وہ میرے کسی بھی حیرت کے اظہار کے بعد حقیقت سے پردہ اٹھائے اور میں اپنی ہی سوچ میں گم تھی جب اس نے کہا۔

''کسی ڈاکٹر کے پیچھے لگی ہوئی ہے اسے پڑھا رہی ہے۔'' اور ساتھ ہی طنزیہ سا قہقہہ فضا میں اچھال دیا۔

''احمق! جب وہ ڈاج دے جائے گا تو بیٹھی قسمت کو روئے گی۔''

میں خاموش رہی تبصرے کرنا مجھے قطعی پسند نہیں۔

ایک دن میں نے مسکراتے ہوئے ٹوہ لینے کی خاطر کہا۔

''میرا خیال ہے تم محبت کر بیٹھی ہو۔'' میں نے موضوع کی تلخی کو مسکراہٹ کی آڑ دی۔ اور اس نے شرمانے یا سر جھکانے کے بجائے سکون سے کہا۔

''شائد اسی کا نام محبت ہے مجھے متین اچھا لگنے لگا ہے۔''

''مگر وہ تم سے شادی کرلے گا؟''

''مسز محسن شادی بیاہ تو مقدروں کی بات ہے۔ میں نے اگر اسے مالی اعانت دی ہے یا دے رہی ہوں تو یہ عوض نہیں مجھے اس کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔ اس بار اس نے ٹاپ کیا ہے۔''

''کیسی لڑکی ہے۔ کتنا بڑا دل رکھتی ہے، خدا کرے خوش رہے۔''

متین کے ساتھ اس کی دوستی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سب لوگ جان گئے تھے۔ بیشتر کا نظریہ میرے جیسا تھا۔

اور جس دن متین ڈاکٹر بنا اس دن اس نے بہت شاندار پارٹی دی۔ سب لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ متین کو بھی بلا لے۔ متین بھی آیا۔ اس نے پنجاب کے میڈیکل کالجوں میں نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔

میں نے کافی مدت بعد اسے دیکھا تھا۔ وہ خاصا صحت منداور اچھا لگ رہا تھا۔

مسز رحمان نے پوچھا ''شادی کب کرو گے؟''

''ابھی تو کوئی پروگرام نہیں جی۔ ہاؤس جاب کرنا ہے پھر باہر جانے کے لئے وظیفہ متوقع ہے۔''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تہمینہ نہایت سکون سے پیالیوں میں چائے ڈالنے اور سب لوگوں کو پیش کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے اندر کوئی طوفان برپا تھا یا وہ پرسکون تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

متین کے جانے کے بعد ایک دو نے کہا بھی۔ ''تہمینہ ریت سے گھر بنانے کی کوشش کر رہی ہو'' اور وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''میں نے تو گھر بنانے کا سوچا نہیں تم بلاوجہ سوچیں پیدا کر رہی ہو۔ گھر اوپر والا بناتا ہے۔ چاہے گا تو جو بنیاد میں نے رکھی ہے اُس پر بن جائے گا اور اگر نہیں تو میں بجری، سیمنٹ، چپس لے کر بھی نہیں پاؤں گی۔''

متین ان دنوں ہاؤس جاب کر رہا تھا۔

پھر بہار کی ایک رنگوں سے بھری صبح کو وہ بہار کی طرح کلائی اور بازوؤں تک مہندی کے پھول پتیوں سے سجی قیمتی زرتار جوڑا پہنے اور پھولوں کے زیورات سے لدی پھندی سکول میں آئی اور متین سے اپنے نکاح کی دھماکہ خیز خبر سنائی۔ ہم سب کے چیخنے اور چلانے پر اس کا معذرت بھرا اظہار تھا کہ بس سادگی سے نکاح ہوا ہے۔ باہر سے تو کوئی مدعو ہی نہیں تھا۔

چلو خوشی کی بات تھی۔ اس کی بے کیف سی زندگی میں خوشیوں کے رنگ تو گھلے۔

سال بعد بچہ آ گیا۔ وہ واقعی بہت خوش تھی۔ مسرور و مطمئن اور سرشار سی۔

متین پڑھنے کے لئے انگلینڈ چلا گیا۔ پانچ سال بعد واپس آ کر اس نے گلبرگ میں ایک شاندار اسپتال اور گھر بنایا۔ تہمینہ نے نوکری چھوڑ دی اور اسپتال کی منتظم اعلیٰ کی ڈیوٹی سنبھال لی۔

انسانوں کو پرکھنے پڑھنے اور ان کو جانچنے کے میرے سارے دعوے غلط نکلے تھے۔

ہم سب کا خیال تھا کہ تہمینہ بختاور ہے۔قسمت کی دھنی ہے۔مقدر نے اس کا بہت ساتھ دیا ہے۔

یہ جاتی سردیوں کے دن تھے۔میرے بچے چائنیز کھانے کے لئے ضد کررہے تھے میں انہیں لے کر ایک چینی ریستوران میں چلی گئی۔ بڑا خوابناک سا ماحول تھا۔ بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں میزوں کے گرد بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب ذرا فاصلے پر کونے میں ایک نوجوان چہرے نے مجھے فی الفور اپنی طرف کھینچ لیا۔لڑکی کا حسن نیم اندھیرے میں لشکارے مارتا تھا۔ بار بار میری نظریں اس کی طرف اٹھتی تھیں۔ مجھے تجسس سا تھا کہ ساتھ بیٹھا مرد کیسا ہے؟ دونوں جب اٹھے میں ششدر رہ گئی۔ وہ متین تھا۔ بہت وجیہ لگ رہا تھا۔ دبلا پتلا جسم اب بھر گیا تھا۔ باہر کی تعلیم و تربیت نے زبردست گرومنگ کردی تھی۔ دونوں اپنی ترنگ میں میرے قریب سے گزر کر چلے گئے۔

تو میرے خدشات درست تھے۔انسانوں کے بارے میں میری ریڈنگ بھی غلط نہ تھی۔ایسے ہی ہوتا ہے۔

اگلے دن میں نے تہمینہ کو فون کیا۔ایک دکھ بھری جھجک آمیز تشویش میرے لب و لہجے سے ہویدا تھی۔ میں حیران رہ گئی۔

''مسز محسن'' اس کی آواز میں طمانیت سے بھرا ہوا محبت بھرا رچاؤ تھا۔ وہ ثمرہ تھی۔ متین کے بچپن کے انتہائی برے دنوں کی ساتھی۔اس کی محبت،اس کی بیوی۔

میں تو سناٹے کی سی کیفیت میں تھی وہ چند لمحوں کے لئے رکی تھی پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔

ثمرہ کے بارے میں تو اس نے پہلی چند ملاقاتوں کے بعد ہی بتا دیا تھا۔

مسز محسن جب تیس سال کی ایک سمجھ دار، پختہ عمر کی اپنے مستقبل سے مایوس لڑکی خود سے نو سال چھوٹی عمر کے لڑکے سے اس کی مجبوریوں اور اپنی تشنہ خواہشوں کے تانے بانوں سے ایک رشتہ بننے لگتی ہے تو سمجھوتے کی لچک کو بھی ساتھ رکھتی ہے۔ متین کی بیوہ ماں ثمرہ کی ملازمہ تھی۔ان کی جھوٹن سے اپنا اور بچے کا پیٹ بھرتی تھی۔ثمرہ کا گھر اس کی ماں کی وہ پناہ گاہ تھی کہ جہاں اس نے اپنا وقت عزت و آبرو سے کاٹا۔

دونوں میں کوئی تین چار سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ دونوں میں بے پناہ محبت تھی۔ متین میرے خلوص اور قربانیوں سے بھی متاثر تھا۔ میری زندگی میں خوشیاں بکھیرنے کا آرزومند تھا۔مگر ثمرہ کی محبت کی ڈوریوں میں بندھا ہوا تھا۔ میں سوچتی رہی اور بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

متین دو کشتیوں میں پیر رکھ بیٹھا تھا۔ میری دانش مندی نے اسے ڈولنے نہیں دیا۔اس کے انگلینڈ جانے سے قبل ثمرہ کا اغوا، نکاح،اس کی تعلیم اور گرومنگ میرے تعاون اور میری نگرانی میں ممکن ہوئے۔ پانچ سال وہ میرے ساتھ میرے زیرِ سایہ رہی۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔

میں ہونقوں کی طرح منہ کھولے آنکھیں پھاڑے یہ سب سنتی تھی جانے کیوں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔''ارے مسز محسن میں تو اس کے سارے نظام کی گاڈ مدر ہوں۔ میرے خمار کے لئے تو یہی کافی ہے۔''

◆◆◆

اعتراف

پیروز بخت قاضی

صبح دونوں بچوں کو سکول چھوڑنا' خود کالج جانا اور راستہ میں سفر کے دوران کتاب پڑھنا.....اگر کوئی میرے روزمرہ کے معمولات کا مشاہدہ کرے تو میرے بارے میں ایک باعزّت جواں سال ماں اور سنجیدہ طالبہ ہونے کے علاوہ اور کوئی تاثر قائم نہیں کر سکتا۔

لیکن اکثر راتوں کے دوران ایک گھنٹہ کے لئے میں ایک بالکل مختلف شخصیت بن جاتی ہوں۔ میرے اکتیس سالہ نئے بوائے فرینڈ کو میری خفیہ زندگی کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔ ہر رات میں اپنی آٹھ سالہ بیٹی اور چھ سالہ بیٹے کو سلانے سے قبل بوسہ دیتے وقت خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ میرے بچوں کو میری خفیہ زندگی کا علم نہ ہونے پائے۔ جب میں ایک ماں' ایک کالج سٹوڈنٹ یا ایک گرل فرینڈ نہیں ہوتی تو میں ایک اکیس سالہ بلانڈ دوشیزہ کا روپ دھار لیتی ہوں اور سینڈی بن جاتی ہوں جو ایک بار کوئی بھی تجربہ کرنے پر آمادہ ہو اور اس کی بابت بات چیت بھی کر سکے۔ میں مہینے میں تقریباً بیس گھنٹے اجنبی مردوں کو ٹیلی فون پر سیکس فروخت کرتی ہوں اور اس کے عوض ایک ہزار ڈالر تک معاوضہ وصول کر لیتی ہوں۔

یہ کام تب شروع ہوا جب میری شادی علیحدگی پر منتج ہوئی۔ میرا سابقہ شوہر چارلی کاروباری شخص تھا جسے دنیا بھر کے شہروں میں کاروبار کے لئے جانا پڑتا تھا۔ وہ جہاں بھی ہوتا سونے سے پہلے مجھے ہمیشہ فون کرتا۔ اگر اس نے چند جام چڑھائے ہوتے تو فون پر زندہ دلی کا مظاہرہ کرتا اور میں اسی موڈ میں بات کرنے میں عار محسوس نہ کرتی اور یہ دلچسپ کھیل جاری رہتا۔ وہ مجھے کہتا ''لارا! تم فون پر کمال کی سیکس کرتی ہو''۔ لیکن حالات اتنے خوشگوار نہ رہے۔ جب دونوں بچے سکول جانے لگے تو میں نے بھی ٹیچر ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح مجھے جو شخصی آزادی حاصل ہوئی وہ میرے لئے بڑی اطمینان بخش تھی کیونکہ چارلی شراب کا زیادہ ہی رسیا ہو گیا تھا۔ رات گئے فون پر سیکس جھاڑنا اب قصۂ پارینہ ہو چکا تھا۔ وہ جب گھر پر ہوتا تو رات نشہ کی حالت میں بمشکل سیڑھیاں چڑھ کر بیڈروم تک پہنچتا اور بستر پر گرتے ہی سو جاتا۔ اس نے سائیکیاٹرسٹ سے مشاورت بھی کی لیکن علاج کارگر نہ ہوا۔ میری مسلسل نکتہ چینی اور ٹیچنگ کورس کی بھرپور مصروفیت اسے مہینوں تک مجھ سے دور رکھتیں۔ اس نے مجھے کہا ''تمہارے روّیے کے علاوہ بھلا میری کثرت شراب نوشی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ بس میں تم سے طلاق چاہتا ہوں''۔

چارلی جتنا کشادہ دل تھا اتنا ہی کمینہ بھی بن گیا۔ اس نے بچوں کے اخراجات از سرِ نو ترتیب دیئے۔ اس نے بچوں کی آیا کو ملازمت سے فارغ کر دیا اور موٹر کاریں اور مکان فروخت کر دیئے۔ چنانچہ میں بچوں کو لے کر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئی

اور زندگی میں پہلی بار کفایت شعاری پر توجہ دی۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ میں نے فروخت کر دیا..... کپڑے' زیورات' سی ڈیز وغیرہ۔ میں نے جب ٹرین کا کرایہ' بچوں کی سکول آمدورفت کے اخراجات اور ان کی کتابوں کا خرچہ ادا کر دیا تو میں خالی ہاتھ ہوگئی اور ٹوٹ کر رہ گئی۔ میرے لئے ملازمت کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ میرا سارا دن کالج میں گزرتا۔ شام کے وقت اور ہفتہ وار چھٹی کے دوران بچوں کی نگہداشت میں مصروف رہتی۔

ایک روز ٹرین میں سفر کے دوران میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ ہماری گزر بسر کس طرح ہوگی کہ اچانک میری نظر اخبار کے اشتہار پر پڑی۔ ''کیا آپ گھر بیٹھے معقول رقم کمانا چاہتی ہیں؟ اوقاتِ کار آپ کی پسند کے؟ کشادہ دلی اور کھلے ذہن کے ساتھ؟ اس فون نمبر پر رابطہ کریں''۔ لگتا تھا کہ بذریعہ فون Sale کا کام ہوگا سوائے اس کے کہ اشتہار کی عبارت کے ساتھ نیم عریاں عورتوں کی تصویریں تھیں جن کی چھاتیاں اور ہونٹ نمایاں طور پر دکھائے گئے تھے۔ یہ تصویریں اور ان کے ساتھ بیباک جنسی الفاظ دیکھ کر میرا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ اپنے سابقہ شوہر سے فون پر شہوانی فقروں میں گفتگو کرنا اور بات تھی۔ اس کے برعکس یہ سنجیدہ کاروبار تھا لیکن ہوسکتا تھا اس کے ساتھ معقول معاوضہ بھی وابستہ ہو۔

اسی شام میں نے فون کا نمبر ملایا اور تمام معلومات جاننا چاہیں۔ جب مجھے معلومات کا لفافہ موصول ہوا تو میں نے اسے لے کر خود کو باتھ روم میں بند کر لیا۔ اس میں ہدایات درج تھیں ''لچر زبان اس وقت تک نہ بولیں جب تک فون کرنے والا پہلے ایسا نہ کرے۔ اپنا ایک فرضی کردار اختیار کر لیں۔ ایسے شخص سے کوئی بات نہ کریں جو آپ کو بچہ بننے کے لئے کہے''۔ یہ کام کافی بے ضرر لگتا تھا اور میں محسوس کرتی تھی کہ اس پر قابو پالوں گی۔ پہلا کام اپنی متبادل شخصیت اختیار کرنے کا تھا۔ چنانچہ میں سینڈی بن گئی تھی جس کی گوری رنگت' چاندی جیسے بال اور نیلی آنکھیں جو نہایت شفاف ہیں۔ جس کے سینے کے ابھار نمایاں ہیں اور جو ابھی جم سے ورزش کر کے لوٹی ہے اور بالکل تازہ دم ہے۔ یا جو اونچی ایڑی کی سینڈل اور نہایت مختصر لباس پہنے اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔

کتابچہ میں درج تربیتی فون ملا کر جب تک میں نے کافی اعتماد پیدا نہیں کر لیا اس وقت تک میں نے کسی گاہک سے گفتگو نہیں کی۔ شروع میں بہت نروس تھی ''کیا میں فون پر کافی شہوت انگیز لگوں گی؟'' تربیت دینے والے نے مجھے مختلف مناظر کی ٹریننگ دی۔ ''ذرا بلند آواز میں جسمانی یا ذہنی تناؤ کا اظہار کرو'' استاد نے بتایا ''کال کرنے والے کو تفصیل سے بتاؤ تم نے کیا پہن رکھا ہے''۔ یہ بدتمیزی نہ تھی بلکہ دلچسپی کا باعث تھا۔ میں ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہی تھی۔ یہ ہیجان انگیز عمل تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ میں نے کالر کو فون پر زیادہ سے زیادہ دیر تک مشغول رکھنا ہے۔ اس طرح مجھے زیادہ اجرت ملے گی۔ لیکن مجھے اپنی اصل ذاتی تفصیلات ہرگز ظاہر نہیں کرنی۔ تمام وقت مجھے سینڈی بنے رہنا ہے۔ میں نے مزید دو دفعہ تربیت حاصل کرنے کے لئے فون کیا۔ یہ کام میرے لئے آسان تھا۔ میں سکول ڈراموں میں بڑے شوق سے ایکٹنگ کیا کرتی تھی اور یہ میرے لئے محض ایک نیا رول تھا۔ یہ دولت کمانے کا محفوظ اور آسان طریقہ تھا جس کی میرے معمولات میں گنجائش نکل سکتی تھی۔ بھلا یہ عمل مجھے کیا نقصان پہنچا سکتا تھا۔

مجھے ایک پن نمبر دیا گیا جسے میں اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق ٹیلی فون کے نظام میں ڈال سکتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اسے بند کر دیا۔ میں جانتی تھی کہ میں ایسا کر سکتی ہوں لیکن میں گندی زبان میں گفتگو کرنے سے گھبراتی تھی۔

کچھ روز بعد میری واشنگ مشین جواب دے گئی۔ اب میرے لئے کوئی تدبیر کرنا لازم ہوگیا تھا۔ نئی مشین خریدنے کے لئے

میں چھ سوڈالر کہاں سے لاؤں گی۔ میں نے بچوں کو سکول میں چھوڑا اور واپسی پر گاڑی چلاتے ہوئے خود کو سینڈی میں تبدیل کر لیا۔ گھر پہنچ کر ٹریک سوٹ اور سلیپر پہنے ہوئے میں صوفے میں دھنس گئی اور اپنے فون پر پن کوڈ کا نمبر دبایا اور آرام سے بیٹھ کر کال کا انتظار کرنے لگی۔ ٹیلی ویژن پر صبح والا پروگرام پھر چل رہا تھا جس کی آواز میں نے بالکل آہستہ کر دی تھی۔

کچھ ہی لمحوں بعد فون کی گھنٹی بجی۔ فون کرنے والے کا نمبر خصوصی کوڈ پر نمودار ہوا اور سینڈی لائن پر حاضر تھی۔

''ہائے! میں سینڈی ہوں۔ مجھے فون کرنے کا شکریہ۔ میں اکیلی بور ہو رہی ہوں''۔

''کیا ہم بات کر سکتے ہیں''؟ کالر اچھی مگر مختصر گفتگو کر رہا تھا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے کیا پہن رکھا ہے''؟ اس نے دریافت کیا۔

''اچھا مسٹر! میں بتاتی ہوں''۔ میں نے تھوڑی دیر غور کیا اور پھر اپنے پنک رنگ کے' اور لیس لگے اور نفیس ڈوریوں والے پہناوے اور سٹیلیٹو ایڑی کی تفصیل بیان کرنے لگی۔

جب فون بند ہوا تب تک ٹی وی پر صبح والا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ سینڈی نے اس مرد کو فون پر چالیس منٹ تک مصروف رکھا تھا۔ دوسری طرف سے کافی سرد آہیں بھری گئیں اور اُف اور ہائے جیسے الفاظ ادا کئے گئے اور دل میں کچھ ٹیسیں اٹھنے کا اظہار کیا گیا۔ لیکن میں نے سینڈی کو ایک ماہر کی طرح حوصلہ افزائی کرنے اور ہلکے ہلکے ہنستے ہوئے بات کرنے کا لہجہ اختیار کرنے پر آمادہ کئے رکھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی بیوی نے اس کے ساتھ جنسی رابطہ منقطع کر رکھا ہے کیونکہ اس نے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔ بات ختم کرنے سے قبل اس نے بڑے مہذب انداز میں مجھے خدا حافظ کہا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کر گزری ہوں۔ لیکن میرے لئے ایک نئی واشنگ مشین خریدنے اور مالی حالات کو سنبھالا دینے کے آثار سے پیدا ہو گئے تھے۔ یقیناً مجھے گندگی کا کوئی احساس نہ ہوا تھا۔

دو راتوں کے بعد میں نے اس تجربے کو دہرایا۔ اس مرتبہ کال کرنے والا مجھ سے حقیقت پر مبنی تفصیل کا متمنی تھا۔ میں نے کچھ ناآسودگی محسوس کی لیکن میں شروع ہو گئی۔ میں نے کمبل کے نیچے اپنا پاجامہ اوپر کھینچ لیا۔ کال کرنے والے کا مطالبہ میرے بات ختم کرنے کے لئے کافی وجہ نہ تھی۔ دولت آ رہی تھی اور کسی کو زک نہ پہنچ رہی تھی۔

اب مجھے یہ کام کرتے ہوئے ایک برس کا عرصہ ہو چکا ہے۔ میں ہمیشہ بہت احتیاط کرتی ہوں۔ میں یہ کام اس وقت کرتی ہوں جب میرے بچے گہری نیند سو چکے ہوتے ہیں۔ میں ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرتی ہوں اور اطمینان کر لیتی ہوں کہ بچوں کے کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند ہے۔ اب میرے لئے پرستار ہیں جو باقاعدہ فون کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک شخص ڈیسک پر کتاب سے زور کی ضرب لگاتا ہے اور مجھ سے دریافت کرتا ہے کہ چوتڑ پر تھپڑ کی ضرب کیسی محسوس ہوتی ہے؟ ایک شخص پچاس منٹ تک ایک لفظ بھی نہیں بولے گا اور میں اس کے کان میں رس گھولتی رہوں گی اور بتاتی رہوں گی کہ میں بستر میں کیا کچھ کرنا پسند کرتی ہوں۔ ایک شخص سیکس کی کوئی بات کئے بنا محض اپنائیت کی باتیں کرتا ہے اور صرف رابطہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

سینڈی میرے معمولات کا حصہ بن چکی ہے لیکن جب سے میں پال Paul سے ملی ہوں اور وہ میرا بوائے فرینڈ بنا ہے میرے معاملات کچھ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ وہ مجھ سے میلوں کے فاصلہ پر رہتا ہے۔ لیکن جب وہ مجھے ملنے کے لئے آتا ہے تو میں اپنے اوقاتِ کار

میں اس پر مکمل بھروسہ اور اعتماد کرنا چاہوں گی۔ لیکن اگر وہ مجھ سے مایوس یا متنفر ہو گیا تو کیا بنے گا؟ میں اسے کھونا نہیں چاہتی لیکن ہزار ماہانہ کی قربانی بڑی بات ہوگی۔ چمکتی دمکتی نئی واشنگ مشین میری خفیہ زندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اور یہی صورت بچوں کی نئی ہوا اور بیوٹی پارلر سے فیشل کرانے کی ہے جہاں میں پچھلے ہفتے گئی تھی۔

ایک طرف میں خوش ہوں کہ میں نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن جس روز میں ٹیچر ٹریننگ مکمل کر کے کی ملازمت حاصل کرلوں گی تو میں سینڈی کو ریٹائر ہونے دوں گی۔ پال اور بچے کبھی نہیں جان پائیں گے وہ صرف میری خود اعتمادی خوشحالی دیکھ پائیں گے۔

◆◆◆

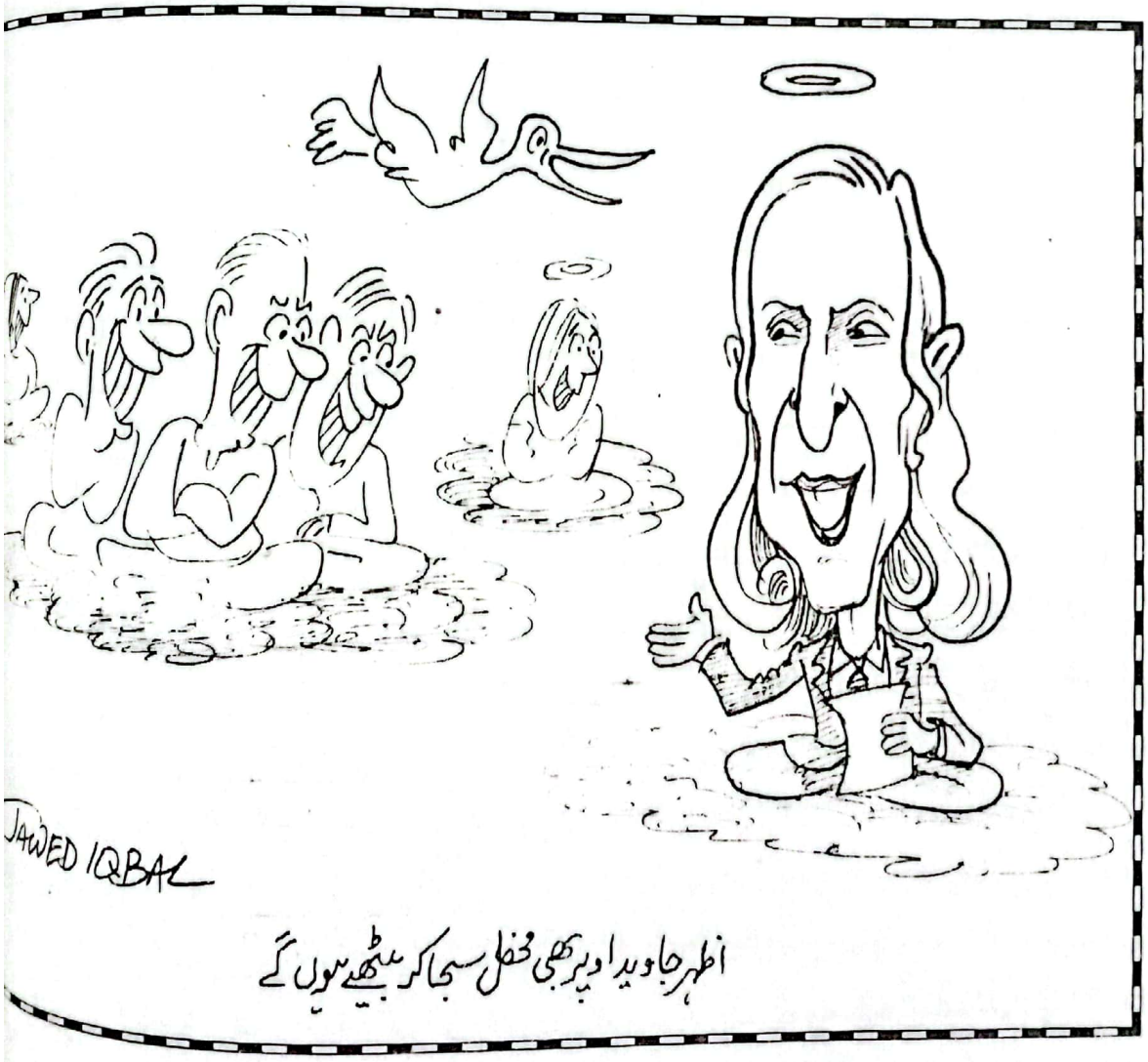

اظہر جاوید اوپر بھی محفل سجا کر بیٹھے ہوں گے

تین آنکھوں والی لڑکی

محمد طارق علی

میں پہلی ملاقات میں اس سے کوئی خاص متاثر نہ ہوا، حالاں کہ وہ میرا ہم پیشہ تھا، گفتگو بھی سلیقے اور خاصے اپنائیت والے انداز میں کر رہا تھا۔ پھر بھی جانے کیا تھا' اس کی شخصیت مجھے اپیل نہیں کر رہی تھی۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اچانک کوئی ایسی ہستی آ ملتی ہے کہ اس کی شخصی لہریں آناً فاناً بند دروازے کھول کر سیدھی دل میں در آتی ہیں، یا وہیں دل کے آس پاس ڈیرے ڈال دیتی ہیں' خواہ یہ محبت کی بات ہو' دوستی کی ہو یا کسی گہری عقیدت کی۔ اور کبھی ایسا تجربہ بھی ہوا ہے کہ چاہے ہم کسی سے روز ملتے ہوں لیکن سلام و دعا' پرسشِ حال کے باوجود باہمی تعلق رسمی کلمات سے آگے بڑھ نہیں پاتا' اس لئے کہ وہ بندہ ''کلک'' ہی نہیں کرتا۔

عبدالسلام جرنلسٹ سے میری پہلی ملاقات کچھ ایسی ہی ثابت ہوئی، شاید اس لئے بھی کہ ہماری پہلے سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ اس ملاقات کا مقصد بھی' کم از کم میری جانب سے' ذاتی تعارف کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بہت ممکن ہے ہماری یہ پہلی ملاقات بھی کبھی نہ ہوتی لیکن پہل میری جانب سے ہوئی اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

وہ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میں اپنی روزمرہ کی روکھی پھیکی لائف سے خاصا بور ہو چکا تھا' اپنی پہلی ''چاہت'' یعنی ''صحافت'' سے ریٹائرمنٹ کے بعد میری زندگی بدرنگ اور بے کیف ہو کر رہ گئی تھی۔ دفتری جھمیلوں سے ہٹ کر ''ہوم سویٹ ہوم'' میرا پکّا ٹھکانہ بن چکا تھا۔ یوں میں اب ایک گوشہ گیر آدمی تھا' بیکار دن اور بیکار راتوں نے میرے اردگرد جال سا بُن دیا تھا۔ مجھے اپنے اخبار کے دفتر سے ایک اچھی خاصی رقم اکٹھی پینشن کی شکل میں ضرور ملی لیکن ساتھ ہی اُداسیوں اور تنہائیوں نے بھی مجھے لپیٹ لیا۔

میرے شروع کے کئی دن تو گھر میں اس طرح گذرے کہ میں گذشتہ تقریباً تین دہائیوں میں مختلف نیوز رومز کی میزوں پر اپنی ''گم شدہ'' نیندیں پوری کرتا رہا۔ گویا میں نے خود کو ''مصروف'' رکھنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اس ''کام'' سے اکتا گیا۔ کبھی کبھی میں بہت حسرت سے اس قلم کو دیکھتا جس کی روانی، کسی وقت کافی مشہور ہوا کرتی تھی لیکن اب اس کی ''خشک'' نِب مجھے بے طرح چبھ رہی تھی۔ دل میں اسی ''پرانے نشے'' یعنی بھرپور مصروفیت کی طلب بڑھنے لگی' لیکن نہیں' میں تو بہ وقتِ رخصت اپنے اخبار کے در و دیوار پر ایک الوداعی نظر ڈال آیا تھا' اب وہاں جا کر اپنے جونیئر ساتھیوں سے گپ شپ کرنا اور ان کا مروتاً پیش کردہ چائے کا ایک کپ پی کر' کسی کالم کی درخواست کرنا مجھے ایک بے معنی اور ذاتی انا کے منافی بات لگی' سو میں نے اس خیال کو حتمی طور پر جھٹک دیا۔

پھر ایک روز بیٹھے بیٹھے مجھے ''پنڈی پریس کلب'' کا خیال آیا جہاں میں نے اپنی پچیس سالہ صحافتی زندگی کے بہت سے شب و روز گذارے تھے۔ سوچا کہ میں وہاں جاؤں تو کوئی نہ کوئی پرانا دوست یا آشنا مل ہی جائے گا' پھر اس کے ساتھ چائے کے ایک کپ پر گپ شپ یا کیرم / ٹیبل ٹینس کا کوئی دو بدو مقابلہ اور اگر یہ بھی نہیں تو شطرنج کی بازی تو ضرور لگے گی' سو میں نے وہیں جانا مناسب سمجھا۔

گہرے نیلے آسمان پر ہولے ہولے پھیلنے والی ہلکی سرخی ڈھلتی شام کا منظر دکھا رہی تھی۔ میں نے پارکنگ میں اپنی کھٹارا سوزوکی ایف ایکس کھڑی کر دی۔ پریس کلب کے ریڈنگ روم میں چلا گیا۔ وہاں مطالعے کی میز پر مختلف تازہ اخبار پڑے تھے۔ ایک ہفتہ وار اخبار ''فریش نیوز'' نیا سا لگا' میں اسی کو اٹھا کر لاؤنج میں پہنچ گیا۔ کک نے مجھے دیکھتے ہی سپر یٹ چائے کی ٹرے لا کر میرے سامنے رکھ دی۔

چائے کی چسکیوں کے ساتھ میں ''فریش نیوز'' دیکھنے لگا' حیرت ہوئی کہ خبروں والا پہلا اور آخری صفحہ رنگین تھا اور فلمی گوشہ بھی تھا۔ خبریں روٹین کی تھیں اور لے آؤٹ مجموعی طور پر اچھا تھا۔ ادارتی صفحہ کمزور لگا لیکن حالاتِ حاضرہ پر ایک دو مضامین ٹھیک تھے' مجھے اخبار کے ایڈیٹر کا نام' عبدالسلام' نیا سا لگا۔ چیف ایڈیٹر' کوئی منیرہ نامی خاتون تھی' اس کا نام بھی جان کاری والے صحافیوں میں سے نہیں تھا۔ یوں ہی کسی خیال کے تحت میں نے موبائل پر ایڈیٹر کا نمبر ڈائل کیا' رابطہ ہو گیا۔ میں نے اپنا نام بتایا اور نیا پرچہ نکالنے پر مبارک باد دے کر اس کا تعارف چاہا۔ کہنے لگا: ''میرا بچپن پنڈی میں گذرا' پھر لاہور چلا گیا' وہیں تعلیم حاصل کی' صحافت کا پیشہ اپنایا' والدین فوت ہو گئے تو واپس یہاں پنڈی چلا آیا۔ صحافت کے چسکے نے مجھ ایسے اناڑی سے ہفتہ وار اخبار نکلوا لیا' اب یہ گلے میں پڑا ڈھول ہر ہفتے بجاتا ہوں' ابھی اس کی اے بی سی (ABC) نہیں ہوئی' کوشش میں لگا ہوں' دیکھئے، کب بات بنتی ہے.....اور جناب کی تعریف؟'' میں نے جواب میں ''تعریف'' کی بجائے کئی ''ذاتی برائیاں'' اس کے گوش گذار کیں اور ایک سب سے ''بڑی اور تازہ برائی'' سے بھی اسے آگاہ کیا: ''حال ہی میں صحافت سے ریٹائرمنٹ لے کر خود کو ویلا کر بیٹھا ہوں۔''

''ارے صاحب' یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا' عزت و آرام کے ساتھ اپنے گھر واپس آ گئے' آپ ویلے نہیں' بہت کام کے آدمی ہیں' مجھے آپ جیسے ہی تجربہ کار ساتھی کی تلاش تھی' آپ بلا کھٹکے میرا یہ نیا اخبار جوائن کیجئے، ضروری معاملات بعد میں طے ہو جائیں گے۔'' میں یہ آفر سن کر قدرے حیران ہوا اور کہا: ''دیکھئے، اتنی جلدی نہ کیجئے، آپ کا پرچہ نیا ہے' کوئی نئی تقرری کرنے کی بجائے پہلے اسے مستحکم بنائیے۔'' میں نے از راہِ خلوص اسے چند ایک اور تجاویز بھی دیں۔ اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلد ملاقات پر اصرار کیا۔ میں نے اخلاقاً حامی بھر لی۔

اس باپ چیت سے اتنا اندازہ ہوا کہ عبدالسّلام صحافت کے میدان میں نیا شہ سوار نہ تھا بل کہ خاصا تجربہ رکھتا تھا۔ چند دن بعد اس کی بتائی ہوئی جگہ پر میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ جگہ اس کا آفس تھا اور رہائش گاہ بھی۔ عبدالسلام بڑے تپاک سے ملا اور ہم بیٹھک میں بیٹھ گئے' پھر وہ اندر گھر میں چلا گیا اور چائے' بسکٹ' پکوڑوں سے سجی ٹرے اٹھا لایا۔

''یہ مکان حال ہی میں کرائے پر لیا ہے' دو سال پہلے میں نے شادی کی ہے' ایک اچھی فیملی میں رشتے کا پتہ چلا، تو سوچا' اب گھر بسا ہی لوں اور اس شادی نے میری زندگی کو زندگی بنا دیا ہے''۔ وہ مسکرایا۔ باتوں کے دوران سلام نے اپنی عمر بھی بتائی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ یقیناً چالیس / پینتالیس سال کا تھا۔ لیکن بقول خود، اس کی عمرِ عزیز صرف پچیس سال تھی یعنی پورے دس

سال کم۔'خیر مجھے کیا؟' میں نے سوچا۔اس کے پوچھنے پر میں نے اسے اپنے پچیس سالہ صحافتی کیریئر کی چیدہ چیدہ باتیں بتائیں اور یہ بھی کہ میں کن کن اخبارات وجرائد میں کام کر چکا ہوں۔

''صحافت میری پہلی چاہت ہے''۔میں مسکرایا اور وہ بھی۔

''بس تو پھر کل سے'نہیں' آج ہی سے بسم اللہ کیجئے' میرا غریبانہ سا پرچہ حاضر ہے''۔

میں نے اپنی چند ضروری مصروفیات کا بتا کر معذرت چاہی۔ویسے بھی جان نہ پہچان' بڑی خالہ سلام والا معاملہ تھا۔اتنے میں بیٹھک کے اندرونی دروازے پر دستک ہوئی' ساتھ ہی چوڑیاں بھی چھنکیں' سلام دروازے تک گیا اور کسی ینگ خاتون نے کہا:

''ان سے فون نمبر اور ہوم ایڈریس لے لیجئے۔''

'ہوسکتا ہے یہی پرچے کی چیف ایڈیٹر صاحبہ ہوں'۔میں نے سوچا۔میں نے ان کی فرمائش کی تعمیل کی اور جلد اگلی وزٹ کے وعدے کے ساتھ اٹھ آیا۔

تو یہ تھی عبدالسلام سے میری پہلی ملاقات' جانے کیوں میں اس سے متاثر نہ ہوا' اور اس کی جاب والی آفر بھی مجھے قبول نہ تھی۔

تین چار دن بعد سلام نے موبائل فون پر مجھے یاد کیا:''طارق صاحب' ایک مختصر کرم فرمائی (ملاقات) کے بعد آپ ہمیں بھول ہی گئے، اگلے ہفتے کا پرچہ پریس میں جاچکا ہے' جبکہ میں چاہتا تھا کہ نئے شمارے کے صفحہ تین پر لکھے ادارتی ناموں میں میں آپ کا نام بطور''اسسٹنٹ ایڈیٹر'' درج ہو''۔

''بہت شکریہ''بی پی کی وجہ سے طبیعت کچھ ناساز تھی اور دوسرے یہ کہ.....''

''میری مسز چیف ایڈیٹر ہی نہیں ایک اچھی ہومیوڈاکٹر بھی ہیں' آپ کہیں تو ان سے دوائی تجویز کروا کے لے آؤں؟''

''شکریہ' میں اپنی ایلوپیتھک دوا ہی مستقلاً لیتا ہوں' ویسے میں جلد کسی وقت آپ سے دفتر آ کر ملوں گا۔''اور اس کے ساتھ ہی ہمارے موبائل بند ہو گئے۔

قریباً ایک ہفتے بعد بہ بوقتِ شام میرے گھر کی بیل بجی' میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور یہ جان کر قدرے حیرت ہوئی کہ عبدالسلام ہاتھ میں چند اخباروں کا بنڈل لئے کھڑا تھا' ساتھ ہی اس کی سوزوکی کلٹس کار بھی موجود تھی۔میں نے اسے ریسیو کیا اور بیٹھک میں بٹھایا۔

''آپ نے بہت زحمت کی' میرا ایڈریس ملنے میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟''

''بالکل نہیں' آپ کی اسی کالونی میں میرے ایک دوسرا لی عزیز بھی رہتے ہیں' گو ان سے ملاقاتیں کم کم ہیں' تاہم یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔اور ہاں''فریش نیوز'' کے چند تازہ پرچے آپ کی نذر۔'' چائے کی پیالی پر اس کے ساتھ کچھ دیر گپ شپ رہی۔ باتوں باتوں میں اس نے کئی بار یہ جملہ دوہرایا:

''طارق صاحب، اس شادی کے بعد وائف کی برکت سے میری قسمت بالکل بدل گئی ہے' وہ بہت اچھی لائف پارٹنر ثابت ہوئی' اس کے آنے سے پہلے تو میں کچھ بھی نہیں تھا۔''

''بہت خوشی کی بات ہے۔''میں اس کی صاف گوئی سے متاثر تو ہوا' لیکن شاید اس ذاتی سی بات کی ضرورت نہ تھی۔پھر وہ

اٹھ کھڑا ہوا' کہنے لگا: ''میری پُرخلوص آفر پر غور کر کے آپ ایک مثبت فیصلے کے ساتھ جلد تشریف لائیے''۔ میں نے مروتاً ایک بار پھر ملاقات کا وعدہ کر لیا۔ لیکن یہ ملاقات جلد نہ ہوئی' میں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ عبدالسلام کی شخصیت کی اوپری تہہ کے نیچے میں نے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن کام یابی نہ ہوئی' ایک دو ملاقاتوں میں آپ کسی کو کتنا جان سکتے ہیں؟ سو' میں اپنے شائع شدہ کالموں اور مضامین کو ترتیب دینے کے کام میں مصروف ہو گیا اور پھر وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔

دو ہفتے گذر گئے.....عبدالسلام کا ''فریش نیوز'' کسی ہاکر کے ذریعے میرے گھر باقاعدہ پہنچتا رہا۔ پرچہ اچھے گیٹ اپ اور رنگینیوں کے ساتھ چھپ رہا تھا۔ ایک دو بار میرے ذہن میں یہ حیرانی بھرا سوال کلبلایا کہ آخر اے بی سی کے بغیر وہ پرچے پر اتنا خرچ کیوں کر رہا ہے؟ اتنا پیشہ اس کے پاس کہاں سے آ گیا؟ جب کہ اس کے بقول وہ اپنی شادی سے پہلے کچھ بھی نہ تھا۔ 'ممکن ہے اسے کوئی اچھا فنانسر مل گیا ہو'۔ تازہ پرچے کے فرنٹ پیج پر میں نے ایک اشتہار دیکھا: ''اسسٹنٹ ایڈیٹر کی فوری ضرورت' امیدوار کو اچھی تعلیمی قابلیت اور وسیع تجربے کا حامل ہونا چاہیے۔'' میں نے مسکرا کر اخبار رکھ دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

تین چار دن کے بعد میرے موبائل پر عبدالسلام کی کال آئی، علیک سلیک کے بعد اس نے کہا: ''آج شام کی چائے آپ میرے غریب خانے پر پیجئے۔'' میں نے کچھ پس وپیش ظاہر کی تو اس نے کہا:

''یہ دعوت میری طرف سے ہی نہیں' میری مسز کی جانب سے بھی ہے' وہ آپ کی ذاتی شرافت وقابلیت کی بہت معترف ہے' اور نہ آنے کا مطلب ہو گا اس کا دل توڑنا۔''

'اپنائیت کا یہ رنگ اتنی جلدی؟' میں نے چند سیکنڈ رک کر سوچا لیکن پھر 'ہاں' کر دی۔

مَیں اس روز کی ڈھلتی شام میں وقتِ مقررہ پر عبدالسلام کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ ہم کچھ دیر گپ شپ کرتے رہے' پھر اس نے ایک فائل میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں چھ سات درخواستیں رکھی تھیں۔ میں نے انھیں بہ غور دیکھا' کئی نام جانے پہچانے تھے۔ اسی اثنا میں پُرتکلف چائے میز پر آ گئی۔ چند سیکنڈ بعد سلام اٹھا اور بیٹھک کے اندرونی دروازے پر جا کر آواز لگائی: ''منیرہ' اندر آ جاؤ' طارق صاحب آئے بیٹھے ہیں' بھائی ہیں' ان سے کیا پردہ؟'' اور اسی وقت ہفت روزہ ''فریش نیوز'' کی چیف ایڈیٹر اندر آ گئی' ایک گھریلو وجود' بوٹا سا قد اور صبیح رنگ چہرے کا نصف حصہ گہرے سبز دوپٹے کے پلو سے ڈھانپا ہوا' میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے سرخ لبوں پر کہیں سے اُتر آئی۔ مسکراہٹ کسی کی بھی' کہیں بھی ہو' اردگرد کے ماحول میں چپکی اجنبیت کو ہٹا کر اپنائیت لے آتی ہے اور یوں تکلّف برطرف ہو جاتا ہے۔ میں بے تکلفی کے اس فوری اظہار پر حیران تھا۔ اور اسی وقت محترمہ کا متّرنم سلام اور میرا جواب' اس نے کہا۔ ''آپ بیٹھئے نا''۔ پھر ہم تینوں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ محترمہ نے مختصراً اپنا تعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ اس نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔

''یہ پکوڑے تو بہت لذیذ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ان ہی محترمہ کا کمال ہے' یہ کچن ماسٹر بھی ہیں' سارے مصالحے خود تیار کرتی ہیں' بازاری نہیں لیتیں''

''اور پرچے کی ترتیب وتدوین میں بھی آپ کا خوب ہاتھ بٹاتی ہوں گی؟'' میں نے پوچھا۔ ''نہیں' یہ شعبہ ان کے لئے نیا ہے لیکن ذہین ہیں' ہر نئی بات بہت جلد سمجھ اور سیکھ لیتی ہیں۔ چونکہ پہلے سے کوئی تحریری تجربہ نہیں ہے' اس لئے اداریہ یا مضامین نہیں لکھ سکتیں۔ میں پرچے کے دیگر اہم مسائل میں بہت الجھا رہتا ہوں۔ کمپوزنگ/پریس کے معاملات' ایجنٹوں/ایجنسی ہولڈروں سے

ملاقاتیں اور ضروری بات چیت۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ متعلقہ وزارت کے افسروں کے درباروں میں باقاعدہ حاضری تاکہ ہمارے پرچے کی ABC جلد ہو جائے اور اسے اشتہارات ملنے لگیں..... اسی لئے مجھے ایک اچھے اور سمجھ دار اسسٹنٹ ایڈیٹر کی فوری ضرورت ہے۔ پرچے کا ڈیکلریشن چونکہ منیرہ کے نام ہے' لہٰذا انھیں بھی میرے ساتھ دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔'' سلام نے کہا۔

''پھر کسی امیدوار کو منتخب کیا؟'' میں نے چائے کی پیالی ختم کر دی۔ ''میں نے سبھی امیدواروں کے انٹرویو لئے' قریباً سب کے سب ٹھیک ہیں' لیکن' لیکن.....'' اپنی بات میں ایک چھوٹا سا وقفہ ڈال کر وہ مجھے دیکھنے لگا۔

''کوئی جچا ہی نہیں' ہر امیدوار بہت کمرشل مائنڈڈ نکلا' منیرہ سے میری دو دن تک بحث چلتی رہی' اس نے بیک جنبشِ زبان سب کو ری جیکٹ کر دیا۔''

''جی' طارق بھائی' اب دیکھئے نا' کوئی صاحب بھی چالیس/پچاس ہزار مہینہ سے کم پر راضی نہیں' دیگر سہولتیں مثلاً پک اینڈ ڈراپ سروس اور سفری الاؤنس اس کے علاوہ' ان کی آنکھوں میں حرص ہی حرص تھا' خلوص نام کو بھی نہیں' پرچے کی بہتری کے لئے کسی کے پاس کوئی خاص تجویز نہ تھی' جبکہ پرچہ ابھی ابتدائی حالت میں ہے' سو ہم خاموش ہو گئے اور اب ان حضرات کے بار بار فون آ رہے ہیں۔'' منیرہ نے کہا۔ ''دیکھا جائے تو آج کل کے حساب سے ان کی ڈیمانڈ زیادہ نہیں' آپ بارگین کر کے سب سے بہتر آدمی کو رکھ لیجئے۔'' میرا جواب تھا۔ ''سب سے بہتر؟ ان کی اور میری نظر میں آپ سے بہتر کوئی نہیں۔ آپ نے پہلے ہی دن بغیر کسی لالچ کے مجھے فون پر کئی بہت اچھی تجاویز دی تھیں' میں نے ان سب پر عمل کیا اور فائدہ اٹھایا' اسی کو خلوص کہتے ہیں..... اب ہم دونوں چاہتے ہیں کہ آپ آ کر اسسٹنٹ ایڈیٹر کی کرسی سنبھال لیں۔'' سلام نے کہا۔

''میں تو پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں' ان دنوں میں اپنے ایک اہم ذاتی کام میں مصروف ہوں۔''

''نہیں۔ طارق بھائی' کچھ وقت ہمارے لئے بھی نکالیں' بہت نوازش ہو گی اور یہ بھی بتائیے کہ آپ کیا لیں گے؟'' میں خاموش رہا۔ ''طارق بھائی کچھ تو بولئے؟'' منیرہ نے کہا۔

''اوّل تو میں آ نہیں رہا اور اگر بالفرض آ ؤں بھی' تو ایک روپیہ بھی نہیں لوں گا کیوں کہ میں یہ بات بہ خوبی سمجھتا ہوں کہ ابتدائی دنوں میں پرچہ کن حالات سے گذر رہا ہوتا ہے اور آپ کے مجموعی حالات مجھے بہت زیادہ اچھے نہیں لگتے۔''

وہ دونوں ہکا بکا مجھے دیکھنے لگے۔ ''آفرین ہے بھائی' آپ کا یہ خلوص ہماری توقّع سے بڑھ کر ہے' تو پھر آپ ہمیں کون سا وقت دیں گے؟'' منیرہ نے کہا۔ ''میں آپ کی خاطر زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا ہوں کہ ہفتے میں ایک اداریہ یا ایک مضمون یا ایک کالم یعنی تینوں میں سے کوئی ایک چیز لکھ کر آپ کو بھجوا دوں' باقاعدہ ملازمت کی صورت ممکن نہیں..... ہاں' ویسے کبھی کبھی چائے پر ہلکی پھلکی گپ شپ کے لئے آ جایا کروں گا۔'' ان دونوں کے چہرے خوشی سے کھل گئے: ''ہمیں یہ بھی منظور ہے اور اس خوشی میں چائے کا ایک ایک کپ اور''

''جی نہیں' بہت شکریہ' اب گنجائش نہیں۔''

باہر شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی لیکن یکا یک قدرے تیز ہوا چلنے لگی' کھلی کھڑکی سے نظر آیا کہ آسمان پر سیاہ بادل جمع ہو رہے تھے' بارش متوقع تھی۔ ''باہر موسم خراب ہو رہا ہے اور اب میں چلتا ہوں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ عبدالسلام اور منیرہ بھی۔ اسی وقت ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس کے چہرے کا نصف پردہ ہٹا دیا'

اسے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا' منیرہ کی ایک آنکھ بالکل بند تھی یعنی وہ یک چشمی تھی۔

''آپ.....آپ.....کی ایک آنکھ؟ یہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں' میں یک چشمی ہوں' بس قسمت کی بات ہے' آپ ذرا بیٹھئے' میں مختصراً بتاتی ہوں۔'' ہم تینوں پھر بیٹھ گئے۔ منیرہ نے اپنے بچپن میں پیش آنے والے کسی حادثے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس حادثے میں اس کی ایک آنکھ چلی گئی' دوسری بھی قدرے زخمی ہوگئی تھی لیکن ڈاکٹروں نے اسے بچالیا۔ ''اوراب میں یہ چاہتی ہوں کہ کسی بھی طرح دوسری آنکھ کی گرافٹنگ ہوجائے اور میں پھر سے دوآنکھوں والی بن جاؤں۔'' اس کے چہرے پر حسرت کی لکیروں کا جال بن گیا اور اکلوتی آنکھ نم آلود ہوگئی۔ اس کے لئے میرے دل میں افسوس امڈ آیا۔ کسی اعلا چیز کے ملنے کے بعد اس کے چھن جانے کے غم کا اندازہ اسی کو ہوتا ہے جو اس ناگوار مرحلے سے گذرا ہو۔ میں اٹھ کر مین گیٹ کی طرف چلا تو منیرہ نے مجھے سے کہا: ''سلام تو ہر وقت اپنے پرچے کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں' آپ کو جب بھی کسی اچھے آئی سرجن یا اسپیشلسٹ کا پتہ چلے تو ازراہِ کرم ضرور بتایئے گا۔''

''جی!''

آنے والے دنوں میں میری تحریریں باقاعدگی کے ساتھ عبدالسلام کے پاس پہنچتی اور اس کے اخبار میں چھپتی رہیں۔ میں کسی نہ کسی ویک اینڈ پر اس کے آفس کم ریذیڈینس پر بھی چلا جاتا' کچھ دیر گپ شپ اور پرچے میں بہتری لانے کی باتیں ہوتیں۔ ایک دوبار وہ دونوں بھی میرے گھر آئے اور میری بیگم اور بچوں سے ملے لیکن کئی مہینوں پر پھیلی ان میل ملاقاتوں کو میں کبھی بھی قریبی دوستی کے رنگ میں نہ دیکھ سکا۔ ہاں' یہ دو ہم پیشہ افراد کی قربت ضرور تھی۔ ایک بار کافی دنوں تک مجھے ''فریش نیوز'' نہیں ملا اور جب میں عبدالسلام سے ملنے اس کے گھر پہنچا تو وہ اکیلا بیٹھا تھا' چہرہ لٹکا ہوا' شیو بڑھی ہوئی اور افسوس اور دکھ کے رنگ اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے۔

''کیوں' خیرت تو ہے؟'' ''بس طارق صاحب' آج کل گھریلو حالات میں خاصا تکدر بھر گیا ہے اور اس میں میرے سسرالیوں کا ہاتھ ہے۔''

''کیوں؟'' ''وہ نہیں چاہتے کہ میں یہ ہفت روزہ چلاؤں۔''

''اس کی وجہ؟'' ''وہ کہتے ہیں کہ میں پرچے پر پیسہ بری طرح ضائع کر رہا ہوں جبکہ حاصل وصول کچھ بھی نہیں۔''

''انھیں آپ کے پرچے سے مطلب؟''

''دراصل سارا پیسہ میری وائف کا ہے' میکے والوں نے اسے بہکا دیا ہے اور وہ کئی دنوں سے اپنی ماں کے پاس ہے'' اس کی وائف کے پیسے کی بات سن کر میں خاصا حیران ہوا تاہم میرے ذہن کی ایک گرہ کھل گئی اور چند سیکنڈ غور کے بعد اسے کہا:

''پس منظر میں کوئی لمبی کہانی لگتی ہے' کچھ تفصیل بتانا پسند کریں تو شائد مسئلے کا کوئی حل نکلے''۔

''قریباً دوسال قبل یہیں سیٹلائٹ ٹاؤن میں ایک صاحب نے مجھ سے اس رشتے کی بات کی بل کہ انھوں نے خود مجھے منیرہ کے گھر والوں سے ملایا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو ایک ضروری بات بتادیں اور وہ یہ کہ لڑکی ایک آنکھ سے محروم ہے' ویسے وہ پڑھی لکھی اور بہت سگھڑ ہے۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور کہا کہ لڑکی سامنے ہو تو کچھ فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ کے گھر والے؟ میں نے بتایا کہ بڑے بھائی ہیں' لاہور میں ایک انشورنس کمپنی کے جی ایم' فوراً نہیں آسکیں گے۔ کچھ تردد کے بعد منیرہ میرے سامنے تھی۔

میں نے اسے دیکھا اور خاموش رہا۔لڑکی کی ماں نے ایک پتہ پھینکا۔ کہنے لگی کہ منیرہ کے والد مرنے سے پہلے بینک میں اس کے نام کافی پیسہ چھوڑ گئے تھے۔ تمھیں وہ پیسہ نقد مل سکتا ہے تاکہ تم چھوٹی موٹی نوکری چھوڑ کر کوئی معقول کاروبار کر سکو' لیکن تمھیں ہمارے گھر ہی رہنا ہوگا۔اس بات سے مجھے یہ لگا کہ شائد تنہا ہونے کے باعث میں ان لوگوں کو پسند آ گیا ہوں' میں نے تین چار روز کی مہلت مانگی تو کہا گیا کہ ہمیں کل تک ''ہاں یا نہ'' میں جواب چاہیے کیوں کہ رشتے اور بھی آئے ہوئے ہیں۔''

''تو پھر آپ نے بھائی سے مشورہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔''نہیں' کیونکہ وہ اپنی گھر والی کے کنٹرول میں ہیں اور بھابھی کو میرے نام سے بھی چڑ ہے۔ بہرحال میں نے اگلے روز رشتے کے لئے ہاں کر دی اور یوں اسی شام ہماری شادی ہوگئی' یعنی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔''

''خاصی عجیب سی کہانی ہے' کوئی شرائط جو لکھی گئی ہوں؟''

''کوئی خاص نہیں' سوائے اس کے کہ میں منیرہ کی رقم کا صحیح اور شفاف طریقے سے استعمال کروں گا۔ میں صحافت کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا' سو' میں نے منیرہ کے نام سے ڈیکلریشن لے کر یہ پرچہ نکال لیا جو کہ ظاہر ہے کہ ابھی ابتدائی حالات میں ہے گو مختلف حلقوں کی جانب سے رسپانس اچھا ہے۔ پھر میں نے بوجوہ سسرال کا گھر چھوڑ دیا اور اب یہاں رہتا ہوں..... وائف کو سسرال والوں نے بہکا دیا ہے' وہ مزید پیسہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ ادھر دو سال ہونے کو آئے ہیں کوئی بچہ نہیں ہوا' ہم دونوں کے مختلف ٹیسٹوں کے بعد پتہ چلا کہ بچپن کے کسی حادثے کی بنا پر منیرہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی اور یہ میرے لئے ایک بہت ہی تکلیف دہ بات ہے۔''

''کوئی صلح کی صورت؟'' میں نے پوچھا۔''صلح؟ مجھے تو آج کل سسرالیوں کی طرف سے دھمکیاں مل رہی ہیں کہ یا تو ڈوبا ہوا پیسہ جلد واپس کر دو' ورنہ نتائج کے لئے تیار رہو۔''

''اور آپ کو پیسہ کتنا ملا تھا؟'' ''کوئی پندرہ لاکھ' اس میں سے چار لاکھ کی کلٹس گاڑی لی اور کچھ ضروری فرنیچر اور کراکری بھی' باقی مکان کے کرائے اور پرچے کی اشاعت پر لگ گیا۔ ابھی قریباً اتنا ہی پیسہ منیرہ کے اکاؤنٹ میں موجود ہے جس پر اس کے چند قریبی عزیزوں کی نظر ہے۔''

''بہتر یہی ہے کہ آپ کسی بھی طرح اپنی بیوی کو منا کر گھر لے آئیں اور ماسوائے ساس کے' باقی سسرالیوں کی اپنے گھر آمد و رفت پر پابندی لگا دیں'' میں سلام کو یہ مشورہ دے کر اپنے گھر چلا گیا۔

عبدالسلام نے میری بات پر عمل کیا۔منیرہ گھر آ گئی۔ مجھے بھی یک گونہ اطمینان ہوا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ان کا گھر بربادی سے بچ جائے۔ پرچہ دوبارہ چھپنا شروع ہوگیا۔منیرہ نے مجھے پھر تحریری سلسلہ شروع کرنے کا کہا اور میں نے تعمیل کی۔لیکن قریباً دو ہفتے بعد مجھے اچانک ایک نیا ڈرامہ سننے کو ملا۔منیرہ نے مجھے روتے ہوئے فون پر بتایا:

''طارق بھائی' سلام تین چار دن سے غائب ہے، کہاں چلا گیا' کچھ پتا نہیں، آپ اس کے اخباری دوستوں سے معلوم کیجئے' اور مجھے بتائیے۔'' میں یہ خبر سن کر سناٹے میں آ گیا اور بہ عجلت مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی' کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ خدا جانے اچانک اسے کیا ہوا اور وہ کہاں اور کیسے غائب ہوا۔فون پر منیرہ کی دوبارہ کال آئی۔''میں آپ کو بھائی کہتی ہی نہیں ہوں' سمجھتی بھی ہوں' میں بہت پریشان ہوں' آپ ابھی وقت نکال کر میرے گھر تشریف لائیے۔'' آواز لرزاں لرزاں اور پریشان۔

میں نے گھڑی دیکھی' صبح کے گیارہ بجے تھے۔ میں جب اپنی کھٹارا گاڑی میں منیرہ کے گھر پہنچا تو وہ اجاڑ صورت لئے مجھے

ملی' اس کی اکلوتی آنکھ سرخ اور آنسوؤں سے لبریز' وہ اپنے دوپٹے اور لباس سے بھی بالکل بے پرواتھی۔ میں نے اسے سب سے پہلے یہ کہا:

''منیرہ' تم ایک سلجھی ہوئی لڑکی ہو' فوری طور پر رونا دھونا بند کرو' رونا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اور ہاں' میں نے یہاں آنے سے قبل مختلف قریبی اخبارات کے دفاتر میں ایڈیٹر ''فریش نیوز'' کی پُراسرار گم شدگی کی خبر دے دی ہے' یقیناً جلد ہی کوئی بہتر اطلاع ملے گی' تم حوصلے اور ہمت سے کام لو۔'' ''نہیں بھائی صاحب' میں پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ سلام مجھ سے بالکل بے گانہ ہو چکا ہے۔ اسے اچانک کسی نے غائب یا اغوا نہیں کیا' وہ خود بھاگا ہے' مجھ سے بھاگا ہے اور اس کی وجہ میں خوب سمجھتی ہوں۔''

''نہیں' سلام ایسا آدمی نہیں لگتا.....'' میں نے بے یقینی ظاہر کی۔ ''طارق بھائی' میں آپ کو بتاتی ہوں' کئی دن پہلے سلام نے فرح نامی ایک عورت کا ذکر کرتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ وہ اس کے ایک دوست کی بیوہ ہے' دوست ایک حالیہ حادثے میں ختم ہو گیا تھا' ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا' اسی لئے فرح آج کل بہت اپ سیٹ اور بے یار و مددگار ہے' اس کے سارے عزیز یہاں سے سینکڑوں میل دور گلگت کے کسی پہاڑی گاؤں میں ہیں' اسے فوری طور پر مدد چاہئے' کوئی مضبوط سہارا چاہئے.....اور اب جب میں نے بہ غور اس کی اس بات پر سوچا تو مجھے شک نہیں' یقین ہو گیا کہ سلام اسی کے پاس ہے اور اس کی دل جوئی میں لگا ہے' اس کے موبائل کا سلسلہ بھی بند ہے۔''

''تمہاری سوچ غلط بھی ہو سکتی ہے' وہ تمہارا بہت معترف ہے' اٹھتے بیٹھتے تمہاری تعریف کرتے نہیں تھکتا۔''

''ہونہہ' میری تعریف؟ وہ سب اس کا سوچا سمجھا ڈرامہ ہے' آپ ایسے جہاں دیدہ آدمی نے اس کا یقین کیسے کر لیا؟''

''ڈرامہ؟ میں نہیں مانتا۔''

''طارق بھائی' میں یک چشم ہوں' لیکن میں بحیثیت بیوی مزید دو بہت تیز آنکھیں بھی رکھتی ہوں۔ میری یہی دو آنکھیں شوہر کو گھر میں اور گھر سے باہر بہ خوبی دیکھ اور سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ سلام اسی فرح کے ساتھ گل چھرے اڑا رہا ہو گا' میں یہ بھی جانتی ہوں کہ فرح ایک بہت مالدار بیوہ ہے اور مال والی جگہ پر سلام شہد کی مکھی بن کر پہنچتا ہے۔''

منیرہ کی ''تین آنکھوں'' والی بات نے میری آنکھیں کھول دیں' اس نے کیا غضب کی بات کی تھی' میں چند سیکنڈ تک گنگ بیٹھا رہا' حیرانی کے گہرے سائے تلے۔ منیرہ نے اپنی بات جاری رکھی: ''بھائی' آپ یقین کیجئے' سلام بنیادی طور پر ایک لالچی شخص ہے۔ شادی سے پہلے جانے کس طرح اسے میری مالی حیثیت کا علم ہو گیا تھا' سو میرا رشتہ حاصل کرنے کے لئے اس نے جان لڑا دی' میری بیوہ ماں کے قدموں میں جھک کر اس نے کہا تھا کہ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں بل کہ مجھے گھر داماد منظور ہے' میں منیرہ کا بہت خیال رکھوں گا' اسے کوئی مالی نقصان نہیں ہونے دوں گا' بس شروع میں تھوڑی سرمایہ کاری کرنی پڑے گی' اخبار چل پڑے گا اور اس کے بعد فائدہ ہی فائدہ.....خاک فائدہ ہوا' وہ اب تک میرے لاکھوں روپے ہڑپ کر چکا ہے' کبھی کبھی بناوٹی تعریفیں بھی کرتا رہا لیکن پچھلے دنوں اس نے بچہ نہ ہونے کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ میں نے بہن کا بچہ گود لینے کی بات کی تو بھڑک اٹھا' کہنے لگا کہ مجھے اپنا اصلی بچہ چاہیے.....اب فرح اسے مل گئی ہے اور یقیناً کوئی لمبی کھچڑی پک رہی ہے' میں یہ بات اپنی ''تین'' کھلی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی ہوں۔''

منیرہ کی اس بات نے میری حیرت بڑھا دی۔ ''بہت ممکن ہے کہ دال میں کچھ کالا ہو۔'' میں نے سوچا اور اسے کہا: ''بحیثیت بھائی' تمہارے لئے میرا ایک مشورہ ہے' خود کو سنبھال کر ماں کے پاس چلی جاؤ' وہ محفوظ جگہ ہے' یہاں تمہارا تنہا رہنا ٹھیک نہیں۔'' ''ہرگز

نہیں' میں نے ابھی تک ماں کو بتایا بھی نہیں ہے' وہ بی پی کی مریضہ ہیں' لینے کے دینے پڑ جائیں گے' میں یہیں رہ کر اس کا انتظار کروں گی' میدان خالی نہیں چھوڑوں گی اور دیکھوں گی کہ وہ کب تک نہیں آتا.....اور بھائی' آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اخباروں میں اس کی گمشدگی کی خبر دے دی ہے۔'' مجھے منیرہ کے لہجے میں سچائی کی جھلک نظر آ رہی تھی لیکن سلام جب تک نہ ملے' کہانی کے دوسرے رخ کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ بہرحال میں نے منیرہ سے اجازت لی اور کچھ وقت گذارنے پریس کلب چلا گیا' وہیں صحافی سلام کی گم شدگی پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

اگلے روز اہم اخبارات میں سلام کی گم شدگی کی خبر کافی نمایاں طور پر شائع ہوگئی' مقامی اخباری دنیا میں ہل چل سی پیدا ہوئی اور یہ بھی پتہ چلا کہ مختلف متعلقہ محکموں نے بھی اس خبر کا نوٹس لیا تھا۔ ادھر منیرہ کے میکے والے گھبرائے ہوئے اس کے گھر پہنچے' اس نے سب کو تسلی دی۔ ہر کوئی اس اچانک بپتا پر حیران و پریشان تھا۔ میں بھی منیرہ سے ٹیلی فونک رابطے میں تھا اور مستعدی سے سلام کی سن گن لینے میں لگا رہا لیکن کچھ بھی پتہ نہ چلا' جانے اس جیتے جاگتے' ہٹے کٹے اور ساڑھے پانچ فٹے آدمی کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ بہرحال اس کی وائف' سسرالی عزیز اور خود میں بھی کسی معجزے کا انتظار کرنے لگے۔

آخر ''معجزہ'' یوں ہوا کہ آٹھ دس روز کے بعد سلام اچانک اپنے گھر پہنچ گیا۔ وہاں تالا دیکھ کر اس نے اپنے کسی دوست کے ہاں ''پناہ'' لے لی۔ اس نے موبائل پر پہلے منیرہ سے اور پھر مجھ سے بھی رابطہ کیا۔ میں بہ عجلت گھر سے نکلا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر سیٹلائٹ ٹاؤن میں اس کی خوش دامن کے گھر جا پہنچا۔ وہ بھی وہیں آ گیا' مجھ سے گلے ملا' میں نے دلی دکھ کا اظہار کیا۔ میرے استفسار پر اس نے اپنے چند سسرالیوں کا نام لے کر کہا: ''انھوں نے کرائے کے غنڈوں کے ذریعے مجھے اغوا کروا کر شہر سے باہر کسی نامعلوم جگہ ایک سنسان گھر میں بند کر دیا تھا' میری مسلسل دھنائی ہوتی رہی' کھانے کو چائے اور پانی کے سوا کچھ نہ ملا۔ غنڈوں کا مطالبہ تھا کہ میں منیرہ کے تمام پیسے واپس کروں اور اسے فوری طلاق بھی دوں۔'' اس کا لہجہ خاصا دردناک تھا لیکن میں نظروں میں جائزہ لیتے ہوئے اس کے چہرے' بازوؤں' ہاتھوں وغیرہ پر چوٹوں کے نشان ڈھونڈتا رہا' سب کچھ صحیح سالم' کپڑے بھی درست حالت میں نظر آئے۔ منیرہ اور اس کی ماں نے سلام کے الزام کو یکسر غلط قرار دیا۔ میں نے اسے بتایا:

''کافی تلاش کے بعد آپ کی گم شدگی کی خبر مقامی اخبارات میں چھپ گئی تھی' متعلقہ محکمے بروقت نوٹس لے چکے ہیں' اب آپ کو ایک پریس کانفرنس کے ذریعے تمام تفصیلات منظرِ عام پر لانی چاہئیں۔''

میری بات سن کر وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا:

''میں لمبے پھڈوں میں نہیں پڑوں گا' دوسرے میں ابھی ذہنی طور فٹ نہیں ہوں' آخر سسرالیوں کی قید سے نکلا ہوں۔''

تھوڑی دیر میں سلام کے دیگر سسرالی عزیز آنے شروع ہوگئے۔ میرا ٹھہرنا ضروری نہیں تھا' اجازت لے کر گھر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے منیرہ نے موبائل پر بتایا: ''آپ کے چلے جانے کے بعد سلام بھی بکتا جھکتا اپنے دوست کے گھر چلا گیا۔ میرے سارے عزیز اس کے رویے پر حیران تھے۔''

سلام کا عجیب سا روّیہ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ منیرہ کے شکوک کچھ ایسے غلط بھی نہیں تاہم میں نے ایک بروقت اور ضروری فیصلہ بھی کیا اور وہ یہ کہ آئندہ سلام اور اس کے گھریلو مسائل سے میرا دور رہنا ہی بہتر ہے۔

کافی دنوں سے میرا ایک ہم پیشہ ریٹائرڈ دوست، ایس۔ایم عالم ٹی بی میں مبتلا ہو کر مری کے معروف سامل سینی ٹوریم میں پڑا تھا، سگریٹ اُسے پی گئی تھی۔ کئی پیغامات بھیج کر اس نے مجھے ملاقات کیلئے بُلوایا۔ آخر ایک صبح میں نے اپنی پرانی مگر تابعدار سوزوکی ایف ایکس گاڑی نکالی، اس کی ہمّت بندھائی اور سب سے چھوٹے بیٹے کو ساتھ لے کر سامل / مری روانہ ہو گیا۔ شاداب پہاڑی نظاروں کے مزے لیتا، بیٹے سے باتیں کرتا، میں آرام آرام سے چلتا گیا۔

سامل سے ذرا پہلے مشہور پہاڑی چشمے ''چھرا پانی'' کا سٹاپ آیا، وہیں ایک چھوٹا سا بازار اور چند ریستوران بھی ہیں۔ مَیں نے سٹاپ پر اپنی گاڑی روکی اور صفائی دھلائی کیلئے وہاں موجود کارندوں کے حوالے کر دی۔ میری گاڑی کے ساتھ ایک ہلکے سبز رنگ کی کلٹس بھی دھلائی کے مرحلے سے گذر رہی تھی، یہ گاڑی مجھے کچھ دیکھی بھالی سی لگی۔ میں مَیں وہاں رُکا نہیں اور اپنے لڑکے کے ساتھ سامنے والے ریستوران میں جا بیٹھا۔ لنچ ٹائم ہو چکا تھا۔ مَیں کھانے کا آرڈر دے کر ایک اخبار پڑھنے لگا۔

اِسی اثناء میں چھرا پانی سٹاپ سے ایک لڑکا گاڑی کی چابی لئے اندر آیا اور ایک فیملی کیبن پر دستک دے کر چابی اندر بڑھا دی۔ کیبن میں کوئی جوڑا بیٹھا، ہلکی ہلکی، ٹھنڈی میٹھی گفتگو میں مصروف تھا۔ میں اس طرف کوئی دھیان دیئے بغیر بیٹے سے باتیں کرتا اور اخبار دیکھتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بیرے نے میرے سامنے میز پر کھانا لگا دیا۔ اُسی وقت فیملی کیبن کا پردہ ہلا اور اندر سے ایک نیا نویلا جوڑا باہر آیا، اُسے دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سلام میرے سامنے تھا، سوٹڈ بوٹڈ، کھلا کھلا چہرہ اور اس کے ساتھ دلہن کا سا انداز لئے ایک تازہ دم چہرے والی جوان لڑکی بھی تھی۔

سلام مجھے اچانک سامنے دیکھ کر جھینپ گیا۔ اُس لڑکی سے ایک دو قدم پیچھے رُکا، اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر، خاص ملتجی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی، مطلب تھا کہ میں خاموش رہوں اور اس سے کوئی سوال نہ کروں۔ وہ دونوں قدم بڑھا کر میری میز تک آئے۔ میں نے اُٹھ کر سلام سے علیک سلیک کی اور لنچ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ سلام نے ''شکریہ'' ادا کر کے لڑکی سے میرا تعارف کرایا:

''طارق صاحب، میرے دوست، پنڈی کے ایک بہت اچھے اور پرانے جرنلسٹ ہیں، غالباً یہ بھی سیر کے ارادے سے مری جا رہے ہیں۔''

''جی نہیں، میں سامل سینی ٹوریم، ایک بیمار دوست کو دیکھنے جاؤں گا۔ اور آپ کی تعریف؟'' میں نے اُس لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ مس فرح ہیں، انھیں بھی صحافت کا بہت شوق ہے، میرے اخبار کو فنانس کرنا چاہتی ہے۔'' اُس کی آنکھوں میں ایک فاتحانہ سی چمک تھی۔

''خوشی ہوئی کہ انھیں بھی صحافت کا شوق ہے۔'' میں مسکرایا اور اس کے ساتھ ہی مجھے منیرہ کی وہی ''تین آنکھوں'' والی بات یاد آئی اور مجھے لگا کہ سلام کے پیچھے وہ بھی موجود ہے اور کہہ رہی ہے ''کیوں بھائی صاحب، میں نے ٹھیک ہی کہا تھا نا؟''

میں اس یک چشم لڑکی کی ''دُوررس'' بصارت کا قائل ہو گیا۔

◆◆◆

'خدا' سب یاد رکھتا ہے

آصفہ نشاط (کیلی فورنیا)

ان دنوں ہمارے گاؤں میں خوبصورت عورت کی یہ پہچان ہوا کرتی تھی، اونچی لمبی چوڑی چکلی موٹی تازی اور سرخ وسفید۔ میرے اندر یہ سب خوبیاں تھیں مگر بڑی بڑی آنکھوں اور محراب دار بھنوؤں نے مجھے سب سے زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ میرے مسکراتے چہرے کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ بس غم تھا تو اس بات کا کہ پندرہ سال کی عمر میں تیسری کلاس میں پڑھتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں جب سکول تھا ہی نہیں۔ صوابی سے ہریانہ جاتے ہوئے ہمارا گاؤں ''گلیاڑہ'' پڑتا ہے۔ اس گاؤں میں پیدا ہونے والوں کے مقدر کا اہم ترین حصہ یہاں کا ''جرگہ'' ہوتا ہے، جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خدا کے احکامات کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں، وہ کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، ماننے والے ان کو کچھ ایسا ہی مانتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی سارے گاؤں والوں کی طرح یہ بات گھسی ہوئی ہے کہ ہم کو اپنے ہر فیصلے میں ''جرگے'' کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ میرا بابا بھی ایسا ہی کرتا تھا اور میری ماں بھی۔ ماں، بابا کی بیٹی نظر آتی تھی، جس کی وہ بیوی ہے اور میری وہ بڑی بہن نظر آتی تھی جب کہ وہ میری ماں ہے۔ ماں کا مسئلہ ہے ہم تین بہنیں، میں سب سے بڑی دو مجھ سے چھوٹی۔ ہوش سنبھالتے ہی میں ماں کی فکر میں شریک ہوگئی، کیونکہ تایا کے پانچ بچوں میں دو بیٹے بھی تھے، عین ممکن تھا کہ ہم تین بہنوں میں سے دو کی شادیاں انہی کے بیٹوں سے کر دی جاتیں، بابا کو ویسے بھی جرگے والوں کی دعوتیں کرنے کے علاوہ اور کیا آتا تھا، سوائے اس تاش کے جو کبھی کبھار پیسے لگا کر کھیلا جاتا تھا، میری ماں بہت بھاری بھرکم برات کے ساتھ ایک بڑے سے گھر میں بیاہ کر تو ضرور آئی مگر اسے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ ہر چیز پر تو تایا کا کنٹرول ہے۔ اور اس گھر میں ہماری شادی ہونے کا مطلب ہے کہ ماں کا اپنی اولاد پر بھی کوئی اختیار نہ رہتا۔ ہمارے گاؤں میں عورتوں کا مشورہ دینا ان کے حق میں عذاب ہی ثابت ہوتا تھا، ماں نے اپنی الجھنوں کا یہ حل نکالا تھا کہ انتہائی خوشامد سے کام لے کر مجھے سکول میں داخل کروا دیا، ماں کو یقین تھا کہ ان کی بیٹی پڑھ لکھ گئی تو یہ بات ان کے کام آئے گی۔ وہ میرے تایا کی معمولی سی بات، تائی کی ہر حرکت، اور تایا کے بچوں کی ہر بات مجھے جتا جتا کر دکھاتیں، اور آخر میں یہ جملہ ضرور کہتیں ''اگر ہم ان کے غلام بن کر نہ رہے تو یہ لوگ تو ہمیں بھیک بھی نہیں دیں گے تم دعا کرو کہ خدا تمہیں ایک بھائی دے دے، پھر گھر بار اور زمینوں میں ہمارا بھی حصہ ہوگا''۔ ماں یہ سب اتنے دکھ بھرے انداز میں کہتی تھیں کہ میں بھی دل وجان سے ایک عدد بھائی کی دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ اس طرح ماں اگر تایا کے گھر رشتہ کرنے پر مجبور ہوتیں تو انہیں وہاں سے رشتہ کرنے کا اختیار بھی مل جاتا۔ بیٹا ہو جائے اور میں دس جماعت پاس کر لوں۔ بس ماں کے یہی دو وظیفے تھے۔ اگرچہ بابا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں پورا پورا دن سکول میں کیوں برباد کرتی ہوں۔

گاؤں میں جیسا ہمارا گھر تھا ویسے اور بھی بہت سارے گھر تھے اور ہم کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کے رشتے دار بھی تھے۔ سب

کے گھر اچھے خاصے بڑے تھے، تھوڑی بہت زمین اور گائے، بھینس بھی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہماری اس بستی میں نہ تو کوئی بہت غریب تھا اور نہ ہی بہت امیر نہ ہی کوئی ظالم تھا نہ ہی مظلوم، لڑکے پڑھتے تھے اور نوکریوں کے لئے باہر بھی جاتے تھے، لڑکیاں تھوڑا بہت لکھ پڑھ کر گھر کے کام کاج میں اپنی اپنی ماؤں کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور میری ماں کی عقل کا ماتم کرتی تھیں کہ دیکھو! کتنی بے وقوف ہے، جوان لڑکی کو پورے دن کے لئے باہر بھیج دیتی ہے کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو!! یہ میں بھی جانتی تھی مگر میری بے چاری ماں تائی کی غلامی کے خوف سے یا بے گھر ہونے کے خوف سے یا بیٹا نہ ہونے کے خوف یا بابا کی ڈھلی ہوئی عمر کے خوف سے اتنی پریشان تھی کہ اس نے بہر حال مجھے استانی بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہمارے گاؤں کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ اگر کوئی بات جرگے تک پہنچ جائے تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ایک چیز ٹی وی بھی تھی، جس سے ہمیں پتہ چلتا رہتا تھا کہ اس گاؤں کے علاوہ بھی دنیا ہے جس کے طور طریقے ہمارے گاؤں والوں کی طرح نہیں ہیں مگر ماں کہتی تھیں کہ یہ عورتیں اچھی نہیں ہوتیں اور ان کی بخشش نہیں ہوگی۔ تو یہ سن کر مجھے بہت ڈر لگتا تھا مگر پھر بھی میں عمر کے اس دور میں داخل ہوچکی تھی جہاں ڈرامے بہت اچھے لگتے تھے۔ بابا کا حکم تھا کہ ٹی۔ وی صرف خبروں کے لئے کھولا جائے، مگر بابا کونسا ہر وقت گھر میں ہوتا تھا۔ اور اگر بابا گھر میں ہو بھی تو اسے صرف چند ہی موضوعات پر بات کرنا ہوتی تھی، گھر کے چھوٹے بڑے مسئلے ماں ہی طے کرتی تھیں۔

ہمارے گاؤں میں تھوڑی بہت رونق اس دن ضرور ہوجاتی تھی جب کہیں آنا جانا ہوتا تھا۔ گاؤں کی زیادہ تر عورتیں میکے جایا کرتی تھیں مگر چونکہ میرے نانا، نانی کا انتقال ہو چکا تھا، اس لیے میری بے چاری ماں کہیں بھی نہیں جاسکتی تھی۔ البتہ شادی بیاہ میں وہ بڑے شوق سے شریک ہوتی تھی اور زیور کپڑے پہن کر بہت خوبصورت بھی نظر آتی تھی۔ ماں خود تو خوب تیار ہوکر شادی بیاہ میں جاتی تھی لیکن وہ ساتھ ساتھ شادی کی برائیاں بھی کرتی رہتی تھی اور کہتی تھی کہ پتہ نہیں اس غمناک چیز کا نام کس نے شادی رکھا ہے۔ خاص طور پر جب کسی لڑکی کی رخصتی ہوتی تھی تو نہ جانے کیوں ماں بھی رونے لگتی تھی۔ حالانکہ وہ لڑکی رخصت ہوکر صرف دو محلے دور کسی اپنے ہی تایا چاچا کے گھر جارہی ہوتی تھی۔ چونکہ ماں مجھے شادی جیسے کام سے دور رکھنا چاہتی تھی اس لیے میرے سامنے تو شادی کو برا ہی کہتی تھی۔ البتہ جب ہمارے سکول میں والدین کا دن آیا تو ماں کی صورت دیکھنے والی تھی۔ وہ دس بار کہہ چکی تھیں کہ جمعرات کو سکول بھی تو جانا ہے، کپڑے خاص طور پر استری کیے تھے۔ میرے لیے نئے جوتے لیے تھے۔ ہمارے سکول میں جب نتیجہ سنایا جاتا تھا تو والدین کو اگلے دن بلایا جاتا تھا، جس میں چھوٹے موٹے کھیل، مقابلے اور انعامات وغیرہ ملتے تھے اور اس کے بعد سکول پندرہ دن کے لیے بند ہوجاتا تھا۔ ان پندرہ دنوں میں کتابیں کاپیاں خریدی جاتی تھیں۔ یونیفارم کا بندوبست ہوتا تھا اور اسی طرح کے اور کام ہوتے تھے۔ ماں میرے لیے ہر چیز شہر کے بازار سے منگوانے والی تھی کیونکہ اب تو میں چوتھی جماعت میں ہوجاتی۔ اماں انگلیوں پر دن گن رہی تھی کیونکہ چوتھی پاس کرنے کے بعد میں محض 6 سال بعد میٹرک پاس ہوجاتی اور آگے نہ بھی پڑھتی تو گاؤں کے سکول میں شرطیہ استانی تو لگ ہی جاتی اور ماں کا خواب پورا ہوجاتا۔ مجھے پڑھنا بھی اچھا لگتا تھا اور یہ خیال بھی بہت پسند تھا کہ جب میں استانی لگ جاؤں گی تو مجھے تنخواہ ملا کرے گی۔ پھر میں جمیلہ آپا جی کی طرح جوڑے کے رنگ سے ملتی جلتی چوڑیاں، بُندے، کِلپ اور سینڈل پہنا کروں گی۔ جب سے گاؤں میں ٹی وی آیا تھا، مجھے بھی بہت سی نئی نئی باتیں سننے کو ملتی تھیں مگر بابا کی گھورتی ہوئی آنکھیں میرا منہ بند کردیتی تھیں۔ پھر بھی میں نے طے کرلیا تھا کہ جب میں استانی لگ جاؤں گی تو اپنے لیے ایک ٹانگہ لگوالوں گی اور کیچڑ میں چلنے سے بچ جاؤں گی۔ ویسے تو ہر بچے کی طرح مجھے بھی نیا جوڑا چھوٹی اور بڑی عید کو ملتا تھا مگر ماں نے مجھے ایک گہرے سبز رنگ کی کاٹن کا نیا جوڑا اور بھی دلوادیا تھا اس پر باریک باریک سفید گوٹا لگایا تھا اور چاندی کی بالیاں بھی لے کر دی تھیں، یہ جوڑا

مجھے صبیحہ کی شادی میں پہننا تھا، جو اگلے مہینے ہونے والی تھی۔ ماں کہتی تھی کہ صبیحہ بہت بدقسمت ہے لیکن آپ صبیحہ سے ملیں تو اس کی ہنسی نہیں رکتی موتیوں جیسے دانت چمکتے ہی رہتے ہیں اور چلتی تو ایسے جھوم جھوم کے ہے، جیسے ساری دنیا کی بادشاہت مل گئی ہو، میں نے سوچ لیا تھا کہ صبیحہ کی خوشی کا راز معلوم کر کے رہوں گی، ممکن ہے اس کی خوشی کا راز یہ ہو کہ اس کا میکہ اور سسرال مشکل سے دس منٹ کے فاصلے پر ہیں پھر قیوم اس کی پھوپھی کا بیٹا بھی ہے یا پھر صبیحہ کو صبح اٹھنے پر غصہ آتا ہو اور وہ سکول جانا پسند ہی نہ کرتی ہو، کیونکہ پانچویں جماعت سے انگریزی بھی سیکھنا پڑے گی اور یہ ایک بہت مشکل کام تھا، میں تصور ہی تصور میں مسکرایا کرتی تھی۔ آخر کو استانی مجھے ہی بننا تھا، باقی لڑکیوں کو تو شادی کر کے بچے پیدا کرنا اور پالنا تھے، روتے بسورتے، پٹتے پٹاتے اور کیچڑ میں لت پت۔ انہی ماؤں کا چھوٹا موٹا کام کرنے کے علاوہ یہ بچے گلیوں میں لڑ بھڑ کر بڑے ہو جاتے اور ان میں سے چند ایک شہر کے کالج میں پڑھا کرتے۔ اور کئی تو وکیل وغیرہ بھی بن گئے تھے۔ ان کی البتہ بہت عزت ہوتی تھی کیونکہ ہمارے گاؤں میں زمینوں وغیرہ پر بہت جھگڑے اور مقدمے ہوتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں صرف دو لڑکے ڈاکٹری بھی پڑھ چکے تھے اور کسی بڑے شہر میں رہتے تھے۔ جمعے کے دن کا انتظار تھا جب مجھے صبیحہ کی شادی میں جانا تھا جمعرات کو سکول میں یومِ والدین تھا جس میں میری ماں نے بھی جانا اور میں نے بھی نئے بوٹ پہن کر جانا تھا۔ سکول میں بہت اچھی اچھی چیزیں کھانے کو ملیں، استانیوں سے میری ماں بات چیت کر کے بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ جب پروگرام ختم ہوا تو سب بچوں میں مالٹے اور غبارے تقسیم کیے گئے یہ تحفے پا کر ہم بہت خوش ہوئے، مگر میں ذرا اداس تھی کیونکہ مالٹا تو میں گھر لے آئی تھی مگر غبارے کا صرف دھاگہ تھا، جس کے سرے پر میرا غبارہ تو تھا مگر اس میں سوئی چبھو کر ہوا نکال دی گئی تھی۔ اور میں نے اس لڑکے کی شکل بھی دیکھ لی تھی۔ مگر ماں کے سامنے اس کا نام نہ لیا، کہیں ماں اسے بددعا نہ دے دے۔ مگر جس لڑکے نے میرے غبارے میں سوئی چبھوئی تھی وہ کوئی بچہ نہیں تھا بلکہ اقبال تھا، جس کی ماں معذور تھی اور اس کا باپ ایک ڈاکٹر صاحب کی دکان میں صفائی کرنے اور مکھیاں اڑانے کا کام کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا حکم تھا کہ اندر ایک بھی مکھی نہ آنے پائے، اقبال کی بیمار اور معذور ماں تو زندہ رہ گئی اور اقبال کا کمانے والا باپ فوت ہو گیا اب تو گھر کا خرچہ اس کو ہی لانا تھا مگر وہ زمیندار کے کھیتوں میں کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب ہم مسجد میں سیپارہ پڑھا کرتے تھے تو اس وقت بھی یہ بات مشہور تھی کہ اقبال اس گاؤں کا سب سے حسین اور اکھڑ مرد ہے، اس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے پاس بیٹھ کر تمہاری خدمت تو نہیں کر سکتا مگر شہر جا کر اتنے پیسے کما کر لاؤں گا کہ تمہارا علاج ہو جائے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اس بات پر ناراض بھی تھے کہ یہ کیسی اولاد ہے جو اپنی معذور ماں کی خیر خواہ اور خدمتگار نہیں، شہر میں تو آزادی کے لیے جا رہا ہے۔ اقبال ہر جمعے کو گاؤں آتا تھا اور ہر ہفتے کو واپس چلا جاتا تھا۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے اقبال کو دیکھا ہے۔ یہ وہ اقبال نہیں تھا جو گاؤں کی مسجد میں میرے ساتھ سیپارہ پڑھا کرتا تھا۔ اور بہت سیدھا اور شرمیلا تھا۔ اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا وہ بتانا ممکن ہی نہیں تھا۔ اور یہ بتانا تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس نے غبارے میں سوراخ کرتے وقت یہ بھی کہا تھا کہ میں آج رات تمہیں ملنے آؤں گا۔ ابھی چند سال پہلے تو یہ بہت عام سی بات تھی۔ ہمارے گھر ساگ پکتا تھا تو میں کئی بار اس کے گھر دے کر آئی تھی۔ اس کی ماں جب اچھی تھی تو اکثر ہمارے ہاں تازہ سبزیاں یا گڑ اور کبھی گنے لے کر آتی تھی۔ لیکن آج اس کا یہ کہنا اور سب سے چھپ کر بالکل آہستہ سے کہنا اور اتنی عجیب نظروں سے مجھے دیکھنا اور میں بھی اپنی جگہ پریشان کہ یہ اقبال اتنا خوبصورت کیسے ہو گیا۔ یہ سب میری سمجھ سے باہر تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ذرا اطمینان ہو گیا کہ ہمارے گھر تو کوئی اندر آتا ہی نہیں۔ جو آتا ہے حجرے میں ابا سے مل کر چلا جاتا ہے۔ مجھے تو شک بھی نہیں ہوا کہ وہ شہر جا کر صرف اتنا خوبصورت ہی نہیں چالاک بھی ہو چکا ہے۔ تھوڑی دیر

بعد دروازہ کھٹکا، اماں نے حسبِ عادت چھوٹی بہن کو بھیجا کہ جاؤ دیکھو کون ہے اور کیا کام ہے، چھوٹی بہن نے آ کر بتایا کہ ابا نے کسی کو بھیجا ہے دوسرے کمرے کی بجلی ٹھیک کروانے کے لیے۔ اماں نے اندر بلوایا تو وہ اقبال تھا، میرا دل تو جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ مجھے نہ تو کچھ سنائی دے رہا تھا نہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ اماں نے چائے بنانے کو کہا تھا، جو میں نے پیالی میں ڈال کر چھوٹی بہن کے ہاتھ بھجوادی، کمرے میں روشنی آ گئی تھی۔ اماں خوش ہو گئیں، اقبال نے کام ختم کرنے کے بعد چائے پی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اس کی آنکھوں میں جیسے کوئی پیغام تھا۔ میں چوتھی کلاس میں سہی، بچی تو نہیں تھی۔ اس کے آنے سے جو میری حالت ہو گئی تھی، میں اس کا کیا علاج کرتی۔ میں دروازے کی کنڈی لگانے گئی تو نہ جانے کیوں، مجھے لگا کہ وہ ابھی باہر ہے۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھولا، وہ بالکل دروازے سے لگا کھڑا تھا، جیسے اسے بھی پتہ ہو کہ میں ہی آؤں گی دروازہ بند کرنے۔ کل نو بجے گودام کے پیچھے آؤں گا، ضرور آنا'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ آج جمعہ تھا اور ہمارے سکول کی چھٹی تھی میں اٹھی اور لسی کا گلاس پیا، ماں گھر میں نہیں تھی۔ اوہ جبھی کسی نے مجھے صبح صبح نہیں اٹھایا تھا مجھے بڑی دیر بعد یاد آیا کہ آج تو صبیحہ کی شادی میں جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں، بابا کے ساتھ کسی اور رشتہ دار کے گھر گئی ہوئی تھی۔ شاید تایا کے گھر گئے ہوں گے یہ لوگ، کسی قسم کا صلاح مشورہ کرنے۔ ہمارے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے مگر بیچ میں دیواریں بھی تھیں، میں نے آج پہلی بار دیکھا کہ میں باہر نکلے بغیر گلی کے آخری گھر تک جا سکتی ہوں کیونکہ آسانی اور پردے کے خیال سے ہر گھر کی دیوار میں ایک چھوٹا سا رستہ بنا ہوا تھا، ہم ابھی چھوٹے ہی تھے کہ باہر جانے کے بجائے ہم اسی رستے ایک دوسرے کے گھر جایا کرتے تھے، میرے دل میں سے آواز آ رہی تھی کہ میں باہر نکلے بغیر گودام تک پہنچ سکتی ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی ڈر کے مارے جیسے میرا دل نکل گیا اف توبہ! میں کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی، کبھی دل چاہتا کہ اقبال سے پوچھوں کہ آخر وہ ایسی مشکل بات کیسے کر سکتا ہے، مگر اقبال کا نام دل میں لینے سے بھی پورا جسم دل کی طرح دھڑ دھڑ کنے لگتا تھا، چہرہ سرخ ہو جاتا تھا، اور کان جیسے جلنے لگتے تھے یہ اقبال جہاں رہتا تھا وہاں ٹھیک تھا، آخر یہ گاؤں آیا ہی کیوں ہے۔ ہمارے گاؤں کے دستور کے مطابق لڑکی کی رخصتی بہت دیر سے ہوتی ہے تقریباً 12 بجے کے قریب۔ ہم لوگوں نے مغرب پڑھ کر وہاں چلے جانا تھا، اور صبیحہ کی رخصتی کے بعد انہی کے گھر سونا تھا، کیونکہ میں اس کی بچپن کی سہیلی جو تھی۔ مگر مجھے تو جیسے کسی بات کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اقبال کو بھی یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے گاؤں میں ہونے والی شادی کا پتہ ہی نہ ہو، مغرب پڑھ کر ماں نے ہم لوگوں کو کھانا دیا، کہ نجانے شادی کا کھانا کتنی دیر میں ملے۔ پھر ہم سب تیار ہونے لگے، بابا بھی آ گئے تھے، ماں عام طور پر ہلکی ہلکی لپ سٹک لگا لیتی تھی، آج تو اس نے پوڈر بھی لگایا اور زیور بھی پہنا ہوا تھا۔ میں نے بھی ماں کی لپ سٹک لے کر ہلکی سے لگالی۔ سبز رنگ کا گوٹے والا جوڑا اور سونے کا سیٹ پھر لپ سٹک، جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا، آج میں نے بالوں کی چٹیا نہیں بنائی بس کھلے بالوں میں کلپ لگایا تھا پھر مجھے خود بھی پتہ تھا کہ میں بہت اچھی لگ رہی ہوں۔ ماں نے گھر سے نکلنے سے پہلے سب کی نظر اتاری۔ ماں ہمیشہ یہ کرتی تھی مگر آج سوچتی ہوں کہ شاید، میری نظر نہیں اتر پائی ہو گی مجھے تو نظر لگ چکی تھی، ہم لوگ گھر سے نکلے تو مجھے اقبال نظر آ گیا، اس نے ہمیشہ کی طرح کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اس کا مطلب ہے کہ وہ شادی میں نہیں جا رہا تھا، ہمارے گاؤں میں ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ اس میں سب کچھ ملتا تھا۔ میرے دل میں نہ جانے ایک دم کیا خیال آیا کہ میں چھوٹی بہن کا ہاتھ پکڑ کر دکان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ''کاکا! بالوں میں لگانے کا کوئی چھوٹا سا کلپ ہو گا تمہارے پاس، مجھے اس کے لیے چاہیے''۔ یہ ساری باتیں کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر مجھے تو اقبال کو یہ سب بتانا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک معصوم سی تسلی آ گئی تھی، جیسے اسے میرا یہ سب بتانا اچھا لگا ہو۔ میں نے کلپ

لے کر چھوٹی بہن کے بالوں میں لگا دیا، جو اس نے نکال دیا، آخر وہ بھی تو شادی میں شریک تھی۔ اور خوب اترا رہی تھی میں نے پیغام تو دے دیا تھا مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اقبال پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں جان بوجھ کر اقبال کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ مگر سچ یہ ہے کہ مجھے سب کچھ پھیکا پھیکا اور بے کار بے کار سا لگ رہا تھا۔ بہر حال برات آ گئی، جس کے آگے بچوں کا ایک گروپ ڈانس کر رہا تھا اور ان کے پیچھے دلہا کے چار دوست فلمی گانوں کی دھن پر ناچ رہے تھے اور پھر باقی رشتہ دار اور براتی تھے۔ اور براتیوں کی آخری صف میں شاہزادوں کی طرح چلتا ہوا اقبال بھی۔ اس کی نظریں ہر بات سے بے نیاز چاروں طرف جیسے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اقبال کی آنکھوں میں یہ جرأت، یہ محبت، یہ تلاش میرے لیے تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں مغرور ہوگئی ہوں یا ہونا چاہتی ہوں، میرے لہجے میں، میری چال میں جو نخرہ آ گیا تھا، وہ حیران کر دینے والا تھا، میرا چہرہ ہی کیا پورا وجود جیسے مسکراہٹ میں بھیگ گیا تھا، وہ بظاہر ڈانس دیکھ رہا تھا لیکن میرا دل اس کی موجودگی کی وجہ جانتا تھا۔ وہ نوجوانوں کے ایک گروپ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، پھر صبیحہ کی رخصتی ہوگئی، رات بھیگ چلی تھی۔ خدا جانے کب نیند آئی۔ مجھے گرمی لگی تو میری آنکھ کھل گئی، دھوپ کمرے میں آ چکی تھی۔ گاؤں میں ہم سب فجر کے وقت جاگ اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں اتنی، دیر تک سونا نحوست سمجھا جاتا ہے اور لڑکیوں کا تو خاص طور پر۔ کیونکہ اگر کسی کی بہو ایک دن بھی اتنی دیر تک سوتی رہ جائے تو بدنامی ماں کی، اور طعنے ساس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ مگر میرے چہرے پر صرف مسکراہٹ تھی کیونکہ ذہنی طور پر ساس کا نام آتے ہی میرے دماغ میں اقبال کی ماں کی تصویر گھوم گئی جو اس طرح کی باتوں سے بہت دور تھی۔ مجھے بھلا کون جگائے گا، کون ستائے گا اور کون طعنے دے گا۔ میں تو کسی نیک گھڑی میں پیدا ہوئی تھی کم از کم اقبال کی والہانہ نظروں سے تو یہی اندازہ ہوا تھا۔ میں نے بستر وغیرہ تہہ کئے۔ باہر جا کر صبیحہ کی ماں کو سلام کیا، اور چھوٹی بہن کو اٹھا کر گھر کا رستہ لیا۔ مگر یہ کیا؟ اقبال اسی کریانے کی دکان پر کھڑا دکاندار سے باتیں کر رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخی صاف نظر آ رہی تھی۔ میں دل کے کسی کونے میں مسکرائی مگر اس کو پریشان دیکھ کر اچھا نہیں لگا میں قریب سے گزری تو اس نے آنکھوں آنکھوں میں جیسے یاد دہانی کروائی۔ ''آج رات نو بجے گودام کے پیچھے'' اوہ میرے خدا۔ محض یاد دہانی کی خاطر کیا وہ پوری رات نہیں سویا، میرے اندر بھی جیسے ایک طوفان سا آ گیا، اگر میں ملنے نہ گئی تو وہ نجانے کتنی اور راتیں جاگے گا، میں نے بھی آنکھوں آنکھوں میں جیسے اقرار کر لیا۔ سچ یہ ہے کہ مجھ میں اس سے ملنے کی ہمت بالکل نہیں تھی۔ دن میں ملنا ناممکن تھا۔ ہمارے گاؤں میں یہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ چند سال پہلے کوئی قصہ ہوا تھا اتنا یاد ہے کہ لڑکی کے بھائی نے اپنے ہاتھوں سے بہن کو گولی مار دی تھی۔ اور یہ مشہور کر دیا کہ بندوق کی صفائی کرتے ہوئے گولی دھوکے سے لگ گئی۔ ایسے بھائیوں کو بہادر سمجھا جاتا ہے اور کسی سے ملاقات کرنے والی لڑکیوں کو ایسی ہی موت کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا، کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے تو اس کے پاس بس ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ وہ رشتہ مانگ لے اور اس لڑکی سے شادی کر لے۔ مگر میری ماں تو مجھے استانی بنانا چاہتی تھی۔ تو اقبال سے ملاقات کی کیا ضرورت؟ جب میں یہ سوچتی تو ایک عجیب سی پریشانی مجھے گھیر لیتی۔ آخر میں نے سوچا کہ کم از کم ایک بار مل کر میں اسے بتا تو دوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ایک منٹ لگے گا یہ ساری بات بتانے میں، پھر مسئلہ ختم۔ یہ سوچ کر ذرا اچھا لگا۔ میں نے بہت جلدی کھانا کھا لیا اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ آٹھ بجے تک اچھا خاصا سناٹا چھا چکا تھا۔ کبھی کبھار گلی سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی اور میں دہل جاتی کہ کہیں اقبال کو دیکھ کر نہ بھونک رہے ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو کوئی نہ کوئی چوکنا ہو جائے گا۔ یا اللہ میں کیا کروں۔ رات کو باہر نکلنے کی ہمت کہاں سے لاتی، اقبال کو کیسے نظر انداز کرتی۔

ابھی چار دن پہلے تک میری زندگی کتنی پرسکون تھی میں کتنی جلدی سو جاتی تھی، کتنی جلدی اٹھ جاتی تھی۔ ماں کو جگائے بغیر ناشتہ

کرتی اور سکول سب سے پہلے پہنچ جاتی مگر آج تو سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، ادھر گھڑی کی سوئیاں نو بجانے والی تھیں ادھر میرا ڈر کے مارے برا حال تھا، میں تو گھر کے اندر اتنی ڈری ہوئی تھی باہر کیا خاک جاتی، نو بج گئے پھر دس بج گئے میں جاگ رہی تھی مگر باہر نہیں نکل سکتی تھی، مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی پھر مجھے ہلکی ہلکی آواز سنائی دی جیسے کوئی میرے کمرے کے دیوار بجا رہا ہو، آہستہ آہستہ، یہ اقبال کے سوا کون ہو سکتا تھا، میرا گلا جیسے بند ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ شاید میری آنکھیں نکل پڑیں گی۔ مجھے اقبال کی فکر بھی تھی۔ وہ کب تک میرا انتظار کرے گا۔ خدا جانے اس کے پاس گرم چادر بھی ہے یا نہیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آج رات پھر کہیں اٹھ کر کہیں بیٹھ کر گزار دے گا۔ مگر رہے گا میرے ہی گھر کے آس پاس۔ مجھے نیند بھی تو نہیں آ رہی تھی۔ دیوار پھر بجائی گئی، مگر میں نے اپنی سانس تک روک لی تھی اگر اسے شک بھی ہو جاتا کہ میں جاگ رہی ہوں تو پھر تو وہ اور بھی پریشان کرتا۔ میں سوتی بن گئی، پتہ نہیں رات کیسے گزرے گئی، وہ گھر بھی گیا یا نہیں۔ اب مجھے اس کی فکر تھی اور میں اس مسئلے کا کوئی حل چاہتی تھی اور حل بس یہ نظر آ رہا تھا کہ میں ایک بار اس سے مل لوں، اور ملنے کی ہمت میں کہاں سے لاتی؟ سوچتے سوچتے ایک حل سمجھ میں آ ہی گیا، میں نے سوچا کہ اقبال سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کروں گی کہ رات کو گھر سے نکلنا میرے لیے ممکن نہیں اور اتنی سی بات تو دن میں اسے روک کر بھی کہی جا سکتی ہے۔ میرے تھکے ہوئے دماغ کو جیسے ایک منٹ کے لیے آرام مل گیا۔ میں سو گئی، شاید وہ بھی گھر چلا گیا ہوگا۔ صبح سکول جاتے ہوئے وہ کہیں نظر نہ آیا، لیکن میں خوش اور مطمئن ہونے کے بجائے بہت زیادہ پریشان ہو گئی۔ کیوں؟ یہ میری سمجھ سے باہر تھا، دل چاہتا تھا کہ وہ مجھے نظر آئے اور بالکل خیریت سے بھی ہو، اگر وہ رات کو ملنے کی بات چھوڑ دے تو باقی اس میں کیا خرابی تھی؟ گھر واپس آئی تو ماں اپنا ٹین کا بکس تیار کیے بیٹھی تھی۔ اسے اپنی ماں کے گاؤں جانا تھا، کسی بھانجی یا بھتیجی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی اماں کو بلاوا آیا تھا، جب ماں اپنی ماں کے گھر جاتی تھی تو اسی ٹین کے بکس میں جانے کیا کیا بھر لیا کرتی تھی، تاکہ اس کے میکہ پر یہ دھونس رہے کہ اس کا ہاتھ خوب کھلا ہے۔ بابا بکس کے وزن کی وجہ سے بڑبڑایا کرتا تھا اور اماں سے لازماً پوچھتا تھا کہ تم نے کیا اس میں پتھر بھر رکھے ہیں آخر یہ اتنا وزنی کیوں ہے اور ماں، بابا کے غصے کو نظر انداز کر کے ''جلدی کرو۔ دیر ہو جائے گی'' کہتی اور پھر دونوں چلے جاتے اور رات گئے تک لوٹ آتے۔ لیکن آج ماں نے ہم دونوں بہنوں کو کھانا کھلایا خوب پیار کیا اور کہا کہ اس ایک دن یا دو دن رکنا پڑے گا، بابا البتہ واپس آ جائے گا، اور مجھے اتنی نصیحتیں کیں جیسے دو دن نہیں بلکہ دو سال کے لیے جا رہی ہو۔ اماں نے جیسے ہی گھر سے قدم نکالا مجھے عجیب سی آزادی اور خود مختاری کا احساس ہوا، میں دس بار دروازے کے باہر جھانک چکی تھی پتہ نہیں خدا نے میری دعا سنی تھی یا میں خدا کی دی ہوئی تقدیر کے آگے مجبور تھی۔ میری بہن نے کہا کہ اسے سکول کے لیے کروشیہ اور ریشم خریدنا ہے۔ ماں کی تاکید تھی کہ کسی صورت میں بھی کوئی گھر سے اکیلے نہ نکلے۔ میں نے ساتھ والے گھر سے چچا کے بیٹے کو آواز دی کہ وہ بہن کے ساتھ دکان تک چلا جائے۔ میں باورچی خانے کی صفائی کرنا چاہ رہی تھی۔ اقبال کو جیسے دنیا کا کوئی کام تھا ہی نہیں، پتہ نہیں اس کو کیسے پتہ چل گیا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ شاید اس نے ماں، بابا کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا، گاؤں میں یہ ایک عام منظر تھا کہ آگے آگے ٹین کا چھوٹا سا ٹرنک اٹھائے مرد، اس کے پیچھے اس کی عورت، عورت کے پیچھے بھاگتا ہوا بچہ، جو ماں سے انگلی چھڑا کر اپنی مرضی سے چلنا چاہتا ہے اور ان سب کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر گاؤں کا کوئی آوارہ کتا۔ بابا کے ہاتھ میں بھی ٹرنک تھا، جس کو ماں نے ٹھونس ٹھونس کر بھرا تھا، وہ اپنی رشتے کی بہنوں کو چھوٹے موٹے تحفے بہت جتا جتا کر دیا کرتی تھیں تاکہ سب پر ان کی خوشحالی کا رعب رہے۔ میں کام بھی کرتی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں ایک ایک سیکنڈ کا حساب رکھے ہوئے تھی کیونکہ میں بھی ماں کی طرح ہر وقت فکر میں مبتلا رہتی تھی۔ اتنے میں دروازہ آہستہ سے کھٹکا اور میرا دل زور سے

نجانے کیوں؟ ہونی ہوکر رہتی ہے، دروازے پر اقبال کھڑا تھا، تمہیں میرے سر کی قسم تم آج ضرور آؤ گی، ورنہ کل تمہیں خدا میری ''پیتھی'' کھلائے گا۔ میں نے بے اختیار ہوکر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سر ہلا دیا، جیسے میں آؤں گی۔

ہمارے گاؤں میں جب کوئی فوت ہوجائے تو میت والے گھر میں چولھا نہیں جلتا۔ آس پڑوس کے لوگ تین دن تک کھانا پہنچاتے ہیں یہ کھانا بالکل سادہ ہوتا ہے۔ اس کو ''پیتھی'' کہتے ہیں۔ میں اتنی بُری بات سن کر ڈر گئی، اور حامی بھر لی۔ میرے بھائی بہن گھر آ گئے، میں بظاہر گھر کے کام کاج کرتو رہی تھی لیکن میرے ہاتھ پاؤں بالکل بے جان ہو رہے تھے، رات کو گھر سے نکلنے کا ایک ہی مطلب اور ایک ہی انجام ہوسکتا ہے اور مجھے خود سے زیادہ ترس اقبال پر آ رہا تھا۔ اسے نہ تو اپنی جوانی کا خیال تھا اور نہ ہی اپنی بوڑھی ماں کی معذوری اور بڑھاپے کا۔ اِدھر میں لرز لرز کر بے حال ہو رہی تھی ادھر اقبال کی ضد جاری تھی۔ شام گزر گئی، رات آ گئی، جو گاؤں میں ویسے بھی جلدی آ جاتی ہے۔ خاموشی میں کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی تھی اتنے میں دیوار تھپکنے کی آواز آئی، میں جیسے سہم کر ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ کہیں کوئی اور یہ آواز نہ سن لے، پھر خاموشی چھا گئی میں نے سوچا شاید مایوس ہوکر چلا گیا ہے۔ مگر یہ کیا، اس بار دروازہ کھٹکھٹایا گیا، حد ہوتی ہے دیدہ دلیری کی۔ ہم لوگوں کے گھروں کی دیواریں اتنی نیچی تھیں، کوئی دیکھ لے یا سن لے گا تو پھر میری ایک نہیں سنی جائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے دروازہ کھولے بغیر کہا کہ ''مجھے پتہ ہے یہ تم ہو، مگر خدا کے لیے اس وقت چلے جاؤ، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' ''اور میں جو اتنے دنوں سے ہاتھ جوڑ رہا ہوں اس کا کیا؟ ایک بار مل لوگی تو کیا بگڑ جائے گا! میں تو چاہے مر بھی جاؤں تمہیں کوئی پرواہ نہیں''؟؟ ''اگر پرواہ ہے تو بس ایک بار مل لو۔ بس ایک بار۔'' وہ خوشامد کر رہا تھا۔ میرے وجود میں غرور وفخر کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اقبال جیسا خود سر مرد میری خوشامدیں کر رہا تھا، میں نے آہستہ سے کنڈی کھول دی وہ تو جیسے دروازے سے چپکا کھڑا تھا، فوراً اندر آ گیا۔ ہمارے گھر میں داخل ہوں تو دائیں طرف والے کمرے میں ہماری بھینس بندھی ہوئی ہیں اور بائیں طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، جس میں بھوسہ اور کھلی اور اسی طرح کی کچھ اور چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے اقبال کو بھوسے والے کمرے میں دھکیل کر دروازے کی کنڈی لگا دی اور اسے اشارہ کر کے اندر آ گئی، اپنی دونوں بہنوں کو سوتے دیکھا، ان کی رضائی ٹھیک کی اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اب میں ڈرتے ڈرتے اقبال کے پاس آ گئی کمرے میں روشنی نہیں تھی، بس اقبال کے وجود کی گرمی تھی اور میں جیسے پگھلی جا رہی تھی۔ ''جلدی کہو کیا کہنا ہے؟'' اقبال کی تسلی آمیز ہنسی سن کر مجھے بہت حیرت ہو رہی تھی۔ ''تم سے کیا کہنا ہے، کہوں گا تو تمہارے بابا سے''۔ تو پھر کہہ دو، یہ آدھی رات کو میری جان کیوں سکھا رہے ہو؟''

''تمہاری جان کیوں سوکھ رہی ہے میرے ہوتے ہوئے؟ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' ''تمہیں بابا سے جو کہنا ہے کہو جا کر''.....

میں نے جان چھڑانی تھی۔ واہ ایسے کیسے کہوں، تمہاری مرضی جانے بغیر۔ میں تمہاری مرضی جانے بغیر تمہارا ہاتھ کیسے مانگ سکتا ہوں؟ اس وقت چلے جاؤ، ہاتھ مانگو یا جو کچھ بھی کرو تمہاری مرضی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں.....نہیں بابا نہیں۔ میں نے یہ کہہ تو دیا مگر مجھے چند مشکلات کا اندازہ تھا۔ اقبال یتیم ہے چھوٹا سا گھر ہے، زمین بھی نہیں ہے مجھے ماں استانی بنانا چاہتی ہے۔ میں نے اپنا سر جھٹک دیا ''تمہارے بابا کب واپس آئیں گے'' اس نے پوچھا، بس یہی کوئی دو تین دن میں چلو ٹھیک ہے۔ میں جمعے کے بعد ان سے ملوں گا۔ تم بھی میری سفارش کر دینا۔ ابھی تو میں اپنے مالک کی سوزوکی چلاتا ہوں۔ پھر اپنی لے لوں گا اور تمہیں خوب سیر کراؤں گا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم جو چاہو کرنا۔ مگر اب چلے جاؤ۔'' جاتا ہوں، جاتا ہوں۔ توبہ ہے کیسی بیوی ملے گی مجھے مہمان کو چائے پلانے کے بجائے دھکے دیئے جا رہے ہیں۔ اقبال نے اس یقین، اس اپنائیت اتنی سچائی سے بیوی کہا کہ میری بے اختیار ہنسی نکل گئی، شرم کے مارے برا حال ہوگیا، مجھے لگا

کہ اقبال کے ہاتھ میں ٹین کا چھوٹا سا ٹرنک ہے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی ہوں۔ اس کے ارادے اٹل اور بے جھول تھے۔ مجھے یوں لگنے لگا کہ میں بھی اسی کے لیے بنی ہوں۔ گھر بار تو نہیں تھا اس کا کوئی خاص، لیکن وہ بہت مضبوط اور شاندار مرد تھا، نڈر اور دلیر اور پھر مجھ پر اس حد تک فریفتہ تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں مجھے 'بیوی' کہہ رہا تھا، جھوٹ کی پرچھائیں تک نہ تھی اس کی باتوں میں۔ میں بھی ایک لمحے سے بھی کم وقت میں ایک ڈری ہوئی لڑکی کے بجائے ایک مضبوط مرد کی بیوی بن چکی تھی۔ اب میں نے اسے جانے کو کہا تو میری آواز میں دم نہیں تھا اور اس نے کہ اچھا اب چلتا ہوں۔ تو میں بمشکل سر ہلا پائی، میں بھی بے خیالی میں اسے دیکھے جا رہی تھی، جیسے وہ میری آنکھیں لیے جا رہا ہو۔ میں ڈرے ڈرے انداز میں دروازے کو دیکھ رہی تھی کہ جیسے ہی وہ باہر نکلے میں کنڈی لگا کر سکھ کا سانس لوں مگر وہ میرے بالکل قریب آ گیا، میں جا رہا ہوں..... اچھا..... لیکن اس نے جانے کے بجائے اپنے بازو پھیلا دیئے اور مجھے اس کے سینے پر سر رکھنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا، وہ میرا تھا، میرا اپنا، اس نے اپنی گرفت تنگ کر دی تھی، ہم دونوں اسی طرح لپٹے کھڑے تھے کہ اچانک ایک بھینس زور سے ڈکرائی۔ میں ڈر کے مارے اس کے قریب آ گئی تھی۔ اقبال نے کندھے پر رکھی ہوئی چادر بھس پر پھیلا دی، میں جیسے بالکل بے جان ہو رہی تھی۔ اسی چادر پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں کب تک بیٹھے رہے اور کب اسی چادر پر لپٹ کر لیٹ گئے کچھ پتہ نہ چلا البتہ جب صبح کی اذان سنائی دی تو ہم دونوں ہڑبڑا کر اٹھے میں نے اسے تقریباً دھکیل کر گھر سے باہر نکالا، کنڈی لگائی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ میرے دل سے ہر ڈر نکل چکا تھا۔ میں بھی وہی سوچ رہی تھی جو اقبال نے کہا تھا یعنی جمعے کے بعد وہ بابا سے بات کرے گا اور پھر بس میں اس کی ہو جاؤں گی اور بابا کو کیا پتہ، کسی کو بھی کیا پتہ کہ میں تو اس کی ہو ہی چکی تھی۔ اور اگلے ہفتے تک میں اقبال کے ساتھ رخصت ہو جاؤں گی۔ پھر کون پڑھتا ہے کون استانی بنتا ہے۔ میں تو آرام سے اقبال کا چولھا چوکا سنبھالوں گی ماں سے کہہ دوں گی کہ وہ چھوٹی بہن کو استانی بنا دے۔ میں تو ویسے بھی کلاس میں سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے شرمندہ شرمندہ رہتی تھی اب اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بس ایک ہفتے کی تو بات ہے استانی کا دیا ہوا کام بھی میں نے بے دلی سے کیا، میں تو نیند کے مارے مری جا رہی تھی۔ گھر آئی اور کھانا کھا کر سو گئی۔ مغرب کے وقت آنکھ کھلی، ابھی تو اقبال نے بابا سے بات تک نہیں کی تھی مگر مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میری بات پکی ہو چکی ہے۔ میں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تو اقبال کی دلہن نظر آتی تھی، ایسے میں، دل کے کسی کونے سے نکلی سہمی ہوئی آواز کو اہمیت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ کوئی سہما سہما سا اندیشہ سر تو اٹھا رہا تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ اور میرا پورا جسم سانپ کے جسم کی طرح ہو گیا تھا میں نے سنا ہے کہ سانپ کے کان نہیں ہوتے مگر وہ پورے جسم سے سن سکتا ہے۔ میرا پورا جسم بھی ایک دستک سننا چاہ رہا تھا۔ ابھی عشاء کی نماز ہو جائے گی۔ گاؤں نیند میں ڈوب جائے گا اور ایک دیوانہ یہاں گلی میں پیچھے مجھ سے ملنے آئے گا، جان ہتھیلی پر رکھ کر، جیسے موت کا ڈر نہیں گاؤں کی پرواہ نہیں، نماز کا وقت گزر چکا، گاؤں میں خاموشی چھا گئی، مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی، گھڑی کو دیکھا، تو رات کے دس بج چکے تھے، پریشانی کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ صرف ایک ملاقات میں یہ تبدیلی آ چکی تھی۔ میں کہاں جاتی آخر کو میں کہاں جاتی، کس سے پوچھتی، کس کو بتاتی، کون سمجھتا کہ اقبال کے نہ آنے سے میری یہ حالت ہو گئی ہے، خدا کرے وہ خیریت سے ہو میرا چین و سکون تو جیسے لٹ چکا تھا، میں بظاہر بستر پر لیٹی ہوئی تھی مگر کسی کروٹ چین نہ تھا، گیارہ بج گئے، یا اللہ خیر آخر مجھے وہ تھپکی سنائی دے ہی گئی، میں بالکل بے قابو ہو کر اٹھی اور دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی، دروازہ آہستہ سے بجا اور میں نے فوراً کھول دیا، تم اب تک کہاں تھے، میں تو پریشان ہو گئی تھی ہاں۔ وہ دکان والا چاچا ہے نا وہ جان نہیں چھوڑ رہا تھا، دو تین لڑکے اور بھی جمع تھے۔ بس آخری بازی، آخری بازی کہہ کر تاش کھیلتے رہے۔ میں اقبال

کو دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے اسے اپنی آنکھوں میں بھر رہی ہوں۔

دیکھو..... یاد رکھو۔ اگر تم نے کسی اور سے شادی کا سوچا بھی تو میں اپنے آپ کو یہاں گولی ماروں گا۔ اس نے اپنی کنپٹی کی طرف اشارہ کیا۔ میں ہنسنے لگی۔ ارے مذاق کر رہی تھی۔

مگر مجھے ایسا مذاق بھی پسند نہیں۔ تم صرف میری ہو..... اور بس اقبال کو یہ بات مذاق میں بھی پسند نہیں تھی، میں بجا طور پر اس پر اترا سکتی تھی، نخرہ کر سکتی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں کوئی سچ مچ کی شہزادی ہوں خالی نام کی نہیں بھوسے کے اس چھوٹے سے کمرے میں ایک عام آدمی کی محبت نے دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وقت گزرنے کا احساس صبح کی اذان سے ہوا، بڑے دکھی انداز سے میں نے اقبال کو اور اقبال نے مجھے الوداع کہا۔ مجھے تسلی تھی کہ چلو ابھی ایک رات اور ہے۔ پھر ماں بابا آ جائیں گے اور اقبال بابا سے بات کر لے گا۔ ماں بابا ابھی پہنچے ہی تھے کہ اچانک حجرے سے کوئی بھاگتا ہوا آیا اور بابا کو بلا لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں بھر میں سوگ کی فضا ہو گئی۔ انور خان کی میت، ہسپتال سے آ گئی، انہیں چند دن پہلے دشمنوں نے گولی ماردی تھی، انور خان کا بچہ 7 ماہ کا تھا، نوجوان بیوہ نے چوڑیاں توڑ کر بین کیے تو گاؤں کی ہر آنکھ آنسو بہا رہی تھی۔ انور خان بابا کے چچازاد بھائی کا نوجوان کڑیل بیٹا تھا، کسی پرانی دشمنی کی وجہ سے اسے چند روز پہلے نشانہ بنایا گیا تھا اور اس کا علاج بہت وقت پر ہو گیا تھا۔ امید تو یہی تھی کہ وہ بچ جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔

گاؤں کے لوگ اس طرح کے واقعات کی رپورٹ درج نہیں کرواتے تھے سب کو اپنے اپنے دشمنوں اور دوستوں کی خبر تھی۔ میں جانتی تھی کہ بہت جلد ایک اور جنازہ اٹھے گا جو کہ اسی گاؤں کی کسی گلی سے نکلے گا کیونکہ جس نے انور خان پر گولی چلائی تھی، وہ بھی زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گا۔ یہ گاؤں میں معمول کی بات تھی۔ اس میّت کی وجہ سے مجھے سکول سے بھی چھٹی کرنا پڑی کیونکہ گاؤں کے لوگ ہمارے گھر بھی آ جا رہے تھے۔ تین دن ہمارے گھر بھی چولھا نہیں جلا تھا کیونکہ انور خان کا گھر ہمارے گھر سے بالکل قریب تھا۔ اس کے بعد مہمانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے گھر کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ میں چائے پکا رہی تھی کہ ایک چھوٹے سے بچے نے مجھے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ پکڑا دیا۔ یہ پیغام اقبال کی طرف سے تھا۔ ''میں اپنی نوکری پر جا رہا ہوں بہت مجبوری ہے۔ درمیان میں آنے کی کوشش کروں گا'' میں نے کاغذ چھپا لیا۔ بار بار پڑھا، صورتحال میرے بھی سامنے تھی دس دن کے بعد میں نے سکول جانا شروع کر دیا، نظریں بس اقبال کو ڈھونڈ رہی ہوتی تھی۔ کچھ اور بس نہ چلتا تو بھوسے کے کمرے میں اسی جگہ پر بیٹھ جاتی جہاں اقبال نے اپنی چادر بچھائی تھی۔ جہاں ایک لڑکی، ایک ملکہ میں بدل گئی تھی، جہاں اقبال نے مجھے اپنی بیوی کہا تھا، اب کان وہی آواز سننا چاہتے تھے۔ دل تڑپ رہا تھا، لیکن فضا میں ایک نوجوان کی موت کا سوگ تھا، پہلے سے طے شدہ منگنیاں، شادیاں بھی نہیں ہو رہی تھیں تو ایک نئی بات تو ہرگز نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اقبال نے کام پر بھی تو جانا تھا۔ مگر اب ڈر سا لگ رہا تھا، دل چاہتا تھا کہ وقت جلدی گزر جائے، اقبال آ جائے ماں دن میں کئی بار ٹوکتی، تمہارا دھیان کدھر ہے؟ استانی کہتی کہ توجہ سے سبق سنو۔ مگر میرا دھیان اور میری توجہ تو شاید اقبال کے ساتھ چلی گئی تھی۔ دل ہر آہٹ پر چونک پڑتا تھا، نظریں دروازے کی طرف لگی رہی تھیں۔ نہ کسی بات پر ہنسی آتی تھی نہ رونا آتا تھا۔ لگتا تھا کہ میرا کسی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ نہ کسی کے دکھ سے مطلب نہ کسی کے سکھ سے۔ اقبال کے پیغام کا مطلب تھا کہ اب وہ میّت کا چالیسواں ہونے کے بعد ہی آئے گا۔ کاش وہ مجھے اپنی تصویر ہی دے گیا ہوتا تو میں اس تصویر سے ہی باتیں کر لیتی۔ صبح سو کر اٹھتی تو دل چاہتا کہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگوں، دل ہی دل میں ہر وقت اقبال سے باتیں کرتی رہتی، بے معنی غیر اہم اور بے کار باتیں، اقبال تو شاید ہوٹل سے کھانا کھاتا ہوگا، جانے کیا کھاتا ہوگا، ہوٹل والے تو بہت سارے پیسے

لیتے ہوں گے۔ اقبال کہاں رہتا ہوگا، اس کا گھر کون جھاڑتا پونچھتا ہوگا۔ بس ہر وقت اقبال کے بارے میں سوچتی رہتی۔ ماں کی جھنجھلاتی ہوئی آواز سنائی دی، کہ شاید میں بہری ہوگئی ہوں، تین آوازیں دے چکی ہوں، بابا نے دس مہمانوں کے لیے چائے منگوائی ہے۔ میں نے ماں کی بات کا جواب دیئے بغیر چائے چڑھا دی کتلی اور پیالیاں ٹرے میں رکھیں۔ ماں نے جلدی کرنے کو کہا کیونکہ حجرے سے لڑکا آنے والا تھا۔ میں نے چائے کی ٹرے تیار کر کے رکھ دی تھی۔ ماں کو فکر تھی کہ چائے ٹھنڈی ہوگئی تو بابا غصہ کریں گے، ماں نے کہا کہ جاؤ گلی میں دیکھو محلے کا کوئی بھی لڑکا نظر آ جائے تو چائے بھجوا دیں گے۔ میں نے جیسے ہی دروازے میں سے سر نکالا، اقبال باہر کھڑا تھا، میرے چہرے پر جیسے گلاب کھل گئے۔ چائے کی ٹرے پکڑتے پکڑتے اقبال میرے کان میں اپنا پیغام ڈال چکا تھا ''رات کو آؤں گا صرف ایک دن کے لیے آیا ہوں۔'' وہ تو یہ کہہ کر چلتا بنا لیکن میں تو جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی پہلے تو ماں بابا گھر میں نہیں تھے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے، میرے چہرے کی بدلتی رنگت، چال ڈھال، انداز، اقبال کی سرگوشی آنکھوں میں شناسائی، دھونس اور اپنائیت کا انداز ماں نے بہت قریب سے دیکھ لیا تھا۔ میرے انداز کی بغاوت بھی بھانپ لی تھی۔ مجھے بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا، پوچھے گی تو بتا دوں گی لیکن ماں نے پوچھا کچھ نہیں، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ مجھے نہ تو انداہ تھا نہ ہی کوئی دلچسپی کہ کوئی کیا سوچ رہا ہے۔ میرا تو جیسے کسی سے کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ میں حیران تھی۔ جس ماں نے مجھے پالا پوسا میں اس کی طرف سے کتنی لاپرواہ ہوگئی تھی۔ مگر میں یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر تھوڑی کر رہی تھی۔ بس سب کچھ خود بخود ہو رہا تھا۔ مجھے رات کو ملنے اور چھپ چھپ کے ملاقاتیں کرنے والوں کے انجام کی خبر تھی، مگر مجھے تو جیسے کسی بات کی پرواہ ہی کب تھی۔ اگر پرواہ تھی تو اتنی کہ بھلے کوئی مجھے گولی مار دے مگر میں گولی کھا کر گروں تو اقبال کے بازوؤں میں کیا یہ حالت اقبال کی بھی تھی۔ میں خود سے سوال کرتی اور خود کو جواب دیتی کہ اگر نہ ہوتی تو وہ شہر سے ایک دن کی چھٹی لے کر کیوں آتا۔ وہ مجھے دیکھنے آیا ہے۔ یہ غرور مجھے اور بھی باغی اور دنیا سے بیگانہ کر رہا تھا میں نے اقبال سے ملنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا، مگر یہ کیسے ممکن ہوگا مجھے خود ہی خبر نہیں تھی۔ ماں مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ چپ رہنا ہرگز ہرگز ماں کی عادت نہیں تھی۔ وہ معمولی سی بات پر ایک ہزار سوال کرنے کی عادی تھی۔ حجرے کے معاملات ہوں یا فصل کے، رشتے داروں کا کوئی قصہ ہو یا شہر جا کر خریداری کرنا ہوں، سب رشتہ دار ماں سے مشورہ کرتے تھے اور بابا تو ماں کے مشورے کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ماں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور بالکل خاموش تھی۔ وہ اسی طرح جا کر لیٹ گئی۔ بابا کھانا کھانے آئے تو ماں نے سر درد کا بہانہ کر دیا اور چھوٹی بہن سے کہا کہ بابا کو کھانا دے دو۔ ہر روز یہ کام میرا ہوتا تھا۔ ماں کھٹک گئی تھی، لیکن اس کے دل میں کیا کھچڑی پک رہی تھی مجھے کیا پتہ۔ لیکن وہ بہت خاموش اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ رات دس بجے تک گاؤں میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ میں نے دیوار تھپکنے کی آواز سُن لی تھی اور میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھ چکی تھی۔ اقبال آ چکا تھا اور چھوٹا سا بھوسے کا کمرہ ہمارے لئے جنت سے زیادہ اہم بن چکا تھا۔ اقبال نے اپنی چادر بچھا دی جس پر ہم دونوں بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے کرتے لیٹ چکے تھے، اقبال کبھی میرے ہاتھوں کو اور کبھی میرے بالوں کو آنکھوں سے لگا رہا تھا، دیوانہ وار چوم رہا تھا، میرے بال کھل گئے تھے، مگر ہمیں دنیا کی خبر نہ تھی۔ ہمیں تو حسبِ معمول اذان کی آواز سنائی دی اور ہمیں مجبوراً الگ ہونا پڑا۔ پہلے میں نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا، اقبال باہر نکل گیا تو کنڈی لگا دی اور پھر دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف بڑھی مگر یہ کیا ماں کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی، وہ مجھے سر سے پاؤں تک بغور دیکھ رہی تھی، میرے بال کھلے تھے، اور میرے کپڑوں میں بھس اٹکا ہُوا تھا اور میرے بالوں میں بھی۔ میرا رنگ زرد پڑ چکا تا

لیکن ماں کچھ کہتی تو میں سب کچھ سچ مچ اُگلنے کو تیار تھی۔ مگر ماں نے پوچھا ہی نہیں۔ میں کمرے میں چلی گئی اور ماں باورچی خانے میں۔ میں نے کپڑے بدل کر سکول کا یونیفارم پہن لیا اور حسبِ معمول باورچی خانے میں آ گئی۔ یہ سوچ کر ماں اب تک بابا کو سب کچھ بتا چکی ہو گی اور بابا کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا ہو گا۔ مگر بابا کا چہرہ بالکل ہر روز جیسا تھا۔ ماں خاموش تھی اور میں بھی۔ میری آواز تو نکل ہی نہیں رہی تھی۔ چھوٹی بہن بستے لیے کھڑی تھی۔ میں کچھ بولے بغیر سکول چلی گئی۔ سکول میں بھی بس دن گزارنے والی بات تھی، سو گزر گیا، چھٹی کے بعد میں گھر آ گئی، تھوڑا بہت کھانا کھایا اور سو گئی۔ میں بہت دیر تک سوئی، عام طور پر ماں اُٹھا دیا کرتی تھی مگر آج ماں نے نہیں اٹھایا، ماں گھر میں بھی نہیں تھی۔ میرے اٹھنے کے کافی دیر بعد آئی۔ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے کچھ کہا، تھوڑی دیر میں بابا آ گئے اور حجرے کی باتیں کرنے لگے انہیں تو گھر میں پھیلی ہوئی خاموشی کی بھی کانوں کان خبر نہیں تھی۔ بابا ایسے ہی تھے۔ ماں کی آنکھوں سے دیکھتے، ماں کی زبان بولتے تھے، یہ سب کچھ وہ سوچ سمجھ کر یا جان بوجھ کر نہیں کرتے تھے بلکہ مزاجاً ایسے ہی تھے ان کو کسی بات کی تفصیل کبھی پتہ نہیں ہوتی تھی۔ انہیں قطعاً اندازہ نہیں ہُوا کہ ماں غیر معمولی طور پر خاموش رہتی ہے یا میرے اندر کوئی تبدیلی آ گئی ہے۔ میں سکول سے آتی تو اکثر ماں گھر میں نہ ہوتی مگر وہ شام کو بابا کے آنے سے پہلے گھر آ جاتی، میرا منہ ہی نہیں کھلتا تھا کہ میں ماں سے کچھ پوچھتی، ہم دونوں کا رشتہ نجانے کیوں گونگا ہو گیا تھا۔ ایک ہفتہ ایسے ہی گزر گیا مگر پھر بہت جلد بات سمجھ میں آ گئی۔ ہمارے ہاں جمعہ کو سکول کی چھٹی ہوتی تھی۔ ہفتے کو میں سکول جانے کیلئے تیار ہو کر گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ ماں نے چھوٹی بہن سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج تم اکیلی چلی جاؤ۔ میں بہت ڈر محسوس کر رہی تھی۔ ماں نے منہ پھیر کر قدرے بے رُخی سے کہا کہ تمہیں ایک دوسرے سکول لے کر جائیں گے، بہت اچھا سکول ہے۔ میں حیران رہ گئی۔ کون سا دوسرا سکول میں نے حیرت سے پوچھا۔ بابا بولے کہ تمہاری ماں نے تمہاری اچھی تعلیم کے لئے کوئی دوسرا سکول ڈھونڈا ہے۔ تمہارے ماموں کی بیٹی بھی تو اُسی میں پڑھتی ہے۔ مگر ماما کی بیٹی تو پشاور کے سکول میں پڑھتی ہے۔ ہاں تو کیا ہُوا کیا ہماری بیٹی شہر کے اچھے سکول میں نہیں پڑھ سکتی۔ بابا نے تسلی دی۔ اگر کوئی مہینہ بھر پہلے یہ فیصلہ ہُوا ہوتا تو میں شاید خوشی کے مارے ناچنے لگتی مگر میرے لئے اچھا یا بُرا سکول کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ ماں کا منصوبہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، میں یہی سمجھی کہ وہ مجھے گاؤں سے دور رکھنا چاہتی ہے تاکہ میں پڑھ لکھ کر استانی بن جاؤں، بابا تو یہی کہہ رہے تھے، مگر میرا دل کچھ عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے اپنے دل کی بات پر پورا یقین تھا مگر کب اور کیسے، کی خبر مجھے نہیں تھی۔ میرا کوئی راز دار بھی نہیں تھا۔ اقبال کے آنے سے پہلے بابا سے کچھ کہنے کی ہمت میرے اندر نہیں تھی ویسے بھی اقبال ایک مہینے کے اندر اندر آ جائے گا۔ پھر میں بھی بابا سے اپنے دل کی بات کہہ سکوں گی۔ اس وقت ماں کی مخالفت مول لینا مناسب نہیں۔ آخر میں کیا کہوں؟ اتنے میں دروازے پر گاڑی آ کر رُکی۔ میرے ماموں اور ممانی اور ان کی بیٹی صفیہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے، بابا ماں اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں بہت اُداس تھی مگر کس سے کہتی، پشاور آ گیا اور گاڑی بیگم شہاب الدین ہاسٹل کے سامنے رُکی۔ صفیہ یہاں رہتی تھی، سکول سامنے تھا۔ مجھے بھی یہاں داخل کروا دیا گیا۔ مجھے میرا کمرہ دکھا دیا گیا ایک اور لڑکی یہاں رہتی تھی۔ سب لوگ ہاسٹل کے انتظامات کی تعریف کر رہے تھے اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بابا بڑے آرام سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ماں نے ایک بار بھی مجھ سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کی تھی بس مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا تھا۔ میں تو خود سے اس گھر سے نکلنا چاہتی تھی مگر اقبال کے ساتھ۔ شاید ماں کو یہ سب پسند نہیں تھا۔ شاید ماں نے مجھے بڑی خاموشی سے سزا دی تھی۔ شاید ماں نے باپ کے غصے

اور بدنامی سے بچالیا ہو مجھے۔مگر دل بے چین تھا۔کوئی بات دل کو نہیں لگ رہی تھی۔ایک عجیب سی بے بسی تھی۔کوئی دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔ کیسے کیسے خیالات دل میں آ رہے تھے۔ایک اندیشہ بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ کیا یہ ماں کا آخری پروگرام ہے یا ابھی ان کے دل میں کچھ اور بھی ہے، مجھے لگتا تھا کہ ابھی ان کے دل میں کچھ اور بھی ہے، کیا ہے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا۔میرا رو رو کر بُرا حال تھا۔کمرے میں دوسری لڑکی کا نام ثمینہ تھا، اس نے اتنی باتیں کیں کہ مجھے کم از کم تھوڑی دیر کیلئے رونا بھول گیا۔ثمینہ کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی کیونکہ ثمینہ کی ماں فوت ہوگئی تھی۔ثمینہ کا باپ بیٹی کو سوتیلی ماں سے اور اپنے گھر کو جھگڑوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔وہ اس شام اسے ملنے آیا۔بہت سا پھل فروٹ بھی لایا۔مجھ سے بھی بہت اچھی اچھی باتیں کیں۔میری آنکھیں سرخ تھیں۔ثمینہ کے باپ نے کہا کہ ایک ہفتہ رہ لو۔اگر بالکل دل نہ لگے تو میں خود تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا اور تمہارے بابا کو بھی سمجھا دوں گا کہ وہ تمہیں زبردستی یہاں داخل نہ کریں۔ثمینہ کے باپ نے کوٹ پتلون پہنا ہُوا تھا اس کی باتیں شہری افسروں کی طرح تھیں کیونکہ وہ کسی دفتر کا افسر تھا۔مجھے بڑی تسلی ہوئی۔ایک اُمید نظر آنے لگی اور کچھ تھوڑا بہت آزادی کا احساس ہُوا۔مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ماں مجھے کسی پنجرے میں بند کر کے چلی گئی ہے اور میں اس میں زندگی بھر کیلئے قید ہوگئی ہوں۔مگر ثمینہ کے والد کی بات نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ابھی تو اقبال ویسے بھی ایک مہینے تک بابا سے کچھ نہیں کہہ پائے گا۔ کیوں نہ میں جیسے تیسے ایک ماہ گزار لوں۔پھر میں ثمینہ سے کہوں گی کہ مجھے گھر پہنچا دیا جائے۔میں نے سوچا کہ ثمینہ کا والد انکار تو نہیں کرے گا۔اس نے خود ہی تو کہا ہے۔یہ سوچ کر ذرا تسلی ہوئی۔تسلی ہوئی تو بھوک بھی لگی۔کھانے کی گھنٹی بہت پہلے بجی تھی مگر ہم نے توجہ نہیں دی تھی۔ ثمینہ نے اپنے والد کی لائی ہوئی چیزوں میں سے مجھے بھی بہت سی چیزیں دیں۔میں نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے اور باتیں کرتے کرتے نجانے کب سو گئے۔صبح نئی کلاس دیکھی، نیا سکول، شہر کی لڑکیوں کے نئے نئے طور طریقے۔ہاسٹل کی زندگی جو میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی۔کھانا الگ، کھانے کے طریقے الگ، کپڑے الگ، بول چال کا انداز الگ، میرے لیے سب کچھ انوکھا تھا۔مگر مجھے کیا، مجھے تو مارے باندھے ایک مہینہ گزارنا تھا۔میں تو جیسے اپنی دنیا میں مگن تھی مجھے تو بس ایک بات کی فکر تھی کہ اگر اقبال کو اچانک چکر لگانے کا موقعہ ملا اور وہ یونہی ہمارے گھر کے چکر لگاتا رہا تو اسے کون بتائے گا کہ میں کہاں ہوں، اور کیوں ہوں اور میں نے اسے کیوں نہیں بتایا۔پھر اُسے کون بتائے گا کہ مجھے تو خود بھی نہیں پتا تھا۔مجھے اندازہ تھا کہ اقبال کا غصہ کتنا تیز تھا۔اس کی کنپٹیاں بہت جلد جلنے لگتی تھیں۔وہ مجھے ڈھونڈے گا۔یہ مجھے اچھا لگ رہا تھا مگر وہ مجھے نہیں پائے گا تو کیا سوچے گا۔یہ مجھے بہت برا لگ رہا تھا مگر میں کیا کرتی۔اگر ابھی سے گھر جاتی ہوں تو کہیں ماں دوبارہ نہ لے آئے۔بس یہ سوچ کر میں نے اسی ہاسٹل میں ایک مہینہ گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔میری سوچ میں کسی دوستی وغیرہ کی کوئی وجہ تھی ہی نہیں۔میں کلاس کی آخری سیٹ پر بیٹھی رہتی۔نظریں کتاب پر اور ذہن اقبال کے ساتھ۔وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا جواب آتا تھا مجھے سوچ رہا ہوگا۔آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہا ہوگا، آنے والے دن، جو زیادہ دور نہیں تھے اور مجھے اس کی دلہن بننا تھا۔میں نے جان بوجھ کر اقبال کو کبھی یاد نہیں کیا تھا بس اس کا چہرہ میری نظروں کے سامنے سے نہیں ہٹتا تھا، اس کی باتیں مجھے اپنے گھیرے میں لیے رہتی تھیں، میرے آس پاس اس کے بدن کی خوشبو پھیلی ہوئی ہوتی تھی اور مجھے اس کی آواز سنائی دیتی تھی، وہ میرے ساتھ باتیں کرتا رہتا تھا، فرمائشیں کرتا رہتا تھا، غصہ کرتا رہتا تھا، مجھے نظروں سے دور جانے ہی نہیں دیتا تھا، کچھ کرنے کچھ سوچنے ہی نہیں دیتا تھا۔میرے الگ تھلگ رہنے کے باوجود شہری لڑکیاں مجھ سے ملنا جلنا چاہتی تھیں۔وہ کبھی میرے گورے رنگ کبھی

لمبے سیاہ بالوں کی کبھی بڑی بڑی آنکھوں کی تعریف کیا کرتیں اور میں بس مسکرا کر چپ ہو جاتی۔ مجھے ویسے بھی باتیں کرنا نہیں آتا تھا۔ مجھے باتیں کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کی، چھوٹی سی سوچ کی ایک چھوٹی سی لڑکی، جو ایک چھوٹے سے گھر میں ایک عام سے آدمی کے ساتھ شادی کر کے رہنا چاہتی تھی۔ نہ کوئی لمبا چوڑا پروگرام نہ کوئی لمبی چوڑی سوچ۔ نہ کسی سے دوستی نہ دشمنی۔ اقبال کو بھی میں کہاں جانتی تھی، وہ تو خود میری زندگی میں آیا تھا، جب آ گیا تو میں نے اسے بھی بغیر کسی اعتراض کے قبول کر لیا تھا، اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا کوئی فرمائش نہیں کی تھی، کسی سے کچھ مانگا نہیں دیا تھا، کسی کو کچھ دیا نہیں تھا ماں کا کہنا مانتی تھی۔ کسی کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دی تھی میں نے۔ میرا دل تو بس یہ سوچتا تھا کہ مجھے بھی کوئی تکلیف کیوں دے گا، کوئی میرے ساتھ برا کیوں کرے گا۔ ماں نے بڑی چالاکی سے مجھے ہاسٹل پہنچا دیا تھا مگر اس میں بھی مجھے انہی کی غلطی نظر آتی تھی۔ ماں بے چاری تو مجھے میرے ہی بھلے کے لیے استانی بنانا چاہتی تھی۔ مگر خیر۔ وہ میری بہن کو استانی بنا لے گی اور میں گاؤں کی دوسری بہت ساری لڑکیوں کی طرح اپنے گھر کی ہو جاؤں گی۔ ماں کو اندازہ ہو گیا کہ اقبال اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اگر ماں مجھ سے پوچھتی تو میں اسے ضرور بتا دیتی مگر ماں نے پوچھا ہی نہیں۔ کاش ماں مجھ سے پوچھ لیتی۔ بس ذرا سا افسوس تھا مجھے اور کچھ بھی نہیں۔ ماں سے ڈھیر ساری ہمدردی بھی تھی۔ بابا ماں سے بہت بڑے ہیں، ماں کے بھی بابا لگتے ہیں۔ ماں کی تینوں بیٹیاں تھیں، ماں کو تایا اور تائی سے ڈر لگتا تھا کہ وہ لوگ جائیداد پر بھی قبضہ کیے ہوئے تھے اور بیٹیاں مانگ کر ماں کو اور بھی دبا لیں گے۔ تائی بہت رعب داب والی عورت تھی۔ ماں کو اپنا بڑھاپا غیر محفوظ معلوم ہوتا تھا، بظاہر ایسا لگتا تھا کہ اگر بابا چل بسے تو ماں کا کہیں ٹھکانہ نہیں، شاید جبھی وہ مجھے استانی بنانا چاہتی تھی شاید ماں کو اپنے منصوبے کے نامکمل رہ جانے کا بہت دکھ ہوا ہو۔ شاید ماں نے یہ چاہا ہو کہ میں شہر میں رہ کر لکھ پڑھ لوں۔ مجھے بابا سے بھی ہمدردی تھی۔ بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے ان کے کندھے بھی جھکے ہوئے تھے کوئی ان کے ساتھ کھڑا ہو کر بوجھ بٹانے والا نہیں تھا، بیٹیوں نے آج یا کل اپنے اپنے گھر کا ہو جانا تھا۔ جن جن پریشانیوں میں ماں مبتلا تھی، بابا بھی ان سے انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں استانی نہیں بنتی تو چھوٹی بہنوں کا بھی کیا پتہ۔ ماں کو اپنی جٹھانی کی غلامی منظور نہیں تھی۔ وہ ان سے ملنے جلنے پر مجبور تھی مگر میرے پاس ماں کے مسائل کا کوئی حل نہیں تھا۔ پھر میں نے خدا سے کب دعا مانگی تھی کہ اقبال میرے راستے میں آ جائے مگر اب تو وہ آ ہی چکا تھا۔ اب تو میں کوئی بات اس کے بغیر سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ مجھے پہلے دن سے اپنی دلہن سمجھتا تھا۔ یہ بات میرے دل و دماغ میں سما گئی تھی۔ اس میں مجھے اپنا کوئی قصور نظر نہیں آتا تھا۔ آج نہیں تو کل میری شادی ہونا تو تھی۔ بعض لڑکیوں کی شادی تو گندے مندے لڑکوں سے بھی تو ہو جاتی ہے۔ اقبال تو گاؤں کا سب سے حسین لڑکا تھا، سوزوکی بھی چلا سکتا تھا، شہر میں نوکری بھی کرتا تھا، اس کے ٹبر میں کوئی نہیں تھا، ایک معذور بڑھیا تھی جو آج مری کل دوسرا دن، میں اس چھوٹے سے گھر میں بہت خوش رہوں گی۔ میرے سادہ و معصوم دل کی دنیا بہت چھوٹی سی تھی بس یہی باتیں دن رات سوچا کرتی تھی۔ اسی طرح کی باتیں سوچ سوچ کر تین ہفتے گزر گئے۔ میرا صبر اور حوصلہ جواب دے گیا تھا اب میں ہر وقت رونے کے بجائے اپنے آنسو اپنے اندر گرانا سیکھ گئی تھی پھر بھی دل بہت بے چین ہوتا تو آنکھیں بھر آتیں۔ چھٹی والے دن ثمینہ کے والد ملنے آئے۔ وہ گاڑی میں آتے تھے۔ بہت سی چیزیں لاتے تھے مگر میں بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر اقبال آیا اور میں گاؤں میں نہ ہوئی تو اس پر کیا گذرے گی۔ ثمینہ کے والد نے مجھے سمجھایا کہ رونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ مجھے گاؤں لے جانے کو تیار ہیں۔ ہم نے ہاسٹل والی استانی سے اجازت لی۔ وہ مجھے ثمینہ کے ساتھ بھیجنے کو تیار نہیں تھی۔ مگر ثمینہ کے والد نے

جانے کیا کیا باتیں کیں اور ہاسٹل والی استانی نے مجھے صرف اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ وہ ہم دونوں کو لے جائیں گے اور ساتھ ہی لے آئیں گے مجھے یہ دیکھ کر بہت پریشانی ہو رہی تھی کہ اگر میرے گھر سے میرے ماں بابا خود نہ لینے آئیں تو مجھے کوئی اور نہیں لے جا سکتا تھا۔ یہ بات سکول والے کاغذات میں لکھی تھی۔ یہ تو ثمینہ کے والد نے نجانے کس کس طرح سے ان کی تسلی کی کہ وہ مجھے بھیجنے پر راضی ہوگئی۔ پھر ویسے بھی ان کا گاؤں ہمارے گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں تو اس وقت ہاسٹل سے باہر نکلنے کے علاوہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی اور اپنے دل کے اندر ٹھانے ہوئے تھی کہ میں تو ہرگز واپس نہیں آؤں گی۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا ہم ثمینہ کے گاؤں پہنچے تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ ثمینہ کا گھر بہت بڑا اور پکا تھا۔ میں نے ثمینہ کی ماں کو ایک نظر دیکھا۔ اچھی گوری چٹی عورت تھی۔ ثمینہ کے باپ نے کہا کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ دونوں لڑکیاں آرام سے سو جائیں تا کہ وہ صبح سویرے اٹھ سکیں۔ ان کو سویرے سویرے کسی سے ملنا تھا۔ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آیا مگر شاید وہ وکیل تھے۔ ہمارے گاؤں میں زمینوں پر اکثر جھگڑے ہوتے تھے اور قتل بھی ہوتے رہتے تھے۔ تو لوگ وکیل کرتے تھے میں نے زندگی میں پہلی بار کوئی وکیل دیکھا تھا۔ مجھے تو بس یہی پتہ تھا کہ وکیل بہت سے پیسے مانگتے تھے۔ مگر یہ اچھے آدمی تھے۔ آخر مجھے ہاسٹل سے نکال کر جو لائے تھے، بس میں نے ان کی بات مان لی اور صبح سویرے اٹھنے کے خیال سے لیٹ گئی۔ ثمینہ کا کمرہ بہت اچھا تھا، اس کی رضائی بھی بالکل نئی تھی۔ مجھے بھی ان لوگوں نے نئی رضائی دی تھی۔ مگر ثمینہ کی ماں ایک بار بھی کمرے میں نہیں آئی تھی۔ ثمینہ نے کہا کہ وہ بھی صبح میرے ساتھ میرے گھر چلے گی۔ میں بہت خوش ہوئی۔ بابا بھی دیکھ لیتا کہ میں کتنے اچھے لوگوں کے ساتھ گھر آئی ہوں۔ میں سو گئی۔ ہم منہ اندھیرے اٹھ گئے اور ہمارے گھر کی طرف چل پڑے، ثمینہ نے دو دن میرے ساتھ ہی گزارنا تھے۔ اس کے والد ہم دونوں کو لینے آتے تو میں آنے سے انکار کر دیتی میں نے تو یہ سوچ رکھا تھا۔ گاڑی ہمارے گاؤں میں پہنچی تو اذان ہو رہی تھی۔ اذان سنتے ہی میرا دل مٹھی میں آ گیا اور وہ ساری باتیں مجھے یاد آنے لگیں جو اقبال نے رات بھر مجھ سے کہیں تھی۔ میں اس گاؤں سے اس گھر سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ہاسٹل سے نکل آئی تھی۔ مگر یہ کیا اس دھندلے سے اندھیرے میں، میں نے کسی کو چادر اوڑھے گھر سے نکلتے دیکھا، یہ تو اقبال تھا میں نے چہرہ نہیں دیکھا کیونکہ چہرہ سردی کی وجہ سے چادر میں چھپا تھا مگر میں تو اقبال کے سائے کو بھی پہچانتی تھی۔ اس گھر میں اس انداز میں، اسی وقت تو وہ صرف مجھ سے ملنے آ سکتا تھا، میرے بغیر وہ اس وقت یہاں کیا کر رہا تھا، میرا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر رہ گیا تھا۔ میں ثمینہ اور اس کے والد کے سامنے کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔ مجھے تھوڑا سا احساس تھا کہ وکیل بہت چالاک ہوتے ہیں۔ میں منہ کھولتی تو کوئی بہت بڑی مصیبت آ جاتی۔ مجھے ایسے ہی خیالات آ رہے تھے۔ بہر حال گاڑی ہمارے گھر کے دروازے کے آگے رکی، دروازہ ابھی کھلا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کون سی سوچ تھی جس کی وجہ سے میں اپنے کمرے میں جانے کے بجائے پہلے بھوسے والے کمرے میں چلی گئی۔ ثمینہ بھی میرے ساتھ تھی۔ بھوسے والے کمرے میں ماں بھوسے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور بالوں اور کپڑوں میں ڈھیر سارا بھوسہ لگا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں جیسے آگ بھر گئی تھی اور میرا سارا وجود جیسے دہک رہا تھا۔ میں ماں کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ ماں بھی ہکا بکا، حیران پریشان سی تھی۔ میرے اس وقت یہاں آنے کا تو کوئی امکان ہی نہیں تھا ماں نے تو سکول کے کاغذوں میں یہی لکھوایا تھا کہ جب تک کوئی گھر کا آدمی یعنی ماں اور بابا نہ آئیں میں وہاں سے نہیں نکل سکتی۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ میں تو شاید وہاں سے ساری عمر نہ نکل پاتی ماں جس طرح چاہتی بابا کو سمجھا ہی لیتی۔ میں زیادہ دیر تک وہاں کیسے کھڑی رہتی ثمینہ میرے ساتھ تھی، میں نے ماں سے کوئی

سوال بھی نہ کیا میں کیا سوال کرتی۔ مجھے پتہ ہے کہ کھلے بالوں میں بھوسہ پھنسا ہوا ہو اور کوئی عورت بھوسے کے ڈھیر پر اس طرح ڈھیر ہو تو اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ مگر اقبال؟ چاہے وہ کسی جال میں پھنس گیا یا ماں نے چال چلی ہو جس کا مجھے یقین تھا، کیونکہ ایک عدد بیٹا ماں کی مجبوری تھی۔ وراثت کے لیے بھی اور طعنوں سے نجات پانے کے لیے۔ لوگ کھلم کھلا بابا کی ادھیڑ عمری کا مذاق اڑاتے۔ مگر اگر آپ کتے کو ہانڈی میں منہ ڈالے دیکھ لیں تو وہ سالن نہیں کھا سکتے، پھر کتے کی ذات کو کوسنے کا فائدہ ہوسکتا ہے نہ کتے کی جان لینے کا۔ آپ کو بھوکا رہنا ہی ہوتا ہے میں اقبال سے ملی بھی تو کیا کروں گی؟ کیا کہوں گی، میں اسے اپنی آنکھوں سے چوروں کی طرح گھر سے نکلتے دیکھ چکی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے ملنے آیا ہوگا اور شاید ماں کے منہ میں پانی آ گیا ہو۔ انہوں نے اپنی ضرورت پوری ہونے کا یہ موقعہ نہ گنوایا ہو۔ میں اگر سچ بولتی تو کون یقین کرتا، اگر بابا یقین کرتے تو انہیں پھر ماں کو گولی مارنا پڑتی ایسے میں دونوں چھوٹی بہنوں کے چہرے میرے سامنے آ جاتے، بابا بھی تو جیل جاتا۔ ان سب باتوں نے میرا منہ بند کر دیا تھا۔ ویسے بھی میں بابا سے کیا کہتی۔ جب ماں کا پاؤں بھاری ہوا تو بابا کی حالت دیکھنے والی تھی وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ماں ہر وقت اتراتی رہتی تھی اور بابا اس کی ہر بات مانا کرتا تھا۔ اور میں یہ سوچتی رہتی تھی کہ اگر میرا اور اقبال کا سامنا ہو گیا تو میں کیا کروں گی اور وہ کیا کہے گا۔ کیا میں بتا سکوں گی کہ میں نے اس صبح اسے دیکھ لیا تھا۔ کیا وہ اعتراف کر سکے گا کہ کیا ہوا تھا پھر بھی دل چاہتا تھا کہ وہ کوئی صفائی پیش کرے۔ اپنی بے گناہی کا رونا روئے، میں قبول نہ بھی کروں تو بھی وہ اپنے آپ کو میرے قدموں میں ڈال دے۔ شاید وہ میرا مجرم ہی نہ ہو۔ مگر پھر بھی اسے معاف کرنے سے کیا ہوگا؟ کیا میں اسے قبول کر پاؤں گی۔ کیا ماں یہ رشتہ ہونے دے گی، بے شمار سوالات دماغ میں آتے اور جواب کسی کا بھی نہ ملتا کیا اس دنیا میں کوئی اور ایسا بے بس ہوگا۔ اقبال کی بے گناہی کو بھی معاف کرنا اور اس سے ملنے کی کوشش کرنا میرے بس میں نہیں تھا میں ڈر رہی تھی کہ وہ سچ بول دے گا، اگر اس نے سچ بولا تو بات پورے گاؤں میں پھیل جائے گی۔ مگر سوچوں میں ماں بھی تو مبتلا تھی۔ وہ بابا سے ہر وقت کچھ کہتی رہتی تھی میں ہاسٹل چلی گئی تو مجھے اطلاع ملی کہ حجرے میں جوئے ہونے کی اطلاع پر پولیس نے ریڈ کیا تھا اور اقبال جو وہاں موجود تھا، پولیس مقابلے میں مارا گیا، ابھی پہنچا ہی تھا کہ مارا گیا اقبال کی پولیس مقابلے والی موت نے ہر گتھی سلجھا دی تھی۔ میں نے ہاتھ میں پڑی ہوئی دو چوڑیاں چپکے سے توڑ دیں اور آنسو پونچھ لیے میں کسی اور بیوہ کی طرح بین تو نہیں کر سکتی تھی، آخر میرا اس سے رشتہ ہی کیا تھا۔

میرے پاس اب پڑھائی میں دلچسپی لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے آج پہلی مرتبہ سنجیدگی سے سوچا کہ استانی بننے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ دنیاداری کے لیے عید، بقرعید پر چلی بھی جاتی تو الٹے پاؤں واپس آ جاتی۔ اب میں لیڈی گرفتھ ہائی سکول میں آ چکی تھی اور اس ہاسٹل میں تھی۔ میٹرک کے بعد یہ ٹھکانہ بھی گیا اور میں نے ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا، یہاں کا ہاسٹل کالج سے ملحق تھا۔ سنا ہے کچھ زخم یا کچھ لوگوں کے زخم وقت کے ساتھ مندمل ہو جاتے ہیں۔ میرا تو ہر لمحہ جو میری عمر بڑھا رہا تھا، زندگی گھٹا رہا تھا۔ ہر کتاب کے ہر صفحے پر اقبال کی تصویر تھی میں ہر وقت اس سے باتیں کیا کرتی تھی۔ میرے گاؤں کی دو تین لڑکیاں اور بھی تھیں یہاں۔ مجھے بتایا گیا کہ بابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ دو تین بار ڈاکٹر گھر بھی آیا تھا۔ میں گھر چلی گئی۔ وہ گھر دیکھنا اچھا لگتا تھا، بہنوں سے ملنے کو بھی دل چاہتا تھا۔ گاؤں کے گلی کوچے یاد آتے تھے۔ ماں کا بیٹا اب کافی بڑا ہو گیا تھا۔ چلتا پھرتا اقبال معلوم ہوتا تھا۔ بات کرنے کا انداز بھی وہی۔ مگر وہ مجھے آپا کہتا تو دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ وہ مجھے ماں کہے۔ ہے نا بے وقوفی کی بات۔ ایسی بے وقوفی کی باتیں میری زندگی میں بے شمار تھیں

وقت گزرتا گیا اب میں گریجوئٹ ہونے والی تھی۔ بابا مجھے ملنے آئے تو بہت کمزور لگ رہے تھے۔ وہ مجھ سے خاص طور پر یہ کہنے آئے تھے کہ اس بار ذرا زیادہ چھٹیاں لے کر آؤں، میں نے بابا کو بتایا کہ اب تو امتحانوں کے بعد ہی آؤں گی کافی وقت ہوگا۔ دونوں بہنوں کے رشتے ہونے والے تھے میں گھر پہنچی تو اماں زور زور سے رونے لگیں، ہمیشہ تو آنکھیں سوکھی سوکھی پونچھ لیا کرتی تھیں۔ ہم دونوں نے ایک زمانے سے ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملائیں تھیں اماں کے رونے کی آواز سن کر تایا اور تائی دوڑے دوڑے آ گئے کہ کہیں ابا کی طبیعت تو خراب نہیں۔ اماں نے تائی کو دیکھ کر با آوازِ بلند کہنا شروع کر دیا کہ آج کل کے لوگوں کی نیت میں فرق آ چکا ہے۔ رشتے دار اپنے خاندان کی خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکیاں چھوڑ کر باہر رشتے کرتے ہیں۔ تائی نے ماں کا مطلب سمجھ لیا اور فوراً جواب دیا کہ انکار سے ڈر جو لگتا ہے۔ پڑھی لکھی شہری لڑکیاں تو شوہر بھی شہری چاہیں گی۔ ارے نہیں۔ ماں اترا کر بولی ہماری شہزادی ایسی نہیں وہ تو اپنے باپ کی آنکھوں کے اشارے پر چلتی ہے۔ بابا کا چہرہ یہ بات سن کر کھل گیا۔ میں نے بھی اپنی اڑتی رنگت پر قابو پا لیا تھا یہ میرا ہی ذکر تھا۔ ماں جو ٹھان لیتی ہے وہ کر گزرتی ہے۔ اب وہ چھوٹی بہنوں کے رشتے سے پہلے میرا رشتہ کرنا ضروری سمجھ رہی تھی چاہے تایا کے گھر ہی کیوں نہ ہو۔ کہیں اور شاید میں منع کر دوں یہ سوچ کر، ابا کی بیماری کے دوران خاص طور پر بلوایا اور یہ سین کھڑا کر دیا۔ میں ماں کو ٹوک نہ سکی۔ وہ میری فرمانبرداری کے قصے سنانے لگی اور تائی کو بتانے لگی کہ میں بابا کی کتنی لاڈلی ہوں اور وہ مجھے اپنے سے دور نہیں کر سکتے۔ میں اتنے دنوں سے اکیلے سسک رہی تھی یا شاید روتے سسکتے تھک گئی تھی۔ میری اندر وہ حوصلہ ہی نہیں بچا تھا کہ موثر طریقے سے انکار کرتی۔ میں کمرے میں چلی گئی اور تکیے میں اپنے سارے راز انڈیل دیئے۔ ماں نے اس بات کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ مجھے اپنی خوشی اتنی عزیز نہیں جتنا کہ بابا کی ہے۔ اور بابا کی خوشی اس میں ہے کہ ان کے بھائی کے گھر میرا رشتہ ہو جائے۔ اگلے دن تایا کے گھر سے جوڑا اور مٹھائی آ گئی اور حجرے میں دعائے خیر بھی ہوگئی ماں کی کامیابی دیکھنے والی تھی۔ اب وہ بڑی سہولت سے دوسری بہنوں کو رخصت کر سکتی تھی۔ اس کا بیٹا اب تقریباً جوان تھا میں استانی بننے والی تھی اور اللہ جانے کیا کیا ہونے والا تھا۔ کیونکہ دونوں خاندانوں میں رشتہ ہو رہا تھا۔ باتیں سن سن کر اندازہ ہو رہا تھا کہ بہت ہنگامہ ہوگا۔ ماں بہت مصروف اور اہم بنی ہوئی تھی۔ بابا اس کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سراہ رہے تھے، میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ماں جو کچھ کہتی میں بس ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھنے لگتی۔ میں کیا کہتی۔ اتنے میں دو گولیاں ایک ساتھ سنائی دی۔ آواز بالکل قریب سے آئی تھی سب باہر بھاگے۔ ماں سر کو دونوں ہاتھوں سے پیٹ رہی تھی۔ ادلے بدلے کے یہ واقعات روز کا معمول تھے۔ کسی نے تایا کے بیٹے منصور سے کوئی بدلہ لیا تھا۔ یہ وہی منصور ہے جس سے میری شادی ہونے والی تھی۔ جب اقبال حجرے میں پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا، میرے کان میں تقریباً ساری باتیں پڑ چکی تھیں۔ میں خوب سمجھ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہوا۔ بابا نے پہلے سے ہی کسی پولیس والے کی مٹھی گرم کر دی تھی۔ جب مجھے ماں کے گھر بیٹا ہونے کی خوشخبری ملی تھی تو میرے دل پر بہت زور کی چوٹ لگی تھی۔ نہ اقبال کسی سے کچھ کہنے کے لیے زندہ رہا، نہ اس کی معذور ماں زیادہ دن تک زندگی کا بوجھ برداشت کر سکی اور نہ ہی میں کچھ کر سکی۔ کرنا تو دور کی بات کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ البتہ اپنے حسابوں بڑا تیر مارا اور بابا سے با آواز بلند کہا کہ ابا اس بچے کا نام اقبال رکھ دو۔ بابا نے حامی بھر لی تھی ماں نے محسوس کر لیا کہ میں نے اسے بھائی نہیں کہا تھا۔ اگر کوئی اندھا بھی چھو کر دیکھتا تو اسے اقبال کا ہم شکل ضرور کہتا۔ یہ سمجھ کر ہی ماں نے حجرے میں پولیس مقابلے والا ڈرامہ کروایا تھا۔ ہاں اس وقت ماں کے ہاتھوں میں اقبال کی لاش تھی۔ کسی اور پر چلائی گئی گولیاں، اقبال کے سینے کو چیر گئی تھیں۔

◆◆◆

بے بس.....

عزیز جبران انصاری

ناکام آرزوئیں پامال حسرتیں ہیں
تیرے جہاں کی ہم پر کیا کیا عنایتیں ہیں

بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ وہ نصف گھنٹے سے بس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بے تاب نگاہیں بار بار سنیما والی سڑک کی طرف اٹھتیں اور سڑک کے نشیب و فراز سے الجھتی ہوئی سنیما کی دیواروں سے ٹکرا کر مایوسی کا ایک نیا زخم کھا کر پلٹ آتیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر قریب کھڑے ہوئے نوجوان سے وقت پوچھا۔ نوجوان نے نظر بھر کر اس مفلوک الحال شخص کو دیکھا اور کہا ''ساڑھے آٹھ''۔

''ساڑھے آٹھ'' اس نے تیزی سے زیرلب دُہرایا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا ایک سایہ لہرا کر رہ گیا اور نگاہیں ایک بار پھر سنیما والی سڑک کی طرف اٹھ گئیں۔ آنکھوں میں بے بسی کے جھلملاتے آنسوؤں کی قوسِ قُزح میں اسے دو بسوں کے ہیولے دکھائی دیے تو چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پھر یوں لگا جیسے اس کے بدن میں کسی نے پارہ بھر دیا ہو وہ اسٹاپ سے چند قدم آگے بڑھ آیا۔ وہ یوں چوکنا ہو گیا تھا جیسے شکاری شکار کو دیکھ کر ہوشیار ہو جاتا ہے کہ موقع پاتے ہی چھاپ بیٹھے گا لیکن.....لیکن یہ کیا؟ دونوں بسیں تو 'زن' سے نکل گئیں۔ اسٹاپ پر کھڑے ہوئے افراد حسرت سے ان بسوں کی اڑتی ہوئی گرد کو تک رہے تھے۔ لیکن اس کی حالت سب سے زیادہ دگرگوں تھی۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت سب سے زیادہ نمایاں تھی....

وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والا ایک قلم کار تھا۔ قلم کار جو عموماً خواب و خیال کی دنیا کے باسی ہوتے ہیں لیکن اسے نہ تو خوب صورت خوابوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی وہ تصوراتی گھروندے بنانے کا عادی تھا۔ اسے کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔ وہ برسرِ روزگار تھا، اس کا اپنا چھوٹا سا پُرسکون گھر تھا۔ محبت کرنے والی بیوی اور قلب و نظر کو راحت بخشنے والے مسکراتے کھلکھلاتے معصوم بچّے اور پُرخلوص بے لوث دوست۔ وہ اپنی زندگی میں کسی قسم کا کوئی خلا محسوس نہیں کر رہا تھا لیکن اچانک ایک دن اسے محسوس ہوا جیسے زندگی کی عمارت میں سے کہیں سے کچھ اینٹیں سرک گئی ہیں اور پھر وہ نامحسوس شگاف کچھ دنوں کے بعد بہت واضح نظر آنے لگا۔ اس کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بے لوث اور سچّے دوست ایک ایک کر کے بہتر مستقبل کی خاطر سمندر نگر جا بسے تھے۔ وہ دوست جن کے ساتھ اس نے زندگی کا ایک طویل اور خوب صورت وقت گزارا تھا۔ اس نے اب تک دوستوں ہی کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھا تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ اپنے آپ کو

بالکل تنہا محسوس کرتا، ہر وقت اداس رہتا کسی کام میں اس کا دل نہ لگتا۔اس کے گھر والے اسے اداس دیکھ کر پریشان ہوتے وہ خود بھی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا لیکن دوستوں کی جدائی کا زخم بھرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔لوگ کہتے ہیں کہ وقت ہر گھاؤ بھر دیتا ہے۔ممکن ہے وقت کا مرہم اس فراق کے زخم کو بھی مندمل کر دیتا مگر سمندر نگر جا کر بھی اس کے دوستوں نے اسے فراموش نہیں کیا تھا۔وہ مسلسل اسے خطوط لکھتے رہے اور ہر خط میں اسے اپنے پاس بلانے اور بہتر مستقبل کی ضمانت دینے کا وعدہ کرتے تھے اور جب وہ اپنے واقف کاروں سے اپنے ان سمندر نگر کے دوستوں کی پُر خلوص دوستی اور اپنائیت کا ذکر کرتا تو اس کے جاننے والے حیرت سے کہتے ''تعجب ہے کہ تمھارے دوستوں پر سمندر کے کھارنے کوئی اثر نہیں کیا ورنہ عموماً دیکھنے اور سننے میں یہی آیا ہے کہ سمندر کے کھاری پانی نے وہاں کے باسیوں سے محبت کی مٹھاس چھین لی ہے'' تب وہ بڑے فخر سے کہتا اسے اپنے دوستوں پر ناز ہے۔

اب اسے دوستوں کے تقاضوں کی شدت کہیے یا مہنگائی کا عفریت یا بچوں کے بہتر تعلیم و تربیت کا خواب، کچھ بھی سہی بالآخر اس نے بھی سمندر نگر جانے کا فیصلہ کر لیا۔عزیز و اقارب، بھائی بہنوں نے بہت روکا لیکن جذبات و احساسات کا پروردہ یہ قلم کار دوستی کی زنجیروں میں جکڑا کشاں کشاں عروس البلاد آ ہی گیا۔مگر جب وہ یہاں پہنچا تو اُسے محسوس ہوا کہ دوستی کے لفظوں کی مٹھاس کو واقعی سمندر کا کھار چاٹ چکا تھا۔خلوص و محبت کے الفاظ بے معنی ہو چکے تھے۔یہاں آ کر اسے احساس ہوا کہ امید کا یہ تار کتنا بودا تھا۔بہتر مستقبل فقط ایک سہانا خواب تھا۔خواب جب بکھرا تو معلوم ہوا کہ وہ جسے حسین و شوخ رنگ سمجھ رہا تھا وہ تو غم و آلام کا دہکتا ہوا لاوا تھا۔یہ لاوا جب اس کے گرد پھیلا تب اسے اس کی شدید حدّت کا ادراک ہوا، خوابوں کا حسین تاج محل تلخ حقیقتوں سے ٹکرا کر مسمار ہوا اور بادِ سموم کے تھپیڑوں نے جب اس کے بدن کو جھلسا کر بے سائباں ہونے کا احساس دلایا تب اس نے جانا کہ خلوص و مہر و وفا کے تمام سایہ دار اشجار اس کی اپنی ہی ذات کے حصار میں تھے۔جب وہ خود فریبی کے اس حصار سے باہر نکلا تو بالکل تنہا تھا۔تا حدِّ نظر اس کے سامنے تپتا ہوا صحرا یا اس کے تھکا دینے والے سراب تھے اور وہ ان سرابوں کے پیچھے گزشتہ دس مہینوں سے بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔کیا تشنہ لب نہیں جانتے کہ سرابوں کی حقیقت کیا ہے۔یقیناً وہ جانتے بوجھتے ہوئے دیوانہ وار ان کے پیچھے دوڑتے ہیں کہ یہی سراب زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں اگر تشنہ لبوں سے سرابوں کا سہارا بھی چھین لیا جائے تو وہ زندہ کیسے رہ سکتے ہیں؟ یہی سراب تو انھیں سہارا دیتے ہیں اور وہ بھی جانتے بوجھتے ہوئے ان سرابوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔دوڑتے دوڑتے جب نڈھال ہو کر صحرا کے تپتے ہوئے سینے سے ہم آغوش ہوتا تب اسے احساس ہوتا کہ اس کے اپنے سینے سے زیادہ تپش تو صحرا کا سینہ سمیٹے ہوئے ہے۔تب وہ گھبرا کر لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوتا اور پھر دوڑنے لگتا اسی دوڑ دھوپ میں کل اسے پھر امید کا ایک نخلستان دکھائی دیا جس کے رکھوالوں کو قلم کی نہیں بازوؤں کی قوت کی ضرورت تھی اور بالآخر اس کے نحیف بازوؤں پر بھروسا کر لیا گیا تھا۔اسے ایک فیکٹری میں مزدوروں کی صف میں جگہ مل گئی تھی اور آج جب وہ پہلی بار ملازمت کے خوش کُن تصور میں مگن گھر سے نکلا تھا تو اس کی بیوی نے خوش ہو کر پوچھا تھا کہ کیا وہ میٹرنٹی ہوم ہو آئے کیوں کہ نئے مہمان کی آمد قریب ہے۔

''ہاں کیوں نہیں، لیکن بس میں جانے کی بجائے رکشے سے جانا اور یہ فکر نہ کرنا کہ دس روپے کا یہ نوٹ آخری نوٹ ہے'' اس نے ہنستے ہوئے اپنی بیوی کی ہتھیلی پر دس روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا تھا۔''مَیں کچھ روپے ایڈوانس لے آؤں گا۔'' پھر اس نے اپنے بڑے لڑکے سجاد کو پاس بلا کر کہا،

''بیٹے آج تم اسکول کی بجائے اپنی امّی کے ساتھ اسپتال چلے جانا۔'' اور خود بس اسٹاپ پر آ گیا تھا لیکن بس نے اسے بے بس

کر دیا تھا۔آدھے گھنٹے سے زیادہ انتظار کے باوجود جب بس اس کے ہاتھ نہ آئی تو تقدیر کو کوستا ہوا گھر کی طرف مڑ گیا۔ چلتے چلتے سڑک کے آخری نکّڑ پر پہنچ کر اس نے ایک مرتبہ پھر امید وبیم کی کیفیت میں حسرت بھری نگاہوں سے سنیما والی سڑک کی طرف مڑ کر دیکھا، یا سیت کے دھندلکوں میں آس کا ہیولہ دکھائی دیا تو اس کے قدم ایک بار پھر رُک گئے۔ وہ اسٹاپ کی طرف تیزی سے دوڑا اور پھر یوں لگا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو وہ بڑی پھرتی سے اُچھلا تھا دوسرے ہی لمحے میں وہ بندر کی طرح فٹ بورڈ کی سلاخ پر جھول رہا تھا۔ بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سڑک کے نشیب وفراز اتنے زور آور تھے کہ وہ بس اور مسافروں دونوں سے اپنا خراج وصول کر رہے تھے۔ بس کے یہ دھچکے مسافروں کو لڑانے پر اُکسا رہے تھے لیکن کسی کی طبیعت میں اُبال نہیں آیا تھا۔ ہر ایک اپنی منزل کی دھن میں مگن تھا اگر کسی نوجوان نے دھکا کھا کر گرمی دکھانے کی کوشش بھی کی تو دوسرے لوگوں نے یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا ''بھائی گزارا کر لو صبح کا ٹیم ہے دو چار منٹ کا سفر ہے۔'' اور پھر کنڈکٹر کی دل خوش کُن آواز ''ڈبل ہے استاد'' میں وہ گرم لہو بھی اس خوف سے سرد پڑ جاتا کہ کہیں منزل ہی سے ہاتھ نہ دھونے پڑ جائیں۔ بس میں اس کے علاوہ سب مسرور دکھائی دے رہے تھے لیکن اس کے لیے یہ دھچکے ناقابل برداشت تھے۔ فٹ بورڈ کی سلاخ پر وہ تنہا ہی نہیں لٹکا ہوا تھا اس کے ساتھ کئی اور بھی تھے اور اس سے بھی زیادہ بُری حالت میں تھے لیکن ان کے چہروں پر کسی کرب کی علامت نہیں تھی بلکہ وہ تو ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے مگر وہ کسی نئے پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اگلے اسٹاپ پر جب نیا ریلا آیا تو وہ اس ریلے میں بہتا ہوا بس کے اندر جا پہنچا لیکن اس طرح کہ کئی لمحوں تک بس کی زمین اس کے پیروں کو نصیب نہیں ہو سکی وہ لوگوں کے درمیان ہی معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ چھوٹے قد کی قباحت کا احساس اِس وقت اُسے بہت شدّت سے ہوا تھا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا صرف تلملا کر رہ گیا جب اس کے قدم بس کے تختے سے لگے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ بس ایک بار پھر ایک اسٹاپ پر رُکی چند مسافر اُترے اور چھے سات مزید ٹھونس دیے گئے۔ بس میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی مگر کنڈکٹر کا دل ابھی نہیں بھرا تھا وہ مسلسل چیخے جا رہا تھا حبیب بنک ، ولیکا، بولٹن.....ٹاور ٹاور...ٹاور ٹاور....اڑے گیٹ چوڑ و بابا...اپنا اپنا پیسہ نکالو...آگے جاؤ آگے جاؤ۔ حبیب بنک....ولیکا۔ ٹاور ٹاور.....

''ٹاور کا بچّہ۔ گاڑی تیز چلاؤ'' کسی دل جلے نے چلاّ کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی دو چار نوجوانوں نے بس کو زور زور سے تھپتھپایا۔

''ارے کون ہے یہ مراثی کا بچّہ؟'' کنڈکٹر غصّے سے چیخا۔

''گاڑی کیوں نہیں چلاتا؟'' کئی زوردار آوازیں ابھریں۔

''بس کروڑے۔ جیادہ جلدی جانا ہے تو رسکا اور ٹیکسی بہوت ہیں ان پر جاؤ'' کنڈکٹر نے جھلاّ کر کہا:''ہاں استاد آرام سے یہ لوگ جتنا جیادہ ڈپ ڈپ کریں گا ام لوگ اتنا ہی سلو چلیں گا۔'' کنڈکٹر نے ڈرائیور سے کہا اور پھر خود ٹاور ٹاور کی گردان کرنے لگا۔ قریب ہی ایک عمر رسیدہ شخص نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا ''تم لوگ کاہے کو بس پیٹ رہے ہو، انھیں اپنی مرضی سے چلنے دو''

''آں دیکھو نہ بابا'' کنڈکٹر نے بڑے میاں کو اپنا ہم نوا دیکھ کر کہا۔ ''ام لوگ کھد پسنجر کا کھیال کرتا ہے۔ ام جانتا ہے آپ لوگوں کو نوکری پر جانا ہوتا ہے۔ لاؤ اپنا اپنا پیسہ نکالو''

''اڑے سوکت پیچھے بس آتا پڑا ہے ڈبل ڈبل'' کنڈکٹر کے کسی چیلے نے ہانک لگائی۔ کنڈکٹر نے دروازے پر لٹکے ہوئے آدمیوں کے سروں سے جھانک کر باہر دیکھا اور زور سے چیخا ''ٹھیک ہے استاد ڈبل ڈبل، کھینچ کے رکھ'' اس کے ساتھ ہی بس کو ایک ہاتھ سے پیٹا بھی تھا۔ اور بس نے جو بھرّ اٹا لیا تو قریبی اسٹاپ پر اُترنے والے بس کو پیٹتے اور چیختے ہی رہ گئے مگر بس ان کے بس میں کہاں

تھی۔اس کا اسٹاپ بھی نکل گیا تھا اور وہ بے بسی سے کنڈکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔آخر کار اس نے روہانسی آواز میں کہا ''بھائی میرا اسٹاپ آپ نے نکال دیا''

''آں آں پہنچ جائے گا دیکتا نئیں ہے کہ پیچھے بس آتا پڑا ہے۔''اور آؤ گیٹ پر ساباس اور آؤ چلو جلدی اترو''اگلے اسٹاپ پر بس کی رفتار معمولی کم ہوئی تو کنڈکٹر نے اسے اترنے کے لیے کہا۔پہلے تو وہ ہچکچایا لیکن جب کنڈکٹر نے ٹھوکا دیا''اڑے بابا ابی اترو نا''تو وہ ہمت کر کے کود گیا لیکن اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکا تھا زمین سے بغلگیر ہوتے ہی وہ اچھل کر یوں کھڑا ہو گیا تھا جیسے زمین میں برقی رَو دوڑ رہی ہو اور اُس نے اُسے اُچھال دیا ہو۔اس نے کھڑے ہو کر کپڑے جھاڑے اور ایک راہ گیر سے ٹائم معلوم کیا اور''سوا نو بجے''سن کر ایک ٹھنڈا سانس بھرا''واہ ری قسمت، پہلے ہی دن یہ تماشا''وہ بڑبڑاتے ہوئے تیزی سے فیکٹری کی دوڑا۔بھاگتے بھاگتے فیکٹری کے گیٹ پر پہنچا تو وہ بند تھا۔اس نے دروازے کو زور زور سے پیٹا تو گیٹ کی کھڑکی کھلی اور بڑی بڑی مونچھوں والے بھاری بھرکم چوکیدار نے اسے گھورتے ہوئے کہا''خوتم کو کس سے ملنا ہے۔''سلام خاں صاحب۔ہم کو ادھر ملازمت ملی ہے یہ کہہ کر وہ تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔فیکٹری کا منیجر جس نے اسے نوکری دی تھی فیکٹری کا معائنہ کر کے واپس آ رہا تھا اسے دیکھتے ہی اُس نے اسے سلام کیا۔منیجر نے جواب دینے کی بجائے نہایت رعونت سے مگر طنزیہ لہجے میں کہا''اچھا تو جناب اب تشریف لائے ہیں۔بھلا کیا وقت ہوا ہے؟''

''سس...سر بس کی وجہ سے.....''

''یہاں تمام ملازم بس ہی سے آتے ہیں ہیلی کاپٹر سے نہیں۔تم جا سکتے ہو۔ہمیں ایسے بے پروا ملازم کی ضرورت نہیں ہے''

''سر آئندہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا''اس نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

''چوکیدار صاحب کو باہر کا راستہ دکھاؤ''منیجر نے غصّے سے کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔

منیجر کے رویّے پر اس کا سارا بدن غصّے سے کانپنے لگا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ناکامیوں اور محرومیوں کے پتھروں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر گیٹ سے باہر نکل گیا۔

◆◆◆

ممتاز شاعر ضیا الرحمٰن ضیاء کی ادب صحافت کا شاہکار

ادبی ڈائجسٹ

شائع ہو گیا ہے

قیمت:-/100 روپے

رابطہ:3-A/504، الرؤف رائل سٹی، گلستانِ جوہر، بلاک-19، کراچی۔75290 (سیل:0321-2957214)

پرانی پوستین

سلمان ڈار

بے جی کو اپنی پوتی سدرہ سے بڑی محبت تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے سدرہ کی اداسی کو مسلسل دیکھ دیکھ کر انھیں اپنی زندگی کے وہ دن یاد آ جاتے تھے جب وہ سدرہ کی عمر کی تھیں۔ ان کا متوّسط طبقے کا خاندان ان کے دادا کی سرپرستی میں بڑی خوشحال زندگی گذار رہا تھا۔ تھوڑے رزق پر بھی یہ سب لوگ بڑے قانع تھے۔ رشتہ داروں اور برادری میں بڑا خلوص تھا۔ ساری برادری اکٹھی ہو جاتی تھی اور اس غم کا احساس بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاتا تھا۔ اپنے سے نچلوں اور حاجت مندوں کی ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ صدقہ و خیرات نکالا جاتا تھا۔ بڑی سیدھی، سادی اور پیاری زندگی تھی۔ لیکن بے جی کے دادا اپنی اولاد کے لیے ہمیشہ فراوانیِ رزق کی دعا مانگا کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ دادا کی دعا قبول بھی ہونے لگی۔ دادا کے بیٹوں میں سے ایک کو باہر کے ملک کا ویزہ مل گیا۔ اس کی دولت سے ایک چراغ روشن ہوا اور پھر دیے سے دیا جلنے لگا۔ کاروبار پھلنے پھولنے لگے، بڑی بڑی نوکریوں تک رسائی ہونے لگی۔ ضرورت سے زیادہ دولت جائیدادوں، کوٹھیوں اور پلاٹوں کی صورت میں محفوظ ہونے لگی اور ساتھ ہی نمائش کا کام بھی دینے لگی۔ لیکن وہ پہلی سی محبت اور خلوص رفتہ رفتہ غائب ہو گیا۔ حقداروں کو ان کا حصہ ملنا بھی اچانک بند ہو گیا۔ ایک ہی برتن میں کھانے والے اتنے فاصلے پر چلے گئے جو بعد میں کبھی پاٹے نہ جا سکے۔

بے جی کا والد اتنے سارے کنبے میں نہ جانے کیسے پہلے جیسا ہی رہ گیا۔ اور نئے بہن بھائیوں کے نئے ماحول میں شامل نہ ہو سکا۔ تایا کے بیٹے سے بے جی کی منگنی ہوئی تھی مگر تایا اور تائی نے ذکر بھی نہ کیا اور بیٹے کو کہیں اپنے جیسوں میں بیاہ دیا اور وہ انتظار ہی کرتی رہ گئیں۔ باقی سب رشتہ دار تو شہر میں بس گئے تھے لیکن بے جی کا والد اپنے بچوں کو لے کر گاؤں واپس آ گیا۔ اور یہاں جو زمین تھی اسے کاشت کرنے لگا۔ کچھ عرصے بعد بے جی کی شادی بھی گاؤں کے ایک معزز خاندان میں ہو گئی۔

پھر بہت عرصہ گذرنے کے بعد جب کہ بے جی خود بھی پوتے پوتیوں والی ہو چکی تھی ان کا ایک چچازاد بھائی انھیں ملنے کے لیے شہر سے گاؤں آیا۔ نہ جانے اسے اتنے برسوں بعد اچانک اس بوڑھی بہن کی یاد کیسے آ گئی تھی۔ بس اتنا پتہ ہے کہ اس کے کنبے کے حالات ان دنوں کچھ اچھے نہ تھے اور وہ کافی پریشان تھا۔ اپنے ساتھ وہ پوتے پوتیوں کو بھی آبائی گاؤں دکھانے لایا تھا۔ سب بچے گاؤں کی زندگی اور اپنے پرکھوں کے مکان کوٹھوں کو کسی عجائب گھر کی طرح دیکھ رہے تھے۔ باقی لوگ تو دو دن بعد واپس چلے گئے مگر ذوہیب ابھی گاؤں ہی میں رہ گیا۔ ان دنوں وہ کالج سے فارغ تھا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر کسی یونیورسٹی میں جانا چاہتا تھا۔

بے جی اتنے عرصے بعد اپنے ایک خونی رشتہ دار کو اتنے قریب دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھیں۔ ذوہیب پہلے ہی شہر کی زندگی سے بیزار اور دوسرے امیر رشتہ داروں کی نمائشی زندگی سے Complex کا شکار تھا۔ لہٰذا گاؤں کی سادہ زندگی کو خوب enjoy کرنے لگا۔ سدرہ

اسے گاؤں کی سیر کراتی اور رشتہ داروں اور سہیلیوں سے ملاتی تھی۔ دونوں کھیت کھیت گھومنے لگے، تتلیاں پکڑنے لگے اور باغوں سے امرود توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ گاؤں کی گلیاں گھومنے اور پگڈنڈیوں کے درمیان آوارہ گردی کرنے کا یہ سلسلہ تب ٹوٹا جب اچانک ذوہیب کو خبر ملی کہ اسے ولایت کی ایک اچھی یونیورسٹی نے انفرمیشن ٹیکنالوجی میں ماسٹرز کرنے کے لیے اسکالرشپ دے دیا ہے۔

ذوہیب جب واپس جانے کے لیے اپنا سامان باندھ رہا تھا تو بڑا اداس اور خاموش تھا۔ بے جی نے اسے پاس بلا کر پیار کیا تو دو آنسو چھلک کر رخساروں پر آ گرے جو اس نے کافی دیر سے روک رکھے تھے۔ ''بے جی میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ضرور واپس آؤں گا۔ آپ کے لیے، آپ سب کے لیے''۔

اور پھر سر نیچا کر کے کہنے لگا ''سدرہ کے لیے بے جی''۔

بے جی اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بولیں ''یہ گھر اور گاؤں تیرا اور تیرے باپ دادا کا ہے۔ میں کیسے ان دروازوں کو تم پر بند کر سکتی ہوں، پر بات یہ ہے بیٹا کہ ہر آدمی بڑا بننے کے بعد پہلے جیسا نہیں رہتا، بدل جاتا ہے۔''

''نہیں بے جی میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔''

''بیٹا انسان بنیادی طور پر اچھا برا کچھ نہیں ہوتا، پر دولت اور کامیابیوں کی آمد سے اس کی پرکھ ہو جاتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ رزق بے شک حلال ہی کیوں نہ ہو اپنے ساتھ بڑی قباحتیں لاتا ہے۔ جب دولت زیادہ نہیں ہوتی تو انسان ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ جسم چاہے ایک دوسرے سے دور ہی ہوں مگر دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ میرے خاندان والے کسی غزنوی کے ایاز ہیں اور میں ایک پرانی پوستین ہوں۔ کیا پتہ کوئی اس پرانی پوستین کو دیکھنے آئے یا نہ آئے۔''

اس روز ذوہیب روتا ہوا گاؤں کے کچے راستے کو وہیں چھوڑ آیا تھا اور سدرہ امی، ابا اور بے جی کے ساتھ اسے جاتا ہوا دور تک کوٹھے پر سے دیکھتی رہی تھی۔ مگر آج ذوہیب کے ہوائی جہاز کو ائیر پورٹ پر اترے پندرہ دن گذر چکے تھے لیکن اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ بے جی اور ان کے سب گھر والے دوسرے رشتہ داروں کی زبانی ہی اس کی خبریں سن رہے تھے۔ پاکستان آتے ہی اسے بڑی بڑی کمپنیوں نے ملازمت کی پیشکش کی تھی اور اس کے ریسرچ پیپر چھپنے کے بعد بہت سی یونیورسٹیاں اس کا ایک دن کا لیکچر سننے کے لیے اسے بھاری رقم آفر کرتی تھیں۔ رشتہ دار اور ملنے والے اپنی لڑکیوں کے رشتے کے لیے اس کے خواہش مند تھے۔

سدرہ دروازوں اور دیواروں کے پیچھے سے کان لگا کر یہ باتیں سنتی رہتی تھی۔ وہ کبھی باہر برآمدے میں جا کر بیٹھ جاتی اور کبھی چھت کا چکر لگا کر دور کھیتوں کو دیکھتی رہتی۔ کھانا کھانے بیٹھتی تو نوالہ بمشکل حلق سے اترتا تھا اور سونے کے لیے لیٹتی تو کروٹیں بدلتے بدلتے یہ وقت آ جاتا کہ باہر درختوں پر چڑیاں بولنے لگتیں۔ اس بے قراری کے باوجود وہ کسی پر کچھ ظاہر نہ کرتی تھی۔ البتہ بے جی کی باتیں پچھلے پندرہ دنوں سے اسے اور اس کے امی ابا کو چبھ رہی تھیں۔

''دولت اور کامیابیاں انسانی زندگی میں کبھی آندھی کی طرح اتنی شدت سے داخل ہوتی ہیں کہ یہ طوفان آدمی کا لباس تک اتار کر لے جاتا ہے اور اسے برہنہ کر دیتا ہے۔ دولت کے طوفانِ بے تمیزی میں آدمی کے اندر باہر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے'' بے جی اپنے بیٹے اور بہو سے یہ باتیں کر رہی تھیں اور سدرہ باورچی خانے میں ادھر ہی کان لگائے کھڑی تھی کہ اب اس کے امی اور ابا اس کی دادی کو کیا جواب دیتے ہیں۔ ''آ جائے گا بے جی ابھی تھوڑے دن تو ہوئے ہیں اسے واپس آئے ہوئے۔'' پہلے بیٹے نے بے جی کے سامنے بولنے کی

جرأت کی۔

''ایسا لڑکا تو نہیں ہے بے جی ہم اس کا انتظار کر لیں گے۔'' ساتھ ہی بہو نے دل کی بات کہہ دی۔

بے جی دونوں کی بات سن کر کہنے لگیں ''مجھے پتہ ہے وہ نہیں آئے گا۔ آگے تمھاری مرضی''۔

اگلے دن صبح سدرہ اٹھی تو آنگن کی دیوار کے قریب سے گذرنے والی بجلی کی تار پر کوّا بیٹھا بول رہا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کوّے کو اچھے شگون کے طور پر دیکھا مگر پھر دل میں سوچا کہ یہ کون سا ہمارے گھر کی دیوار پر بول رہا ہے اور پھر وہی پہلے والی مایوسی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ دن آدھے سے زیادہ گذر گیا مگر کہیں سے کوئی خیر کی خبر نہ آئی۔ دوپہر کے کھانے پر پھر سدرہ کی شادی کا قصہ چھڑ گیا۔ اور اس مرتبہ بھی پہل بے جی نے کی کیونکہ وہ عمر کے تجربے کی بنا پر پوتی کی زندگی کو خراب ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ بے جی بہو سے کہنے لگیں۔ ''تمھاری بہن کب سے اپنے بیٹے کے لیے سدرہ کا تقاضا کرتی ہے تم ہاں کیوں نہیں کر دیتی؟ میری طرف سے تو اجازت ہے۔''

''بے جی اگر کچھ دن اور ذوہیب کا انتظار کر لیا جائے تو''۔ بہو ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''اب انتظار کرنا مناسب نہیں ہے آخر کب تک اسے بٹھائے رکھیں گے''۔ بے جی بولیں۔ بیٹا کہنے لگا ''بے جی اگر آپ کہیں تو میں خود جا کر ایک دفعہ ذوہیب کا پتہ کر آؤں۔''

بے جی نے کہا ''خبردار جو تم وہاں گئے تو۔ میں نے ساری زندگی اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کی ہے اور کبھی کسی سے محبت کی بھیک نہیں مانگی۔'' پھر بہو سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔ ''تم آج ہی جاؤ اور بات پکی کر آؤ''۔ وہ بھی ساس کا غصہ دیکھ کر اٹھ بیٹھی اور بہن کی طرف جانے کی تیاری کرنے لگی۔

سدرہ اندر باہر جانے کنکھیوں سے ماں کو تیار ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کاش کوئی ایسی آفت آ جائے کہ ماں گھر سے باہر نہ جا سکے۔ راستے میں کوئی سیلاب آ جائے یا بڑی تیز بارش کے ساتھ خوب آندھی چلے اور یہ کام ایک روز کے لیے اور ملتوی ہو جائے۔ لیکن جو کام ہونا ہوا سے کون روک سکتا ہے؟ جب ماں باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی تو ان کی زمینوں کا ایک مزارعہ بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے بتایا کہ گاؤں کی سڑک پر ایک بڑی سی موٹر کار آئی ہے جو انھی کے گھر کی طرف آ رہی ہے۔ ابھی وہ اپنی بات کر ہی رہا تھا کہ سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک نوجوان اندر داخل ہوا جسے دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ سدرہ تو اسے دیکھ کر شرما کر اندر چلی گئی۔ ذوہیب سب سے مل کر بے جی کے قدموں میں آ بیٹھا۔

''ارے تو تو ولایت میں رہ کر پہلے سے زیادہ گورا ہو گیا ہے۔'' ذوہیب ہنسنے لگا تو بے جی نے اسے اٹھا کر اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا۔ ''شہر میں سب ٹھیک تو ہیں نا؟''۔ بے جی پوچھنے لگیں۔ ''سب لوگ ٹھیک ہیں۔ ممی ڈیڈی آپ کو سلام کہہ رہے تھے''۔

''وعلیکم السلام۔ تو سنا کب آیا ولایت سے اتنا عرصہ ٹھیک تو رہا نا؟''۔ بے جی پوچھنے لگیں۔

''ابھی کچھ ہی دن ہوئے آیا ہوں۔ واپس آتے ہی بہت مصروف ہو گیا تھا۔ کچھ جگہوں پر ملازمت کی بات چلی رہی تھی ورنہ میں تو ہر روز یہاں آنے کا ارادہ کرتا تھا''۔

''چلو شکر ہے تمہیں میری یاد تو آئی'' بے جی بولیں۔

''بے جی ایک بات بتائیں گی؟'' ذوہیب نے کہا۔

''وہ کیا بیٹا؟'' ''آپ تو یہی سمجھ رہی ہوں گی کہ میں نہیں آؤں گا''۔

بے جی قدرے توقف سے بولیں ''ہاں بیٹا میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ اب تو بڑا آدمی بن گیا ہے اور کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ بلکہ باقیوں کی طرح بھول چکا ہوگا''۔

''بے جی میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے جسم پر چاہے سونے کا سنہری لباس ہی کیوں نہ ہو پر وہ اندر سے ویسے کا ویسا ہی رہے۔ سادہ سا بے جی۔ فقیر سا۔ کبھی کچھ نہ بھولنے والا''۔

بے جی اس کی بات سن کر مسکرانے لگیں تو ذوہیب نے کہا۔''جب پردیس میں رہ کر مجھے ممی ڈیڈی اور اپنے سب لوگوں کی یاد آتی تھی اور بے اختیار ملنے کو جی چاہتا تھا تو میرا دھیان ہمیشہ آپ کی طرف چلا جاتا تھا جنھوں نے زندگی کے اتنے سال اپنے خاندان کے ہوتے ہوئے تنہائی میں گذار دیئے۔ بے جی آپ کا بھی تو دل چاہتا ہوگا اپنوں سے ملنے کو جس طرح میرا پردیس میں رہ کر چاہتا تھا''۔

بے جی کہنے لگیں ''یہ جو اپنا خون ہوتا ہے نا اس کی بڑی کشش ہوتی ہے۔ دل تو بہت چاہتا ہے اپنوں سے ملنے کو مگر عزتِ نفس کی حفاظت محبت کا اظہار کرنے سے روکے رکھتی ہے۔ اور میں نے تو تجھ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے رشتہ دار ایاز ہیں اور میں ایک پرانی پوستین۔ کسی کی مرضی جو اس پرانی پوستین کو دیکھنے آئے یا نہ آئے''۔ بے جی۔ جو اپنی پوستین کو بھول جاتا ہے وہ ایاز ہی نہیں ہوتا''۔''میں تو آج تک یہی سمجھتی رہی کہ مقدر اور کامیابی انسان کو انسان سے جدا کر دیتی ہے۔ پر نہیں بیٹا کچھ ہوتے ہیں تیرے جیسے جو یاد رکھتے ہیں اور کبھی کچھ نہیں بھولتے۔ تو تو ولایت سے بڑی اچھی تعلیم لے کر آیا ہے''۔ بے جی نے کہا۔ ذوہیب بولا''ہاں بے جی یہ باتیں مجھے یورپ کی زندگی نے ہی سکھائی ہیں۔ انسان کو زندگی میں سب سے زیادہ ضرورت اپنے جیسے انسانوں کی ہوتی ہے نا کہ چیزوں کی''۔

بے جی نے ذوہیب کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ باورچی خانے سے چائے کے برتنوں کی کھنکتی ہوئی آوازیں آنے لگیں اور پچھلے کئی روز سے چھائی ہوئی خاموشی ٹوٹ گئی۔

◆◆◆

برصغیر پاک و ہند کے مشہور مجلّہ سہ ماہی ''اسباق''

کی مسلسل اشاعت کا 32 واں سال مکمل

نیا پرچہ چھپ گیا ہے۔

مدیر : نذیر فتح پوری

قیمت -/200 روپے

ملنے کا پتہ : ساہرہ منزل، 230/B/102، وِمان درشن، سنجے پارک، لوہ گاوں روڈ، پونہ مہاراشٹر، انڈیا

(سیل: 0091-982251-6338)

ڈھونگ

زہیرہ سمن علی (بلغراد)

میں گھر میں داخل ہوتو سامنے ہی پیلے رنگ کی چھتری رکھی تھی جس کے کناروں سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر فرش پر چھوٹی چھوٹی ندیاں بنا رہے تھے۔ چھتری کے پاس ہی سرخ جوتے تھے جن کے اردگرد کیچڑ جما ہوا تھا۔ جب سے میں چھٹیوں کے لئے پہاڑ پر آیا تھا وہ ہر دوسرے تیسرے روز یوں آ جاتی تھی، بارش کے ساتھ۔

میں جانتا تھا کہ وہ اندر بڑے کمرے میں صوفے پر بیٹھی آتشدان میں سلگتی لکڑیوں کو دیکھ رہی ہوگی۔

جب بھی آسمان پر سیاہ بادل آتے تو بارش میں وہ ضرور آ جاتی۔ اور اس کی بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ دیکھ کر مجھے غصہ آ جاتا، نجانے کیوں۔ وہ ہمارے قریبی جاننے والوں کی کوئی رشتہ دار تھی اور ان کے پاس کاٹیج میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی اور اب میں اس کا انتظار کرنے لگا تھا، مجھے لگتا تھا کہ اس کی سب چھوٹی چھوٹی میٹھی سی باتیں ایک ڈھونگ سا تھا جو اس نے نجانے کیوں رچا رکھا تھا۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اسے ایک دو بار کلب میں دیکھا تھا جب کے اس کو علم نہیں تھا کہ میں موجود ہوں اور وہ تب بہت مختلف تھی۔ قدرے بیزار اور خاموش سی، جیسے وہ زندگی سے اکتا ہو چکی ہو۔ مگر جب وہ ہمارے گھر آتی تو ہر طرف ایک تپش سی پھیل جاتی۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کی طرف کھچا چلا آتا۔ میں کیا گھر کے سبھی لوگ اس کو پسند کرتے تھے اور اب میں گھر میں داخل ہوتا تھا تو میری نظریں بے اختیار اس کی پیلی چھتری اور لال جوتوں کو ڈھونڈتی تھیں۔

عام طور پر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد چائے پر ضرور ہمارے ساتھ ہوتا تھا مگر آج وہ اکیلی تھی۔ اس کے سامنے چائے کی دو پیالیاں دھری تھیں جن سے سنہری بھاپ اٹھ رہی تھی۔ باورچی اس کے آتے ہی فوراً چائے بنا دیتا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ وہ دنیا کی بہترین چائے بناتا تھا اور وہ یہ سن کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔

مگر آج اس پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آئی۔ میں اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

''آج تم بہت اداس ہو'' میں نے کہا، ''کیا بات ہے؟''

''آج میں یہاں آخری بار آئی ہوں'' وہ بولی۔

میں ٹھٹھک گیا،

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''میں مزید جھوٹ نہیں بولنا چاہتی''

''جھوٹ'' مجھے لگا کہ یہ لفظ میں نے پہلی بار سنا ہو۔

''ہاں میں تمہارے ساتھ، سب کے ساتھ جھوٹ بولتی رہی ہوں۔ میں وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو''

''کیا مطلب؟''

''بس میں چاہتی تھی مجھ سے سب محبت کریں اور یہ محبت حاصل کرنے کے لئے میں ویسی بن جاتی تھی جیسی میرے خیال میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے تمہیں دیکھا تو میرا دل چاہا کہ تم مجھ سے محبت کرو اور مجھے لگا کہ شاید تم ایک ایسی لڑکی سے محبت کرنا چاہتے ہو جسے بارش میں سیر کرنا پسند ہو، جو پانی میں چھپ چھپ کرتی تم سے ملنے کو آئے ادھر ادھر کی الٹی سیدھی باتیں کرے اور بیوقوفانہ سے لطیفوں پر دیر تک ہنستی رہے۔ اور خود بخود ہی میں وہ لڑکی بن گئی۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ لوگوں سے یوں محبت بٹورنا اچھی بات نہیں اور یہ کہ میں جھوٹ بول بول کر تنگ آ گئی ہوں۔''

پھر وہ چلی گئی۔ اگرچہ ہم بعد میں کئی بار ملے میں نے اس پیلی چھتری اور لال جوتوں والی لڑکی کو پھر کبھی نہ دیکھا جسے بارش میں سیر کرنا اچھا لگتا تھا۔

◆◆◆

ماہنامہ **تخلیق** لاہور

تخلیق.....وہ شبنم ہے جو فطرت کی بے ساختگی کی مظہر ہے!

تخلیق.....وہ صبح کا تارا ہے جو تیرگیوں کے چھٹنے کی نوید ہے!

تخلیق.....وہ اذان ہے جو سلامتی اور تقدّس کی علامت ہے!

تخلیق.....وہ ماہنامہ ہے جو ادب و ثقافت کی نئی اقدار کا پیامبر ہے!

تخلیق.....وہ آواز، وہ تحریک ہے جو اظہر جاوید کے نام سے پہچانی جاتی ہے!

ایک رلانے والا لطیفہ

اظہر جاوید

پنجابی سے ترجمہ : حنیف باوا

ٹھاہ ٹھاہ قہقہے پھوٹ رہے تھے۔ یار لوگ ہنس ہنس کر سیر ہو رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا۔ لطیفے پر لطیفہ پھینک رہے تھے۔ چٹکلے اور ننگے، ہر طرح کے لطیفوں کا جیسے سیلاب آیا ہوا تھا۔ کس نے پہلے لطیفہ سنایا اور کس نے بعد میں، یہ کوئی تخصیص نہیں تھی۔ جس کی ہنسی رک جاتی وہ لطیفہ شروع کر دیتا تھا۔ کاظمی لطیفے کم سنا رہا تھا، ہنس زیادہ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ اس کی ہنسی چھت سے باتیں کر رہی تھی۔ میں بھی لطیفوں اور ہنسی میں اپنا پورا حصّہ ڈال رہا تھا۔ ان ڈسنے والے لطیفوں میں کسی نے گنڈوئے جیسا لطیفہ بھی کہہ ڈالا۔

ایک بندہ، ایک چھپڑ کے کنارے مچھلی پکڑنے والی کُنڈی لگائے بیٹھا تھا۔ پاس سے کوئی بزرگ گزرا.....اس نے کنڈی لگانے والے سے پوچھا۔ ''کیا کر رہے ہو۔ مچھلیاں پکڑ رہے ہو.....؟'' کنڈی لگانے والے نے سر ہلایا.....اور سیانے بندے نے پھر کہا

''اس چھپڑ میں تو مچھلیاں بالکل بھی نہیں''.....مچھلی پکڑنے کی کوشش کرنے والے نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ بات کرنے والے کی جانب دیکھا اور ''اچھا'' کہہ کر پھر سر نیچے کر لیا۔ بزرگ شخص لمحہ بھر رکا اور پھر اپنے راستے پر ہو لیا۔

شام کے وقت سیانا بندہ کام کاج سے فارغ ہو کر واپس لوٹا تو وہ شخص اسی طرح اس جوہڑ کے کنارے کُنڈی لگائے بیٹھا تھا۔ سیانے بندے نے ہنس کر اور طنزاً پوچھا۔

''کوئی مچھلی پکڑی ہے؟''

کُنڈی لگانے والے نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور سر کو دائیں بائیں ہلا کر بتایا۔ ''نہیں''

سیانا بندہ ہنسا۔

''میں نے صبح ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ اس جوہڑ میں کوئی مچھلی نہیں ہے۔''

کُنڈی لگانے والے نے پہلی بار کُھل کے جواب دیا۔

''مجھے بھی معلوم ہے۔ میں کوئی پاگل نہیں ہوں''

لطیفہ ختم ہوا اور سننے والے جیسے اسی انتظار میں بیٹھے تھے۔ ایک بار پھر دیواریں ہلا دینے والی ہنسی اور قہقہے اچھلے.....لیکن نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کاظمی نے سب سے پہلے میری جانب دیکھا اور طنز سے کہا۔

''یارو۔اسے دیکھو۔یہ کوئی پاگل تو نہیں؟''
کسی دوسرے نے کہا
''یہ بھی جوہڑ میں کُنڈی لگا کر بیٹھا ہوگا''
''سچی بات ہے''
میں نے رواں آنسوؤں اور رکتی ہوئی سانسوں سے کہا
''میں بھی ایسے ہی کنڈی لگا کر بیٹھا رہتا ہوں.....''
یک دم محفل میں جیسے کوئی جِن آ گیا ہو۔تمام کو چپ کھا گئی اور ہنسی سے گونجنے والا کمرہ ان دیکھی اور نامعلوم سی ویرانی سے بھر گیا.....کاظمی پھر گویا ہوا۔
''چھوڑ یار۔سارا موڈ ہی غارت کر دیا۔ایسے ہی نجس باتوں سے محفل کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔چلو یار چلیں.....''
آہستہ آستہ تمام دوست اٹھ کر جانے لگے اور میں اپنے دفتر میں تنہا رہ گیا.....تنہا کیوں تھا.....؟ کچھ آنسو میرے ساتھی تھے، ڈھیر ساری یادیں ہمراہ تھیں۔
میں سوچنے لگا۔مجھے مچھلیاں پکڑنے کا شوق کب تھا؟ وقت یا تقدیر میرے ہاتھ میں کُنڈی پکڑا دیتی۔کبھی کبھی کُنڈی میں کوئی مچھلی پھنس بھی جاتی لیکن زیادہ تر کچھ ایسی ہوشیار ثابت ہوتیں کہ کُنڈی توڑ کر بھاگ جاتی تھیں۔
دراصل آج صبح ہی میں پنجابی کا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا.....اس میں اس کی کہانی چھپی ہوئی تھی۔اس کے نام کے ساتھ لفظ ''امریکا'' بھی چھپا ہوا تھا۔جیسے مچھلی کا کُنڈی میں پھنسنے پر جھٹکا لگتا ہے ایسے مجھے ایک کھچاؤ سا محسوس ہوا اور پانچ سات سال پہلے کی کئی باتیں یاد آ گئیں۔
میں روزانہ کے جس اخبار میں میگزین انچارج تھا وہ اس کے اور میرے رسالے کے لئے کہانیاں بھیجا کرتی تھی۔بس اتنی سی بات تھی۔ایڈیٹر حضرات کو سینکڑوں کے حساب سے تحریریں ملتی رہتی ہیں۔ان کے تخلیق کار کچھ واقف ہوتے ہیں اور کچھ ناواقف.....لیکن تمام کے ساتھ ایک سا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔اچھی چیز شائع ہو جاتی ہے۔اگر کوئی لکھنے والا زیادہ ہی اسرار کرنے لگے تو اسے دو حرف لکھ کر بھیج دیئے جاتے ہیں۔ایسے موقع پر بڑا محتاط ہونا پڑتا ہے۔ہر لفظ سوچ سمجھ کر ضبطِ تحریر میں لانا پڑتا ہے۔کسی قلم کار کی انا بھی مجروح نہ ہو اور اخبار یا رسالے کا بھرم بھی قائم رہے اور ایڈیٹر کا مقام بھی متزلزل نہ ہو۔خطوں میں زیادہ بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی۔
اس کا نام افشاں تھا.....اور اس سے پہلے شمسہ، غزالہ، ارم اور گل نہ جانے کس کس کے ساتھ اس جیسے روابط استوار ہوئے تھے.....خدا جانے.....انہوں نے خود ہی میرے ہاتھ میں ڈور تھمائی تھی.....خود ہی کُنڈی میں گڈا آیا۔کوئی دوسری کھانے والی شے لگائی تا کہ پھنستے وقت آسانی ہو۔اور پھر جب کنڈی لگ جاتی تھی تو پل دو پل یا ہو سکتا ہے سال دو سال۔یا لامحدود عرصے کے لئے وہ پھنسی رہتی۔میں خوش ہوتا کہ چلو ڈوری کھینچ کر کیا کرنا ہے.....ایک رشتہ تو استوار ہو گیا ہے.....لیکن پھر نہ جانے کیا ہوتا.....خود شوق سے پھنسی ہوئی مچھلی زور لگاتی اور کنڈی توڑ کر دنیاداری کے گڑھے کی جانب رخ کر جاتی۔میں بہ دستور ڈوری تھامے رہ جاتا۔اسی بات کی وجہ سے میں ہنسنے

والے لطیفے پر رو پڑتا تھا.....اور افشاں مجھے بے حد یاد آنے لگی۔

پہلے پہل افشاں مجھے دو تین سطروں کا خط لکھتی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کھلنے لگی اور اس کا خط سطروں سے ایک صفحے تک اور پھر دو تین صفحوں پر پھیلنے لگا تھا..... دیگر لکھنے والوں کی طرح میں اسے بی بی ہی لکھتا رہا۔ وہ اپنی امنگوں اور سوچوں کی باتیں کرتی.....اپنے گھر کے حالات تحریر کرتی اور لکھتے وقت احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ وہ دکھوں میں رو پڑتی۔ مجھے ان حروف میں آنسو تیرتے ہوئے صاف نظر آتے.....

پھر اس نے بتایا کہ اس کی شادی اس کی مرضی کے بغیر کی جا رہی ہے اور اسے بیرونِ ملک بھیجا جا رہا ہے۔ یہ دونوں باتیں اسے پسند نہ تھیں.....وہ خطوں میں بتا چکی تھی کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ مجھے کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہ تھا اور نہ ہی اس نے کبھی مجھ سے کوئی نسبت پیدا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ مجھ سے صرف ہمدردی اور پیار کے دو بولوں کا تقاضہ کرتی تھی.....اپنی روح کی بے چینی، کسی کا ہو جانے کی کشش اور ماحول کے جبر سے تنگ آنے کا دکھڑا روتی تھی.....

اس کے خط بدستور آتے رہے.....اب اسے چھپنے چھپانے کا کوئی افسوس نہیں تھا.....ایک روز ڈھلتی دوپہر کو وہ میرے دفتر آ گئی.....اس کے ساتھ ایک نوجوان سا لڑکا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ میرا کزن ہے.....اور میں اس کا امتحان دلوانے کے لئے آئی تھی..... وہ کہیں گوجرانوالہ، شیخوپورہ یا گجرات جیسے شہر کی رہنے والی تھی۔ میں نے اس سے زیادہ سوال نہ کئے۔ اس نے بھی مجھ سے زیادہ باتیں نہ کیں۔ وہ جتنی دیر تک بیٹھی رہی۔ نظریں نیچی کئے رومال سے ہاتھ صاف کرتی رہی اور کسمسا رہی تھی.....میں ایک نوجوان لڑکی کی گھبراہٹ اور اس کی بے چینی کو سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ہم دونوں کوئی گہرے رمز و کنایہ سے بات نہ کر سکتے تھے.....وہ دونوں کچھ دیر بیٹھے۔ نہیں معلوم کہ انہوں نے چائے پی تھی یا نہیں۔ وہ ایک ہی بات پر زور دیتی رہی کہ بڑی مشکلوں سے آئی ہوں۔ مجھے ملنے کا شوق تھا۔

واپس جا کر اس نے اور بھی پیار بھرا خط لکھا.....اپنی بے بسی، گھر اور رشتے داروں کی دشواریوں کا رونا رویا۔ اس نے لکھا تھا، وہ گھل گھل کر مر رہی ہے۔ اس نے التجا کی، ترلے کئے..... میں اسے ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ ہی محبت نامہ لکھ بھیجوں.....اس نے تحریر کیا.....(مجھے آج بھی یاد ہے) کہ ایک سسکتی، دم توڑتی لڑکی کے لئے اتنی سی بھی عرض قبول نہیں کرو گے۔ میں تمہارا خط پا کر سکھ اور چین سے مرنا چاہتی ہوں میں ہل سا گیا۔ اور میں نے تمام تکلفات چھوڑ کر اسے خط لکھا.....پہلی بار میں اسے بی بی کی بجائے جانم کہہ کر مخاطب کیا..... اس کا جواب آیا.....اور ایسا لگتا تھا کہ اس کے لفظوں میں خوشیوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں.....اس نے مجھے یاد دلایا کہ اس لفظ بی بی سے جانم تک کے سفر کے لئے اس نے کتنا طویل انتظار کیا ہے۔

وہ پھر کہیں کھو گئی.....نہ خط نہ پتر اور نہ کوئی خیر خبر۔ برسوں کے بعد پنجابی رسالے میں میں نے اس کی کہانی پڑھی اور جب اس کا نام امریکا چھپا ہوا پڑھا تو مجھے تمام بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کی شادی وہیں ہو گئی جہاں گھر والے چاہتے تھے۔ (اور وہ خود بھی چاہتی تھی) مجھ سے آخری محبت نامہ منگوانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ جاتے وقت فتح مندی سے مرنا چاہتی تھی اور اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ لڑکیاں (اور مچھلیاں) جب چاہیں کنڈی تڑوا کر بھاگ سکتی ہیں.....میرے جیسے تو بے وجہ ہی ڈوری پکڑ کر بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ یا پھر پاگل بنے رہتے ہیں۔ اور ہنسنے والے لطیفے پر رو پڑتے ہیں۔

◆◆◆

ظفر اقبال

O

یُوں اگر دیکھو تو ظاہر میں غُبار امکان ہے
ورنہ امکانِ سفر میں صد ہزار امکان ہے

گوشۂ دل میں سمٹ کر بیٹھنے والی یہ چیز
جتنی پوشیدہ ہے اُتنی آشکار امکان ہے

اپنا یہ دعویٰ کہ دل پر ہے ہمیں بھی اختیار
وقت پڑنے پر بہت بے اختیار امکان ہے

رائگاں خاکسترِ خواہش پہ ہے وہ مطمئن
کیا خبر اُس کو کہ یہ اب بھی شرار امکان ہے

پھر خُدا وصلِ بُتاں کا وقت لائے گا کبھی
ایک بار امکان ہے تو بار بار امکان ہے

آسماں کے در دریچے کُھلنے والے ہیں اگر
یہ زمیں شاید کسی کا انتظار امکان ہے

اہلِ دل اِس کو بُھلا پائیں گے مشکل ہی سے اب
سعیٔ نامشکور اپنی یادگار امکان ہے

منظرِ معنی سے ہٹ کر بھی اگر دیکھے کوئی
اپنی یہ طبعِ رواں ہی بے شمار امکان ہے

میں بغاوت کر رہا ہوں عاجزی سے، اے ظفرؔ
میری شورش بھی سراسر اِنکسار امکان ہے

OOO

سیّد مشکور حسین یادؔ

O

یہ کیسا درد ہے جو دل سے باہر آتا نہیں
کسی بھی سلسلۂ ظل سے باہر آتا نہیں

ہم اپنے ذوقِ جنوں سجدہ کو کہاں لے جائیں
کوئی بھی قبلہ ہو قابل سے باہر آتا نہیں

ہمارا سہل سہانا سفر سماعت کا
کسی بھی شکل میں مُشکل سے باہر آتا نہیں

ہمارے غم میں اضافہ تو ہوتا ہے بے حد
مگر یہ دریا کہ ساحل سے باہر آتا نہیں

ہم اپنے آپ کو رکھتے ہیں اپنے تک محدود
یہ جہل وہ ہے جو جاہل سے باہر آتا نہیں

لگی ہے کس کی نظر میرے حق شناسا کو
وہ باتیں کرتا ہے باطل سے باہر آتا نہیں

خوشا نصیب کہ ہم نے کبھی نہیں یہ کہا
ہمارا حوصلہ حاصل سے باہر آتا نہیں

اِسی کو کہتے ہیں خود احتسابی شاید یادؔ
مقابلہ جو مقابل سے باہر آتا نہیں

OOO

اسلم گورداسپوری

O

جو مؤثر ہو وہ تدبیر کہاں سے لاؤں
جو نشانے پہ لگے تیر کہاں سے لاؤں

ایک پیمانِ محبت میں جو سب کو باندھے
اس طرح کی کوئی زنجیر کہاں سے لاؤں

سارے انسانوں کی اُلفت کے نہیں تاج محل
اتنا سرمایۂ تعمیر کہاں سے لاؤں

وہ تو اک عہدِ وفا تھا جو کبھی باندھا تھا
اس ضمن میں کوئی تحریر کہاں سے لاؤں

مشتہر کرتے ہیں اب علم کو اخبار میں لوگ
اپنے افکار کی تشہیر کہاں سے لاؤں

اب کوئی یوسفِ کنعاں کسی زنداں میں نہیں
اب کسی خواب کی تعبیر کہاں سے لاؤں

اب تو ہر شخص یہاں کیدو نظر آتا ہے
اب کوئی رانجھا کوئی ہیر کہاں سے لاؤں

وہ کہ جو سب کے خیالات پہ پورا اُترے
ایسی بے ساختہ تقریر کہاں سے لاؤں

OOO

امجد اسلام امجد

O

اپنی مٹّی رَولتے ہم اور کیا
آنسوؤں سے بولتے ہم اور کیا

کوئی سنتا ہی نہیں تھا، شہر میں
بھید اپنے کھولتے، ہم اور کیا

یہ جواہر تھے بہت ہی قیمتی
کنکروں سے تولتے ہم اور کیا

تنگ ہوتے جال میں تقدیر کے
بے ارادہ ڈولتے ہم اور کیا

ایک گُن رس بھی نہیں آیا نظر
رَس ہوا میں گھولتے ہم اور کیا

کہہ رہی تھی حال امجدؔ خامشی
تم بتاؤ، بولتے ہم اور کیا

OOO

محمود شام

O

اپنے گھر میں بھی اب اماں ہے کہاں
سب کو معلوم ہے، کہاں ہے کہاں

تنگ پڑنے لگی زمیں کتنی
بچے کہتے ہیں آسماں ہے کہاں

ضرب کاری۔ شباب ہو بے داغ
اس قبیلے کا وہ جواں ہے کہاں

اس کی آنکھوں میں ڈوب کر دیکھو
آج کل حُسن مہرباں ہے کہاں

سب ہیں اپنی صدا میں کھوئے ہوئے
اے مغنّی تو نغمہ خواں ہے کہاں

وہ اندھیرا ہے اب پرندے بھی
بھول جاتے ہیں آشیاں ہے کہاں

منزلیں بے قرار ہیں کتنی
راہ تکتی ہیں کارواں ہے کہاں

OOO

ناصِر زیدی

O

اب نہ حالات نہ وہ دن ہیں پُرانے والے
جانے کس دیس ہیں، قسمیں مری کھانے والے

ہم نے جیسی بھی گزاری بہت اچھی گزری
زندگی تجھ سے گِلہ مند تھے جانے والے

نسلِ نو اُن کا تصّور بھی نہیں کر سکتی
جو زمانے ہیں ابھی سامنے آنے والے

خود تو اُجڑا ہوں پہ اَوروں کو دعا دیتا ہوں
شاد، آباد رہیں سارے زمانے والے

جس پہ احسان کرو، شر سے سَدا اُس کے بچو!
مطمئن رہتے ہیں یہ قول نبھانے والے

آج وہ دَر پئے آزار نہ کیوں ہوں یارو؟
ہم ہی ہیں شہرِ سخن میں جنھیں لانے والے

جس قدر چاہیں ستا لیں سبھی مل کر ناصِرؔ!
چین پائیں گے کہاں مجھ کو ستانے والے

OOO

بسمل صابری

O

لُٹ گئی ہوں سرِ بازار خدا خیر کرے
جل رہا ہے مرا گھر بار خدا خیر کرے

اُس کی تحویل میں رنجیدۂ خاطر ہی رہے
اب ہوں بے یار و مددگار خدا خیر کرے

وقت نے میرے خدوخال بدل ڈالے ہیں
بن گیا ہے مرا مختار خدا خیر کرے

وہ زمانوں سے سِتم گر تھا سِتم کیش رہا
میں محبت سے ہوں بیزار خدا خیر کرے

رقصِ جولاں کا یہ انداز تھرکتا سا بدن
اِس قدر غم کا یہ اظہار خدا خیر کرے

آگ رُت نے جسے مجبور بنا کر چھوڑا
ایک دوشیزۂ کُہسار خدا خیر کرے

میرے آنگن میں تو یادوں کے سِوا کچھ بھی نہیں
کون دیکھے گا یہ شہکار خدا خیر کرے

کتنی مغموم فضاؤں کی میں تفسیر لکھوں
اُف یہ سوچوں کے ہیں اَنبار خدا خیر کرے

جاں نکلتی ہوئی قسطوں میں کہاں تک دیکھوں
دہر میں ہر دلِ آزار خدا خیر کرے

بُھوک افلاس کی میّت نہیں دیکھی جاتی
رقص کرتا ہے قلم کار خدا خیر کرے

دیکھ لو ٹوٹتے آئینے میں لوگو مجھ کو
میرے شعروں کی یہ جھنکار خدا خیر کرے

غم کا بازار تو خود اس نے لگایا ہے جہاں
ہیں سبھی حق کے طلب گار خدا خیر کرے

میں نے آدابِ گدائی میں ہی لب سی ڈالے
اب کہاں طاقتِ گفتار خدا خیر کرے

میری تقدیر میں کیوں اُس نے رفاقت لکھ دی
دیکھ ساون ہے گہر بار خدا خیر کرے

موجۂ آب کو بھی چاند نے اب چھوڑ دیا
اس کو ساتھی نہیں درکار خدا خیر کرے

غمِ ہستی کا مَداوا جو کریں اہلِ صفا
اب کہاں صاحبِ کردار خدا خیر کرے

لذّتِ درد بھی تھی سُوزِ غزل میں بسملؔ
رَو دیا ہے مرا غمخوار خدا خیر کرے

OOO

پروفیسر زہیر کنجاہی

O

بجھا بجھا سا چمن ہے سارا مٹی مٹی سی چلی ہوا ہے
نہ ہم تمہارے نہ تُم ہمارے، عجب ہے موسم، عجب فضا ہے

نہ تام بسمل، نہ جام قُلقُل، یہ میکدہ ہے کہ بے صدا ہے
یہ سب جنوں کا معاملہ ہے یہ سب تعشّق کا سلسلہ ہے

ابھی تُم آؤ، ابھی سدھارو، نہ گھات کوئی، نہ بات کوئی
عجب ہے ملنا، عجب بچھڑنا، ہمارا کیسا یہ واسطہ ہے

نہ نین جوڑیں، نہ مانیں بتیاں، تمہاری مرضی، تمہاری مرضی
ہمارا کیا ہے، مریں گے تم پر، کہ دل ہی بس میں نہیں رہا ہے

پیام دینا یہ کام کہنا وہ تُم کو گھر پر بُلا رہا ہے
زُہیر جس کا ہے نام لوگو غزل وہ اپنی سُنا رہا ہے

OOO

قیصر نجفی

O

میں اس کے اور وہ مرے آس پاس رہتا ہے
مگر مری طرح وہ بھی اُداس رہتا ہے

مری کسی بھی اسے بات کا نہیں ہے لحاظ
کہے کا جس کے سدا مجھ کو پاس رہتا ہے

تری بلا سے کوئی شخص امیر شہر اگر
گرسنہ خواہ دریدہ لباس رہتا ہے

مرے مرض کی یہ تشخیص چارہ گر نے کی
کہ مجھ کو یاس نہیں خوفِ یاس رہتا ہے

فغاں! نکلتا ہے وہ شخص خار بالآخر
کہ جس پہ پھول کا ہم کو قیاس رہتا ہے

کسی نے جب لیا قیصر کا نام، بولے یہ لوگ
وہ ایک شخص جو اکثر اُداس رہتا ہے

OOO

ڈاکٹر شیخ اقبال

O

اک شخص تھا کہ جان سے پیارا لگا مجھے
ایسا نہیں تھا دوستو جیسا لگا مجھے
کیا کم ہے بات، چار دن اچھے گزر گئے
مانا کہ سب فریب تھا، اچھا لگا مجھے
یہ اور بات وہ کبھی میرا نہ بن سکا
وہ مجھ کو عمر بھر، مرا اپنا لگا مجھے
دو چار عشق صاحبو، جب میں نے کر لئے
جو پہلا عشق تھا وہی سچا لگا مجھے
چلتا رہا میں ایک ہی رستے پہ عمر بھر
سیدھا لگا کبھی، کبھی اُلٹا لگا مجھے
میرا ہی حوصلہ تھا، اسے پار کر گیا
دریائے عشق، آگ کا دریا لگا مجھے
ہر شے سے کھیلنا مری عادت سی ہو گئی
اپنا وجود تک بھی کھلونا لگا مجھے
چاہت نے تیری مجھ کو وفا کیش کر دیا
ہر شخص تیرے شہر کا اپنا لگا مجھے
تو ہم سفر ہے اور سفر قربتوں کا ہے
خوش بخت ہوں کہ عمر بھر ایسا لگا مجھے
شاخِ دل و نگاہ رہی عمر بھر ہری
ہر گل ترے خیال کا تازہ لگا مجھے

OOO

خورشید بیگ میلسوی

غزل

(نذرِ اظہر جاوید)

کتنی بے کیف زندگی ہے ابھی
ایسے لگتا ہے کچھ کمی ہے ابھی
کس کو آخر کریں نظر انداز
سارا منظر ہی دیدنی ہے ابھی
صبحِ امروز تیرے ماتھے پر
ایسے لگتا ہے تیرگی ہے ابھی
مجھ کو تسکیں کیوں نہیں ملتی
دل میں کیسی یہ بے کلی ہے ابھی
''اسے بچھڑے ہوئے زمانہ ہوا
سارا ماحول ماتمی ہے ابھی''
آدمیّت ہوئی ہے نوحہ بہ لب
خودسے بے زار آدمی ہے ابھی
دیکھ کر حُسنِ خال و خد تیرا
آئینہ خود بھی حیرتی ہے ابھی
کس سے جا کر ترا پتہ پوچھوں
شہر کا شہر اجنبی ہے ابھی
رائے کا اختلاف اپنی جگہ
ان سے خورشیدؔ دوستی ہے ابھی

OOO

نسیمِ سحر

O

شکستہ کِس قدر گھر کے در و دیوار لگتے ہیں!
سبھی کچھ منہدم ہونے کے اب آثار لگتے ہیں

ہیں گہری نیند میں شاید یہ سارے قافلے والے
بظاہر جو بڑے چوکس، بڑے بیدار لگتے ہیں

ہماری فتح یابی بھی ہماری ہار ہی ہو گی!
''ہم اپنے آپ ہی سے برسرِ پیکار لگتے ہیں''

خود اپنی شکل کوئی آئینے میں دیکھتا کب ہے؟
اگرچہ لوگ سارے آئنہ بردار لگتے ہیں

بُرا ہو اپنی اِس مشکل پسندی کا، کہ اب ہم کو
بہت آسان رستے ہی بہت دشوار لگتے ہیں

کبھی ہم کوہ برداری بھی آسانی سے کرتے تھے
مگر اب سنگ ریزے بھی ہمیں کُہسار لگتے ہیں

کہ بس اپنی ہی گردن کو تہہِ شمشیر رکھا جائے
یہاں اب زیست کرنے کے یہی معیار لگتے ہیں

میں جب لَوٹا تو دیکھا شہر میں کوئی نہیں میرا
جو میرے لوگ تھے اب وہ مجھے اغیار لگتے ہیں

کبھی پھولوں کے لہجے میں جو مُجھ سے بات کرتے تھے
نسیم اب ان کے لہجے بھی مجھے تلوار لگتے ہیں

OOO

ڈاکٹر خالد اقبال یاسر

O

سیدھی سادی طرز کے قابل نہیں
حکم تو کیا عرض کے قابل نہیں

چلتے پھرتے ہیں کہ عادت ہے ابھی
ورنہ چلتی نبض کے قابل نہیں

جب ہوئے اندھے تو ساون تھا یہاں
فرقِ زرد و سبز کے قابل نہیں

اب تو ازبس کی نہیں باقی سکت
نفل چھوڑے، فرض کے قابل نہیں

اب تو دو کوڑی کی وقعت رہ گئی
بھینٹ کے ہیں قرض کے قابل نہیں

دوستوں کی سرزنش ہے بے اثر
دشمنوں کی طنز کے قابل نہیں

ہم سے گہری بات کوئی کیا کرے
ہم کہ درکِ رمز کے قابل نہیں

راستہ کیوں دے ہمیں دیوارِ شب
در کہاں کا درز کے قابل نہیں

خواب کیا، تاروں کی حسرت بھی گئی
اور خاکِ ارض کے قابل نہیں

OOO

انوار فیروز

O

وہی حیلہ بہانا چل رہا ہے
ڈرامہ پھر پرانا چل رہا ہے

ہمیں نفرت کسی سے بھی نہیں ہے
عدد سے دوستانہ چل رہا ہے

ترے تو نام میں ہی زر ہے شامل
ترے پیچھے خزانہ چل رہا ہے

جہاں پر کھیت تھے گاؤں میں سارے
وہاں اب کارخانہ چل رہا ہے

وہی آنسو، وہی آہیں ہماری
پرانا ہی فسانہ چل رہا ہے

وہ شب خوں مار کے حاکم بنا ہے
وہ قبضہ غاصبانہ چل رہا ہے

یہ اپنے کھیت تو بنجر پڑے ہیں
ابھی تک آبیانہ چل رہا ہے

نہیں انوارؔ میں تنہا نہیں ہوں
''مرے پیچھے زمانہ چل رہا ہے

OOO

صفدر صدیق رضیؔ

O

کچھ نہ کچھ عیب چُھپا لیتی ہے خاموشی بھی
لیکن اک حشر بپا کرتی ہے سرگوشی بھی

لوگ ویسے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں
تنگدستی کا بھرم رکھتی ہے خوش پوشی بھی

کس طرح ترکِ محبت ہو محبت کے بغیر
ترکِ مے کیلئے مطلوب ہے مے نوشی بھی

ہم درِ یار پہ جائیں کہ سرِ طُور ملیں
ہوش مندی کیلئے شرط ہے بے ہوشی بھی

ہم سے عجلت نہ ہوئی اس کو بھلا دینے میں
دیر سے آئی ہمیں زُود فراموشی بھی

OOO

عرفان صادق

O

اُبھرے گی روشنی شبِ ظلمت کو توڑ کر
سورج کے آ رہا ہوں میں شانے جھنجھوڑ کر

شاخوں پہ دربدر ہوئی پھرتی ہیں تتلیاں
پھولوں سے کون لے گیا خوشبو نچوڑ کر

ایسے لگا کہ ساری انا خاک ہو گئی
اُس بے وفا کے سامنے ہاتھوں کو جوڑ کر

ساکت کھڑا ہوں دھوپ کی بارش میں اس لیے
لایا گیا ہوں برف کی وادی سے موڑ کر

میں تھا اُداس پیڑ تھے اور سوگوار شام
پنچھی جو جا رہے تھے مرا گاؤں چھوڑ کر

شالیں کسی کے قرب کی سمٹی ہی تھیں کہ بس
مرے گلے سے لگ گئی تنہائی دوڑ کر

OOO

ناصر علی سیّد

O

تکلّفات کو اب بھول جایئے صاحب
یہ میرا دل ہے سہولت سے آیئے صاحب

یہ چار لمحے جو فرصت کے ہاتھ آئے ہیں
انہی کی جھولی سے سورج اگایئے صاحب

مجھے یہ خون کے آنسو رُلانے لگتی ہے
گذشتہ سال کی البم ہٹایئے صاحب

یہاں تو ہونا ہی سارے فساد کی جڑ ہے
کبھی نہ جینے کے احساں اٹھایئے صاحب

یہ کیا کہ روز مِرا حال زیرِ بحث رہے
اُداس شام ہے، اپنی سنایئے صاحب

وہ کھو گیا نئی دلچسپیوں میں، دیر ہوئی
اب اپنی کھڑکی کے پردے گرایئے صاحب

ہر اک نگاہ کا مرکز گذشتہ رات رہیں
غزالی آنکھوں سے صدقہ دلایئے صاحب

OOO

سیفی سرونجی (انڈیا)

O

اک بشر آیا زمیں پر اور خوشبو دے گیا
اک جہاں روشن ہوا اک نور ہر سو دے گیا

چھین کر خوشیاں مری آنکھوں میں آنسو دے گیا
چاہیے تھا کیا مجھے اور کیا مجھے وہ دے گیا

میں نے کی تھی اک گذارش اس سے تازہ پھول کی
وہ نجانے کیوں مرے ہاتھوں میں چاقو دے گیا

نقش ہے دل پر میرے وہ ایک لمحہ پیار کا
ذہن جس سے ہے معطّر ایسی خوشبو دے گیا

میں نے مانا چھین لی سیفیؔ سے تو نے ہر خوشی
شعر کہنے کا مگر اس کو ہنر تو دے گیا

OOO

پرتپال سنگھ بیتابؔ (انڈیا)

O

وہ عارضہ خود ہی نہ رہا میرے بعد
کِس کام کی تھی کوئی دوا میرے بعد

پہلے تو مچلتی تھی بہکتی تھی بہت
خاموش ہوئی بادِ صبا میرے بعد

دشمن بھی نظر آنے لگے دوست مجھے
شکوہ نہ کوئی رنج رہا میرے بعد

روداد مِری جو نہیں سُنتے اُن کو
یاد آئے گا افسانہ مِرا میرے بعد

سب کہتے ہیں ناگفتنی ہے مت پوچھو
اُس بزم کا جو حال ہوُا میرے بعد

حاسِد مِرا دیوانہ ہوا ہے بیتابؔ
کرتا ہے مری صفت و ثنا میرے بعد

OOO

کرشن کمار طُور (انڈیا)

O

وہ روشنی کہ جو ہے رونق جبیں آخر
ہوئی ہے تازہ نگاہی سے اک یقیں آخر

میں اس طرح کسی کجِ اماں سے گرتا ہوں
پرندہ چومتا ہے جس طرح زمیں آخر

یہ کیسا عہد تلوّن مزاج ہے کہ یہاں
متاعِ عشق ہوئی مال بے یقیں آخر

لہولہان تو ہونا ہے اک ثواب کی بات
بچھائے سطح پہ رکھتی ہے کیا زمیں آخر

ہر ایک دن یہاں روزِ حساب سے نہیں کم
ہر ایک سانس ہے سامان آتشیں آخر

تیار موج نفس ہو کہ شوق رسم جنوں
ہر ایک حادثہ ہم میں ہے تہہ نشیں آخر

وہ سیلِ غم ہو کہ ہو خاک کا بچھونا طوؔر
جہاں میں ملتی ہے تسکین بھی کہیں آخر

OOO

حفیظ انجم کریم نگری (انڈیا)

O

لایا ہے گر شرابِ محبت کشید کر
اک گھونٹ دے کے مجھ کو بھی اپنا مُرید کر

خاموش سُن رہا ہے تو بیٹے کی جھڑکیاں
تو کیسا باپ ہے اُسے تھپّڑ رسید کر

اک روز لہلہائے گی بنجر زمین بھی
بادل برس ہی جائیں گے ایسی اُمید کر

کس کام کی ہیں تیری بتا اِختلافیاں
دروازہ دل کا کھول دے گفت و شنید کر

میں آئینہ ہوں تیرے لئے تو مری دھنک
آنکھوں میں آ کے جھانک مری، اپنی دید کر

کس بات کی ہے دیر مزہ جینے کا اُٹھا
وہ آ گئے ہیں گھر پہ ترے آج عید کر!

پاگل سمجھ رہے ہیں تجھے سارے لوگ دیکھ
کس نے کہا تھا پیار بھی اتنا شدید کر

گر مفت میں بھی دیجئے پڑھتا نہیں کوئی
انجم میں پڑھ رہا ہوں رسالے خرید کر!

OOO

نجمہ عثمان (برطانیہ)

O

رگ و جاں میں لہو بن کر رہا ہے
عجب یہ عمر بھر کا رابطہ ہے

میں کیوں ان راستوں پر چل پڑی ہوں
جہاں ہمدم، نہ کوئی نقش پا ہے

کوئی صورت نہیں ہے روکنے کی
حوالوں سے حوالہ چل رہا ہے

کہیں طوفاں سے موجوں کی ٹھنی ہے
کہیں چپ چاپ دریا بہہ رہا ہے

کہیں تنہا شجر محو سخن ہے
کہیں جنگل کا جنگل چپ کھڑا ہے

کبھی برسات کی ایسی جھڑی ہے
کبھی آنکھوں میں صحرا رُک گیا ہے

کبھی آنکھوں ہی آنکھوں میں ترنم
کبھی لہجہ بھی اک تلوار سا ہے

نقیب امن ہے شوریدہ کب سے
مگر یہ شہر با بھی سو رہا ہے

OOO

رشیدہ عیاں (امریکہ)

O

کبھی جو خود کو ترے ہم عناں میں دیکھوں تو
ہیں نقشِ پائے فرس، اب کہاں میں دیکھوں تو
قدم جمائے بہت تن کے، سر اُٹھائے ہوئے
سراغِ زیست ملے گا کہاں، میں دیکھوں تو
میں خود شناسی میں ذرّہ سہی، پر اس کی شناخت
زجاجِ دل میں، کہ ہے لامکاں، میں، دیکھوں تو
ہمارے دور کا یہ صُورِ کون پھونکے گا
چھٹے گا کیسے یہ ابرِ گماں، میں دیکھوں تو
مراجعت، مری خلقت کا جزوِ اعظم ہے
یہ لہر، نور کی، پلٹے کہاں، میں دیکھوں تو
ارادہ خیز و عشق انگیز ہے یہ جدّوجہد
تسلسلاتِ زمان و مکاں، میں دیکھوں تو
یہ ایک راز ہے، کیوں ہوں میں احسنِ تقویم
بسا ہے کون، مرے جسم و جاں، میں دیکھوں تو
تمام حد و حصار و لزوم سے آزاد
اگر وہ ہے تو پھر آئے یہاں، میں دیکھوں تو
بلند ہونے کی میری سرشت میں ہے طلب
ہے کیا ورائے زمان و مکاں، میں دیکھوں تو
گر اپنی خلق کی پستی سے میں نکل پاؤں
تو سطحِ ابر کہاں ہے عیاںؔ، میں دیکھوں تو

OOO

مرزا شبیر بھیروی

O

کوئی بھی دور تلک چاند ستارا نہ ہو
تو میرے ساتھ ہو کشتی ہو کنارا نہ ہو

کوئی منزل بھی سفر میں نہیں آئی ایسی
جس میں گھبرا کے تجھے میں نے پکارا نہ ہو

بھولنے والے تجھے دیکھنا ہو گا آ کر
کیسے جینا ہے کوئی جس کا سہارا نہ ہو

تو میرے شہر سے لے جا سبھی یادیں اپنی
میرے دن رات میں کچھ دخل تمہارا نہ ہو

کل یہی طرزِ ستم جو کہ روا ہے مجھ پر
تم کو اپنے لیے شاید یہ گوارا نہ ہو

یہ جو بکھرا ہے ابھی ٹوٹ کے ریزہ ریزہ
دیکھ شبیر! کہیں دل یہ تمہارا نہ ہو

OOO

اکرام تبسّم

O

سج گئیں قتل گاہیں تمھارے لئے
بھیج دوں کتنی لاشیں تمھارے لئے

دیکھنے کا مجھے کچھ سلیقہ نہ تھا
بن گیا جسم آنکھیں تمھارے لئے

ہے بھی کچھ تم کو ان موسموں کی خبر
گشت پر تھیں ہوائیں تمھارے لئے

تم سے آگے رسائی نہیں ذہن کی
وقف ہیں ساری سوچیں تمھارے لئے

شور سُننے کا تم کو بڑا شوق ہے
لے کے آیا ہوں چیخیں تمھارے لئے

OOO

فرزند علی شوقؔ

O

خرد سے دل روانہ ہو گیا ہے
جُنوں سے دوستانہ ہو گیا ہے

سُنے ہیں جب سے جلوؤں کے فسانے
تعلق غائبانہ ہو گیا ہے

ہر اک سے عشق کرتی ہیں نگاہیں
مرا دل عاشقانہ ہو گیا ہے

مرے سانسوں میں خوشبو ہے اُسی کی
جسے دیکھے زمانہ ہو گیا ہے

محبت کو عطیہ دیتے دیتے
مرا خالی خزانہ ہو گیا ہے

جہاں الزام تھا آوارگی کا
وہی میرا ٹھکانہ ہو گیا ہے

سجودِ عشق کی ہے یہ کرامت
مرا سر آستانہ ہو گیا ہے

مقدر کو مرے جب نیند آئی
جو موتی تھا وہ دانہ ہو گیا ہے

کسی نے خون کیا مانگا ہے مجھ سے
شہادت کا بہانہ ہو گیا ہے

محبت اجنبی سے ہو گئی کیا
وہ بیگانہ، یگانہ ہو گیا ہے

وفاؤں نے پہن لی ہیں جفائیں
حقیقت کا فسانہ ہو گیا ہے

جو کشکولِ روایت پر تھا نازاں
وہ جدّت کا خزانہ ہو گیا ہے

تری یادوں میں جو لکھا ہے میں نے
محبت کا ترانہ ہو گیا ہے

کوئی تازہ غزل اے شوقؔ کہہ لو
کہ موسم شاعرانہ ہو گیا ہے

OOO

ندیم ہاشمی

O

شب کو تارے نظر میں رہتے ہیں
خواب سارے نظر میں رہتے ہیں

آنکھ رہتی ہے ہر گھڑی روشن
سب نظارے نظر میں رہتے ہیں

جن کو پانا نہیں ہے بس میں مِرے
وہ سہارے نظر میں رہتے ہیں

روشنی کا سفر ہے ساتھ مِرے
چاند تارے نظر میں رہتے ہیں

بھول جاؤں میں کیسے ماضی کو
دن تمھارے نظر میں رہتے ہیں

مُسکرانا بھی اب تو بس میں نہیں
دُکھ تمھارے نظر میں رہتے ہیں

میں ندیمؔ رہِ تمنّا ہوں
جاں کے پیارے نظر میں رہتے ہیں

OOO

اوصاف شیخ

O

ہوا کی چاندنی کی بات کرنا
مری آوارگی کی بات کرنا

ہمارے شہر میں تو جرم ٹھہرا
شعور و آگہی کی بات کرنا

بہیں گی آنکھ سے اشکوں کی ندیاں
لبِ جو تشنگی کی بات کرنا

کھلونے بانٹنا بارود بھر کے
اور اس پہ زندگی کی بات کرنا

مرے اطراف بنجر صورتیں ہیں
ذرا مجھ سے نمی کی بات کرنا

بُھلا دینا فسانے ہجرتوں کے
بس اِک دو پل کی خوشی کی بات کرنا

جلا رکھنا دیئے اوصافؔ سارے
ہمیشہ روشنی کی بات کرنا

OOO

پروین سجّل

O

ہمارے کب یہ خدوخال تھے ٹھہرے
گلِ تازہ کبھی امثال تھے ٹھہرے

کبھی جگنو، ستارے، چاند اور سورج
کبھی اپنے بھی ماہ و سال تھے ٹھہرے

ملے ہیں دشمنوں کی صف میں وہ ساتھی
کبھی جو ساتھ اپنے ڈھال تھے ٹھہرے

پرندہ رزق یا پھر گھونسلا دیکھے
بساطِ جاں پہ کتنے جال تھے ٹھہرے

نہ موسم سبز، برگ و بار کی فصلیں
ہمارے ساتھ کتنے کال تھے ٹھہرے

فقیری اوڑھ کر اب ماس کو توڑیں
ہمارے کب کبھی یوں حال تھے ٹھہرے

حقیقت، منحرف ہونے سے کب ٹلتی
سجّل آگے مگر اعمال تھے ٹھہرے

OOO

آسناتھ کنول

O

انتہا ہونے سے پہلے سوچ لے
بے وفا ہونے سے پہلے سوچ لے

بندگی مجھ کو تو راس آ جائے گی
تو خُدا ہونے سے پہلے سوچ لے

کاسۂ ہمت نہ خالی ہو کبھی
تو گدا ہونے سے پہلے سوچ لے

یہ محبت عمر بھر کا روگ ہے
مبتلا ہونے سے پہلے سوچ لے

بچ رہے کچھ تیرے میرے درمیاں
فاصلہ ہونے سے پہلے سوچ لے

زندگی اک ساز ہے لیکن کنولؔ
بے صدا ہونے سے پہلے سوچ لے

OOO

یاد نگاری

دوسرا رخ

ڈاکٹر رشید امجد

متحّدہ عرب امارات کی چکا چوندی اور ترقی کا ذکر تو میں نے بھی بہت کیا ہے۔ گزشتہ دس پندرہ سالوں میں یہاں کی دنیا ہی بدل گئی ہے اور یقیناً اس کا کریڈٹ اس منصوبہ بندی کو جاتا ہے جو یہاں کے حکمرانوں نے کی۔ اس وقت عرب امارات کا دنیا کے ان ترقی پسند اور لبرل معاشروں میں شمار ہوتا ہے جہاں حدود کی پابندی کرتے ہوئے اپنی مرضی کی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ فلک بوس عمارتوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے، صاف ستھری دوڑتی سڑکیں، دنیا بھر کی چیزوں سے بھرے شاپنگ مال، نہ بجھنے والی روشنیاں رات کو بھی دن بنائے رکھتی ہیں۔ کہتے ہیں اس میں زیادہ ہاتھ اس کالے مال کا ہے جس کے استعمال کرنے اور لانے کی یہاں کوئی روک ٹوک نہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے لیکن اس کے استعمال کی منصوبہ بندی کی داد تو دینا ہی پڑے گی۔ یہاں کی چکا چوند، دفتری، بنکوں اور دیگر مالیاتی اداروں میں اربوں کا لین دین، شام کو بھرے ریستوران، شاپنگ مالوں میں خریداروں کا ہجوم، ایک ایسی تصویر بناتا ہے جو دنیا بھر میں ترغیب کا سبب ہے۔ یوں لگتا ہے یہاں ہر طرف پیسے کی ریل پیل ہے۔

یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ اس بار مجھے ایک اور رخ سے یہاں کی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملا۔ شاندار وِلا زاور فلیٹوں کے پیچھے ایک اور دنیا بھی ہے، رینگتے کیڑوں کی دنیا۔ یہاں باہر سے آنے والوں کی کئی قسمیں ہیں۔

اوّل، جو اپنا پیسہ (جائز یا ناجائز) لے کر یہاں کاروبار کرنے آتے ہیں۔

دوم، جو اپنی تعلیم اور تجربے کی بنیاد پر یہاں ملازمتیں حاصل کر کے آتے ہیں۔

سوم، جو کسی نہ کسی طرح یہاں آجاتے ہیں اور دوڑ دھوپ کر کے چھوٹی موٹی ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔

چہارم، وہ جو مزدور یا گھروں میں کام والوں کی حیثیت سے یہاں آتے ہیں۔

ان کے لئے مختلف ملکوں میں ریکٹرو ٹمنٹ کمپنیاں اشتہار دیتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی تنخواہ چھ سو سے آٹھ سو درہم ہوتی ہے۔ لیبر میں تو مرد آتے ہیں، گھروں میں کام کرنے کے لئے عورتیں۔ پاکستان کے سوا یہاں تیسری دنیا کے اکثر ممالک کی عورتیں تقریباً آٹھ سو درہم میں ملازم رکھی جاتی ہیں۔ پاکستانی قوانین کے تحت اکیلی عورت یہاں نہیں آسکتی۔ میں اکثر اس قانون کی مخالفت کرتا تھا لیکن اب احساس ہوا ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔ یہ عورتیں جنہیں گھریلو ملازم کہا جاتا ہے، یہاں پہنچنے کے بعد منگوانے والے کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔ ان کا پاسپورٹ بھی مالک کے حوالے ہو جاتا ہے۔ ان میں افریقی ممالک، انڈیا۔ سری لنکا۔ بنگلہ دیش۔ انڈونیشیا سمیت اسی طرح کے ممالک کی

عورتیں شامل ہیں۔ان عورتوں سے خوب کام لیا جاتا ہے' بعض لوگ تو صحیح کھانا بھی نہیں دیتے' کچھ عرصہ بعد یہ وہاں سے بھاگ جاتی ہیں۔ان کا پاسپورٹ اصل مالک کے پاس ہی ہوتا ہے۔اب ان کی حیثیت غیر قانونی ہو جاتی ہے لیکن کام مل جاتا ہے۔عموماً ہزار سے بارہ سو درہم تک۔ان میں سے کئی اچھی خاصی پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔نئے گھروں میں بھی ان کی حیثیت قیدی کی سی ہو جاتی ہے۔قانونی طور پر ایسی عورتوں کو رکھنے کی اجازت نہیں لیکن اس بارے میں ایک خاموش مصلحت ہے۔شائد اب تک کوئی ایسا کیس سامنے آیا ہو۔یہ عورتیں صبح پانچ سے بارہ بجے رات تک گھر کے کام نمٹاتی ہیں۔اچھے لوگ ہوئے تو کھانے کو صحیح مل جاتا ہے ورنہ جو بچ جائے اسی پہ گزارہ ہوتا ہے۔

اس بار مجھے دو اتھوپین لڑکیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ایک تو اسی گھر میں تھی جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔اس کا نام ہرگوا تھا اور وہ گریجویٹ تھی۔پچھلی بار جب میں یہاں آیا تو یہاں ایک انڈونیشیا کی خاتون تھی۔میں نے پوچھا.....''وہ کدھر گئی؟''جواب ملا۔''ہم دونوں میاں بیوی تو جاب کرتے ہیں' اسے بچوں کے پاس چھوڑ جاتے تھے' ایک دن دفتر جا کر معلوم ہوا کہ ایک ضروری کاغذ گھر رہ گیا۔واپس آیا تو معلوم ہوا کہ اندر ایک مرد بھی ہے جس کی ٹیکسی باہر کھڑی تھی' سو اسے نکالنا پڑا''

میں نے ہرگوا سے پوچھا.....''تم نے گریجویشن کی ہے اتھوپیا میں نوکری نہیں ملی''

کہنے لگی.....''میں وہاں ایک دفتر میں نوکری کر رہی تھی۔باپ مر گیا تھا۔ماں نے میری شادی کر دی' خاوند نہیں چاہتا تھا کہ میری ماں ہمارے ساتھ رہے۔ایک سال اسی جھگڑے میں گزر گیا اور ایک بچی ہو گئی' ماں کا کوئی کفیل نہیں تھا' چنانچہ مجھے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔میری تنخواہ میں ماں اور بچی کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔یہاں کا اشتہار پڑھا تو آ گئی''

''پھر.....میں نے پوچھا

وہ تادیر چپ رہی پھر بولی.....''اب واپس بھی نہیں جا سکتی' غیر قانونی ہوں' پکڑی گئی تو پہلے جیل ہو جائے گی پھر ڈی ریواٹ کر دیں گے' وہاں بھی ملازمت نہیں ملے گی''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

اس نے کہا.....''جہاں سے آئی تھیں وہاں سے کیوں چھوڑا''

کہنے لگی.....''آٹھ سو درہم دیتے تھے' وہ بھی تین تین چار چار ماہ بعد' درمیان سے ایک آدھ مہینہ کھا بھی جاتے تھے۔ذرا ذرا سی بات پر گالیاں دیتے اور کبھی کبھی مار پیٹ بھی کرتے تھے۔''

''وہاں سے نکلی کیسے؟''

''پندرہ دن بعد ایک دن کی چھٹی ملتی تھی۔ہم چار پانچ لڑکیوں نے مل کر ایک کمرہ کرایے پر لیا ہوا تھا' اکٹھی ہوتیں تو سب اپنی اپنی بپتا سناتیں۔ایک دن ایک ساتھی نے کہا کہ ایک گھر میں ملازمہ کی ضرورت ہے' ایک ہزار درہم ملیں گے' میں اسی رات وہاں چلی گئی۔وہ بھی کچھ اچھے لوگ نہ تھے۔تنخواہ دینے میں بہت دیر کر دیتے۔ماں اور بیٹی کو کوئی آسرا نہیں تھا' وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گئی۔یہ مجھے بارہ سو درہم دیتے ہیں' ہر ماہ کی پہلی دوسری کو میں ساری تنخواہ ماں کو بھجوا دیتی ہوں''

''اور یہاں حالات کیسے ہیں؟''

''کچھ بہتر ہی ہیں' دو چھوٹے بچے ہیں سارا دن ان کے پوتڑے دھوتی ہوں' صفائی کرتی ہوں میری ڈگری کس کام کی۔''

ہرگوا عیسائی تھی اور اس دن روزے سے تھی۔

میں نے پوچھا..... ''اتنی محنت کرنا پڑتی ہے۔روزے کیوں رکھتی ہو''

کہنے لگی..... ''خداوند میرے لئے کوئی اچھا راستہ نکالے گا''

معلوم ہوا کہ ان کے چالیس روزے ہوتے ہیں۔روزہ رات نو بجے سے اگلے دن تین بجے تک ہوتا ہے۔میں نے پوچھا..... ''معلوم نہیں خداوند کو اس کے معاملے پر غور کرنے کی فرصت کب ملے''

دوسری لڑکی کا تعلّق بھی اتھوپیا سے تھا۔یہ بھی عیسائی تھی اور اس نے کمپیوٹر میں ایف اے کیا ہوا تھا۔اچھے مستقبل کے لالچ میں یہاں آ گئی تھی۔اصل مالک سے بھاگی اور ہوتے ہوتے اس گھر میں آئی جہاں میں نے اسے دیکھا۔دونوں لڑکیاں انگریزی صاف بولتی ہیں۔عربی میں گذارا چلا لیتی ہیں۔ہرگوا کے مقابلے میں ہرزیٹ بڑی پڑھی لکھی لڑکی تھی، دبلی پتلی لمبے قدم کی یہ دونوں لڑکیاں خوش مزاج بھی ہیں۔ہرزیٹ تو ادب پہ بھی اچھی خاصی گفتگو کر لیتی ہے۔وہ ہرگوا کے مقابلے میں بہتر حالت میں تھی کہ اس گھر میں صرف دو میاں بیوی تھے۔میاں جاب کرتا تھا' بیوی گھر میں ہوتی۔گھر خاصا بڑا والا تھا اس لئے صفائی کا کام بھی اچھا خاصا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا..... ''تم بھی شادی شدہ ہو''

اس کے کالے چہرے پر سرخی عجیب سی لگی' بولی..... ''نہیں''

''تو تم کس لئے یہاں آئی ہو''

کچھ دیر چپ رہی پھر کہنے لگی..... ''سوچا تھا کچھ پیسے کما لوں' مگر کسے معلوم تھا کہ یہاں مجھے گھریلو ملازمہ بننا پڑے گا''

''اتھوپیا کے حالات کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا

''بہت ہی خراب، اچھے اچھے گھروں میں بھوک ناچتی ہے''

''واپس جانے کو جی نہیں چاہتا''

''وہاں حالات کونسے اچھے ہیں' اور پھر اب تو میں غیر قانونی ہوں''

ایک بار غیر قانونی ہو جانے کے بعد ڈر اتر جاتا ہے۔اصل مالک پاسپورٹ پولیس کو دے دیتا ہے۔دوسرے جو لوگ انہیں رکھتے ہیں وہ بھی مجرم ہیں۔پکڑے جانے کی صورت میں ان پر بھاری جرمانہ ہوتا ہے۔اس لئے جب کوئی ملازمہ انہیں چھوڑتی ہے یا چوری کر کے بھی بھاگ گئی ہے تو وہ شکایت نہیں کرتے۔پکڑی جائیں تو جرمانہ اور جیل ہوتی ہے۔وہاں کام کر کے اتنی رقم جمع کرنا پڑتی ہے کہ جرمانہ اور واپسی کی ٹکٹ کے پیسے اکٹھے ہو جائیں۔ہر عورت کو معلوم ہے کہ اس کی سزا کیا ہے۔اس لئے پہلی بار بھاگ کر وہ اتنی بے خوف ہو جاتی ہے کہ پھر گھر بدلنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔

اسی طرح کی بے شمار لڑکیاں یہاں موجود ہیں، کسی کو ہفتہ میں ایک دن اور کسی کو پندرہ دن بعد ایک دن کی چھٹی ملتی ہے۔چھٹی کا یہ دن یہ اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتی ہیں۔ان دوستوں میں مرد بھی شامل ہیں، عموماً پٹھان ٹیکسی ڈرائیور جو اپنی جسمانی ضرورتوں کے لئے ان سے دوستی کر لیتے ہیں۔چھٹی عموماً جمعرات کی شام سے جمعہ کی شام تک ہوتی ہے۔یہ دوست ڈرائیور گھر کے قریب آ جاتے ہیں۔موبائل پر جگہ طے ہو جاتی ہے اور ان کے ساتھ ان کے کمروں میں شب بسری ہوتی ہے۔اس میں کچھ مالی فوائد بھی ہیں اور جسمانی بھی۔

یہاں پاکستان کے علاوہ ہر ملک کی عورتیں علیحدہ بھی آتی ہیں جو مختلف دفاتر میں کام کرتی ہیں اور مل کر یا الگ الگ فلیٹوں میں رہتی ہیں۔ایک کمرے کے فلیٹ بھی موجود ہیں۔ان میں ہر رنگ، ہر نسل اور ہر مذہب کی خواتین شامل ہیں۔ان میں سے اکثر کے دوست

ہیں' جسمانی اور مالی دونوں یا کسی ایک ضرورت کی تحت ان کا ویک اینڈ بھی مرد دوست کے ساتھ گزرتا ہے۔ باہر کا ماحول بہت کڑا اور صاف ستھرا ہے لیکن اپنے کمرے کے اندر آپ کیا کر رہے ہیں اس سے کسی کو سروکار نہیں۔ ایک بلڈنگ میں پانچ پانچ سو فلیٹ ہیں۔ کون کس فلیٹ میں آ جا رہا ہے ساتھ والے کو خبر نہیں اور نہ ہی اس کو دلچسپی ہے۔

رات کو نو دس بجے کے قریب ایک لڑکا گاڑیاں دھونے آتا ہے۔ یہ بنگالی ہے اور اس کا نام بشیر ہے۔ سلہٹ کا رہنے والا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی وہیں ہیں۔ ابھی شادی نہیں ہوئی۔

میں نے پوچھا..... ''دن کو کیا کرتے ہو؟''

کہنے لگا..... ''پلستر کا کام کرتا ہوں'' ارباب جو ایرانی نژاد مقامی تھا ایک تعمیراتی کمپنی چلاتا تھا۔ اس کا گھر قریب ہی تھا۔ سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں چھ سات بنگالی جو اسی کے ملازم تھے' رہتے تھے۔ ان سب کے پاسپورٹ بھی ارباب کے پاس تھے۔ تنخواہ دو دو تین تین ماہ بعد ملتی تھی اس لئے شام کو یہ سارے لڑکے یہاں مختلف ولاز میں کام کرتے تھے۔ ہر کوئی ایک سے زیادہ کام کرتا۔ یہ علاقہ بڑے بڑے ولاز کا ہے۔ ہر گھر میں کئی کئی گاڑیاں ہیں۔ یہ لڑکے گاڑیاں صاف کرتے ہیں' ان کی صفائی کرتے ہیں اور گھر کے چھوٹے چھوٹے کام جن سے ان کا گزارہ ہوتا ہے۔ دو تین ماہ بعد تنخواہ ملتی ہے تو گھر بھیج دیتے ہیں۔ ان کی ڈیوٹی صبح پانچ سے شام پانچ بجے تک ہوتی ہے۔ درمیان میں آدھ گھنٹہ کھانے کے لئے، ارباب دوبئی میں دوسو کے قریب ولاز بنا رہا ہے صبح ساڑھے چار بجے گاڑی انہیں سائٹ پر لینے کے لئے چل پڑتی ہے اور آتے آتے، کیونکہ شام کو رش ہوتا ہے سات بج جاتے ہیں۔ سات بجے سے تقریباً ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک یہ لڑکے مختلف ولاز میں کام کرتے ہیں۔ ارباب کا آدمی گیارہ بجے ان کی حاضری لگاتا ہے کہ اگر دیر سے سوئیں گے تو صبح اٹھ نہ سکیں گے اور کام کے دوران تھکے ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی بڑے چالاک ہیں' حاضری لگوا کر خاموشی سے نکل آتے ہیں اور دو ایک گاڑیاں دھو جاتے ہیں۔

میں نے بشیر سے پوچھا..... ''کتنے عرصہ سے یہاں ہو؟''

بولا..... ''چار سال ہو گئے''

چپ ہو گیا پھر کہنے لگا..... ''پاسپورٹ ارباب کے پاس ہے''

مجھے لگا اس کی آواز بھیگی ہوئی ہے۔

یہاں لیبر قانون نہیں۔ آج یکم مئی ہے۔ دنیا بھر میں مزدوروں کے حقوق کی بات ہو رہی ہے نام نہاد ہی سہی' لیکن یہاں تو ایسی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ کہنے کو یہاں کوئی ٹیکس نہیں لیکن اس کے انداز دوسرے ہیں۔ مختلف سڑکوں سے گزرنے پر راہداری سسٹم شروع کیا جا رہا ہے۔ گاڑیوں کی ونڈ سکرین پر ایک چپسی لگی ہوتی ہے۔ جتنی بار گزاریں راہداری کی رقم آپ کے کھاتے میں جمع ہوتی رہتی ہے' آہستہ آہستہ اندرونی ٹیکسوں کی صورت پیدا کی جا رہی ہے۔

یہاں کی فلک بوس عمارتوں' شان و شوکت' جگمگاتی' دل لبھانے والی دنیا کے اندر مظلوموں کی ایک دنیا بھی موجود ہے۔ عام مزدور چھے سو سے آٹھ سو درہم میں بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ ایک ایک کمرے میں دس دس شخص رہتے ہیں۔ سبزیوں اور دالوں کے علاوہ انہیں کچھ میسر نہیں۔ نل کا پانی پیتے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے کہ ہر شے ایک دائرے میں ہے۔

قانون کی حکمرانی نے ہر کسی کو ایک حد میں رکھا ہوا ہے!

◆◆◆

گورنمنٹ کالج لاہور..... چند بھولی بسری یادیں

سرفراز سید

گورنمنٹ کالج لاہور..... دوسری منزل 5 مئی، سہ پہر تین بجے میں گورنمنٹ کالج میں خاموشی سے داخل ہوتا ہوں۔ کالج کی قدیم کھلی سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل کی راہداری کی مغربی سمت میں گھوم کر ایک کمرے کے اندر داخل ہو رہا ہوں۔ پیچھے سے ایک آواز گونجتی ہے، ''کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' آواز ایک چوکیدار کی ہے جو تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر آیا ہے۔ اس کا سانس پھول رہا ہے۔ وہ میرے پاس آ کر رک جاتا ہے۔ میری طرف دیکھتا ہے، 'میں' ڈھلتی عمر والا صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ایک خاموش شخص! چوکیدار کہتا ہے ''صاب! ''تم کون ہو، یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں ماضی ہوں، خود کو ڈھونڈ رہا ہوں'' میں خواب کے عالم میں جواب دیتا ہوں!

''ماضی؟'' معمّر چوکیدار بڑبڑاتا ہے! ''صاب'' میں نے پوچھا ہے آپ کون صاب ہیں یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''میں سرفراز سیّد ہوں، ماضی میں میرا نام سرفراز احمد تھا۔''

''میں اس کمرے میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کمرے میں وہ تیسرا ڈیسک ہے نا! میں نے 45 سال پہلے اس بنچ پر اپنا نام لکھا تھا، وہ نام دیکھنے آیا ہوں''

''45 سال پہلے ڈیسک پر نام لکھا تھا، اسے دیکھنے آئے ہیں!'' چوکیدار کا لہجہ اب نرم اور ہمدردانہ سا ہو رہا ہے ''صاب جی!'' اب وہ نام کہاں رہ گیا ہوگا، ان ڈیسکوں پر کئی بار روغن ہو چکا ہے! کئی نام مٹ گئے۔''

تمہارا نام کیا ہے؟'' میں پوچھتا ہوں۔

میرا نام شہاب دین ہے۔ صاب جی! زمانے گزر گئے اب نام کہاں رہ گئے!''

''نام کبھی گم نہیں ہوتے شہاب دین! کتنے زمانے گزر جائیں، ان پر کتنے رنگ و روغن کر دیئے جائیں، نام کبھی نہیں مٹتے، کبھی گم نہیں ہوتے'' میں تیسرے ڈیسک کے سامنے بنچ پر جا بیٹھتا ہوں۔ ڈیسک کو غور سے دیکھتا ہوں۔ میں چونک جاتا ہوں مجھے اپنا نام دکھائی دے رہا ہے۔ روشن ابھرا ہوا، چمکتا دمکتا انگریزی میں کھدا ہوا نام SARFRAZ AHMAD میں کہتا ہوں۔ ''دیکھو شہاب دین! میں نے اپنا نام ڈھونڈ لیا ہے'' شہاب دین غور سے ڈیسک کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے ''نہیں صاحب جی مجھے تو کوئی نام دکھائی نہیں دے رہا'' میں اس کی بات پر توجہ نہیں دیتا۔ آنکھیں بند ہو رہی ہیں میں دور چلا گیا ہوں! بہت پیچھے! میں اس ڈیسک کے سامنے بنچ پر بیٹھا ہوں۔ میرے دائیں اسلم، سلیم، راشد، بائیں نعیم، اگلے بنچ پر عقیلہ، انجم اور شیریں اور..... اور..... پروفیسر خالد مسعود، فیض احمد فیض کے ایڈٹ کئے ہوئے ایک

ون ایکٹ ڈرامے پریکچر دے رہے ہیں..... پولیس انسپکٹر تفتیش کر رہا ہے کہ نوجوان کی موت کیسے واقع ہوئی؟ ماں کہتی ہے کہ ''وہ عرصے سے بے روزگار تھا دو روز قبل اس نے کہا تھا کہ میں زندگی ختم کرلوں گا۔ میں نے بہت روکا نہیں رکا تھا'' ایک دوست کہتا ہے کہ ''وہ انقلابی تھا اسے دہشت گرد قرار دیا گیا۔ کل اس نے کہا تھا کہ یہ دنیا جہاں ہے، جیسے ہے، کبھی نہیں بدل سکتی، میری کوششیں بے کار ہیں، ایسی زندگی کا کیا فائدہ؟'' ایک لڑکی انسپکٹر پولیس سے کہہ رہی ہے کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے پاس تھا۔ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا افلاطون والی محبت! اس کے حالات بہت خراب تھے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اس کمرے میں میرے ساتھ اس کھڑکی میں کھڑا تھا۔ بہت مایوسی کی باتیں کر رہا تھا باہر اندھیرا تھا۔ بادل میں چاند چھپ گیا تھا۔ کہنے لگا کہ ''دیکھو اندھیرے نے دنیا کو کس طرح گھیرا ہوا ہے۔ میں اس اندھیرے سے آزاد ہو رہا ہوں۔ آج تمہارے ساتھ آخری ملاقات ہے، آخری باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا'' اتنے میں بادل ہٹ گیا، چاند نکل آیا، ہر طرف چاندنی پھیل گئی۔ میں نے کہا کہ دیکھو، دنیا کتنی خوبصورت ہے، ہر طرف روشنی پھیل گئی ہے، زندگی خوبصورت دکھائی دے رہی ہے۔ میری بات ادھوری رہ گئی بادل نے پھر چاند کو ڈھانپ لیا، پھر ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ گہرا اندھیرا! میری بات ادھوری رہ گئی، میں نے اسے نہیں روکا۔ وہ چلا گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ میرے ساتھ تھا، کہہ رہا تھا.....'' لڑکی کی آواز لرز گئی۔ جملہ نامکمل رہ گیا۔ انسپکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا ''نوجوان رچرڈ کو کسی نے نہیں مارا۔''

مجھے ایک آواز حال میں واپس لے آتی ہے۔ چوکیدار بڑی اپنائیت کے ساتھ کہتا ہے۔ ''صاحب جی! آپ اس کالج کے پرانے طالب علم ہو، میرے محترم ہو۔ آپ کیلئے چائے لاؤں؟''

''نہیں شہاب دین! میں مہمان نہیں ہوں، یہ میرا کالج ہے، میں نے یہاں کئی سال گزارے ہیں۔ اس کی ان اونچی چھتوں والی راہداریوں میں میرے قدموں کی چاپ بسی ہوئی ہے۔ لو یہ لو!

''میں جیب سے کچھ کرنسی نکالتا ہو۔ اس کی جیب میں ڈال دیتا ہوں۔ وہ انکار کرتا رہ جاتا ہے۔ میں خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر جاتا ہوں۔

.....

اور اب نارمل انداز میں گورنمنٹ کالج کی ایک خوبصورت لوک داستان!

مجھے فخر ہے کہ میں نے زندگی کا بہترین حصہ اس عظیم درسگاہ کے زیر سایہ گزارا ہے۔ گورنمنٹ کالج کے ہر طالب علم کے پاس اس عظیم ادارے میں گزارے ہوئے لمحات کی بے شمار یادیں موجود ہوتی ہیں۔ میری یادداشتوں میں بھی ایسے بہت سے واقعات محفوظ ہیں گورنمنٹ کالج میں میری تعلیم کا زمانہ 1960ء کے اردگرد کا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گورنمنٹ کالج میں بہت سی تقریبات، مذاکرے، مشاعرے اور موسیقی کی محفلیں اور ہر قسم کے کھیلوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ جب کہا جاتا تھا کہ دنیا بھر میں سب سے اچھی انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور میں بولی جاتی ہے۔ گورنمنٹ کالج کی یادداشتوں پر ضخیم کتاب مرتّب ہوسکتی ہے تاہم اس میں کالج کی ایک طالبہ (فرضی نام س) اور ایک طالب علم فرضی نام (ش) کی مجلّہ ''راوی'' کے شماروں میں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے نام شائع ہونے والی شاعری نے اتنی شہرت حاصل کی کہ کالج سے باہر کے حلقے ''راوی'' کے نئے شماروں میں ان دونوں کی شاعری کے منتظر رہا کرتے تھے۔ میں نے بڑی کوشش کر کے ''راوی'' کے چار برسوں کے مختلف شماروں سے یہ شاعری جمع کی ہے۔ ہر قدیم لوک داستان کی طرح اس داستان کا

بھی وہی انجام ہوا۔ میں نے جب بھی اس شاعری کو پڑھا ہے اس میں ہر بار نیا رنگ سامنے آیا ہے۔ چار برسوں پر محیط یہ شاعری ایک دوسرے کے نام سات نظموں، سات غزلوں اور ایک گیت پر مشتمل ہے یہ سارا کلام نرم ولطیف جذبات اور سوز وگداز سے بھرپور کیفیات کا خوبصورت اظہار ہے۔ یہاں یہ سارا کلام پیش کرنا مشکل ہے اس کے چند جستہ جستہ ٹکڑے اسی ترتیب کے ساتھ پیش کئے جارہے ہیں جس ترتیب کے ساتھ یہ ''راوی'' کے مختلف شماروں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ کلام پڑھئے۔

1۔(س) جنوری 1955ء

نظم افکار

تھکے پیڑوں کے سائے تھے زمیں پہ اس طرح لرزاں — سکوتِ شب میں ہو جیسے کسی کی آرزو پنہاں
سطح افلاک پہ چندا کا گھبرا کر نکھر جانا — حسیں کرنوں کا لہروں کے گلے مل کر بکھر جانا
میرے غم خوار مجھ کو وہ سماں بھی یاد ہے اب تک — سکوں میں پا نہیں سکتی مگر بیتے نظاروں سے
میرے غم خوار میں راہوں پہ تیرے چل نہیں سکتی — میری منزل بہت آگے ہے تیری راہ گزاروں سے
میرے غم خوار مجھ کو دعوت عیش و طرب کیسی؟ — میرا غم خانہ بہتر ہے جہاں کے لالہ زاروں سے

2۔(ش) مارچ 1956ء

غزل

تمہارا درد اگر ساز گار ہوجائے — خزاں بھی اپنی نظر میں بہار ہوجائے
نثار سارے جہاں کی مسرتیں اس پر — تمہاری یاد میں جو سوگوار ہوجائے
کہو تو چاند ستاروں سے روشنی لاؤں — تمہاری زلف اگر تابدار ہوجائے

3۔(س) مارچ 1956ء

غزل

سہے ہیں کیسے کیسے ظلم ہم نے آسمانوں کے — ہوئے برباد ہم دھوکے میں آکے راز دانوں کے
ستم دنیا کا، ناکامی، ہجوم غم میں تنہائی — یہ کچھ عنوان ہیں ان بھولی بسری داستانوں کے

4۔(ش) جون 1956ء

سمن آباد

سنہری شام جب آتی ہے سونا سا پگھلتا ہے — فضاؤں میں حسیں خوابوں کی تعبیریں مچلتی ہیں
نظارے شام کے حیرانیوں میں ڈوب جاتے ہیں — ہواؤں میں خمِ کاکل کی زنجیریں مچلتی ہیں

.....

افق پہ آرزو کے ماہ پارے جھلملاتے ہیں — اسی بستی میں رہتی ہے میرے نغموں کی شہزادی

محبت کا صنم خانہ، وفا کا اولیں مرکز　　تصور کی حسیں دنیا، خیالوں کی حسیں وادی
ستاروں کی شعاعیں ہیں سمن آباد کی گلیاں　　محبت کی فضائیں ہیں سمن آباد کی گلیاں

5۔(س)جون1956ء

نشیمن

ستاروں سے چمک لے کر، شفق سے سرخیاں لے کر　　بیاباں سے تپش لے کر، چمن سے شوخیاں لے کر
قفس سے تتلیاں، ابر سیاہ سے بجلیاں لے کر　　خلش سے بے بسی لے کر، زمین سے تلخیاں لے کر
نشیمن اک بسایا تھا کبھی نغموں کی وادی میں

.....

میری دنیا محبت کے فسانوں سے بھی آگے ہے　　مری دنیاجہاں کے آستانوں سے بھی آگے ہے
مری دنیا شفق کے لالہ زاروں سے بھی آگے ہے　　مری دنیا افق کے چاند تاروں سے بھی آگے ہے
نشیمن اک بنایا تھا کبھی نغموں کی وادی میں

6۔(ش)دسمبر1956ء

غزل

بجھی بجھی سی نگاہیں تھکے تھکے سے قدم　　اسیر عہد خزاں ہیں تیرے دیار میں ہم
ذرا نگاہ محبت کو ایک جنبش دے　　کہ تشنہ لب ہی نہ رہ جائیں رہروانِ عدم

7۔(س)دسمبر1956ء

سحر

غم حیات کے دامن میں کچھ فسانے ہیں　　وہی ندیم تجھے اب ہمیں سنانے ہیں
کسی کی پائلیں پچھلے پہر چھلکتی ہیں　　تڑپ تڑپ کے یوں مجبوریاں سسکتی ہیں
نشاط غم سے اس راہ گزر پہ ٹکرائی　　صدا یہ کس کی خیالوں میں میرے تھرائی
شکستِ شب ہوئی، پھولوں کی آنکھ بھر آئی

8۔(س)دسمبر1956ء

گیت

بھول گئے پردیس میں جا کر تم سپنوں کا پیار　　سوکھ گئے وعدوں کے گجرے ٹوٹے ارمانوں کے ہار
پلکوں پہ فریاد بنی ہے اب کجرے کی دھار　　قدم قدم پر ڈستی جائے پائل کی جھنکار
سلک رہا ہے دھیرے دھیرے زلفوں کا سنسار　　بھول گئے پردیس میں جا کر تم سپنوں کا پیار

9۔(ش)فروری1957ء

غزل

اپنا لیا ہے ہم نے غم انتظارکو — کچھ ہے سکون آج دل سوگوار کو
سمجھایا دل کو بارہا ماضی کو بھول جا — اب یاد کر کے کیا کریں اجڑے دیار کو!

10۔(س)فروری1957ء

غزل

تمہارے ہجر میں دل سے اٹھے ہیں جس قدر شعلے — وہ عنواں بن گئے ہیں سب مغنّی کے ترانوں کا
چلے آؤ بلاتی ہیں سمن کی سرنگوں بیلیں — سنوکہ رنگ پھیکا پڑ گیا ہے راز دانوں کا

11۔(س)دسمبر1957ء

نشمین

یہ پیمانے، یہ مے خانے،فریب زیست ہیں سب کچھ — نہ چھلکے جن میں خونِ دل، وہ جام جم نہیں ہوتے
بھلانا تو بہت چاہا، مٹانا بھی بہت چاہا — مگر میں کیا کروں افکار میرے کم نہیں ہوتے
سنا کرتے ہیں اپنا ہی فسانہ کھوئے کھوئے سے — تیری محفل میں ہوتے ہیں مگر وہ ہم نہیں ہوتے

◆◆◆

برصغیر کے معروف شاعر کرشن کمار طُور کا نیا شعری مجموعہ

گل گفتار

شائع ہوگیا ہے

قیمت-/250روپے

رابطہ: سرسبز پبلی کیشنز،134/E، کھنیارا روڈ، دھرم شالہ۔176215(ہماچل پردیش)انڈیا

(سیل091-981602085)

آپ بیتی

بھارت سے پاکستان تک

..... 1 .....

علی سفیان آفاقی

ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟ ہندو ذہنیت کیا ہے اور وہ مسلمانوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ پہلی بار یہ مجھے بھوپال سے باہر نکل کر معلوم ہوا۔ میں بھوپال کے شہر سیہور میں پیدا ہوا تھا۔ یہ اگست کی ۲۲ تاریخ تھی اور ۱۹۳۳ء کا سنہ۔ چند سال بعد ہم لوگ بھوپال آ گئے۔ بھوپال ایک مسلم ریاست تھی جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ کاروبار پر بھی وہی چھائے ہوئے تھے۔ ہندو مسلم محلّے الگ الگ نہیں تھے۔ دونوں قوموں کے لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ مگر مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین انفرادی مراسم اور تعلّقات کے علاوہ کثرت سے میل جول نہ تھا۔ ان کی محفلیں تقاریب اور تہوار مختلف تھے جن میں سبھی شرکت کرتے تھے۔ عید، بقرعید مسلمانوں کے خالص مذہبی تہوار تھے۔ بقرعید پر تو ہندو دور دور ہی رہتے تھے لیکن عیدالفطر یا میٹھی عید پر ہندو ملاقاتی بھی شیر خورمہ کھانے میں شریک کئے جاتے تھے۔ محرّم کا مہینہ ہم بچوں کے لئے تو ابتدائی دس دنوں تک ہی محدود تھا۔ شیعہ سُنّی کبھی فساد یا جھگڑا نہیں ہوا۔ سُنّی بھی شیعوں کے ساتھ مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ وہ بھی عجیب زمانہ اور عجیب لوگ تھے۔ ماحول بھی عجیب تھا۔ نہ ہندو مسلم فساد، نہ سُنّی شیعہ فساد، کسی قسم کے فساد کا ہم نے بچپن میں ذکر ہی نہیں سنا۔

محرّم کی دسویں کو تعزیئے نکلتے تھے جو عموماً لکڑی اور کاغذ کے بنے ہوتے تھے لیکن بہت خوبصورت شاندار اور خوش رنگ دو منزلہ یہاں تک کہ چار منزل تعزیئے بھی بنائے جاتے تھے۔ ہم بچے ان تعزیوں کو بنتے اور مختلف مقامات پر رکھے دیکھا کرتے تھے۔ ایک واحد موقعہ جس میں سُنّی، شیعہ اور ہندو بھی شرکت کرتے تھے، محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ دس روز سارے شہر کے مختلف علاقوں سے تعزیئے نکالے جاتے اور جلوس کی صورت میں تالاب کی جانب لے جائے جاتے۔ لیجئے، تالاب کے متعلق تو ہم نے بتایا ہی نہیں جو بھوپال شہر کی حسین و جمیل پہچان تھی۔ بھوپال تال۔ تال یعنی تالاب۔ یہ شہر کے درمیان میں بھی تھا اور ایک کنارے پر بھی۔ ہماری نظر میں تو یہ ایک سمندر ہی تھا۔ حدنگاہ تک پھیلا ہوا صاف شفاف پانی طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کا منظر دیکھنے کے لئے خوش ذوق لوگ تالاب پر جایا کرتے تھے۔ درمیان میں سے گزرنے والی سڑک (ظاہر ہے کہ یہاں پل بھی تھا) تالاب کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی جس کی وجہ سے اس کے دو حصے ہو گئے تھے۔ ایک چھوٹا تالاب اور دوسرا بڑا تالاب کہلاتا تھا۔ تالاب کے درمیان ایک پرانی محل نما عمارت تھی جسے رانی کملاپتی کا محل کہا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں بہت سی داستانیں مشہور تھیں۔ جن میں ایک یہ تھی کہ کملاپتی ایک رنگین مزاج رانی تھی۔ صاحب ذوق بھی تھی جس کا

اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنا محل یا حویلی تالاب کے بیچ میں تعمیر کرایا تھا۔ خدا جانے وہ کون ساز مانہ تھا۔ کون سے انجینئر اور ماہرین تعمیرات تھے جنہوں نے پانی کے اندر یہ خوبصورت عمارت تعمیر کی تھی۔ ہم نے اس کا نچلا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہی دیکھا۔ ظاہر ہے کہ محل تک آمدورفت کے لئے کشتیاں ہی استعمال کی جاتی ہوں گی کیونکہ وہاں تک کسی سڑک کے ذریعے رسائی نہ تھی۔

رانی کملا پتی عاشق مزاج اور رنگین مزاج تھی، جس پر مہربان ہوتی اس کو اپنے محل میں مدعو کرتی۔ بہت خاطر مدارات کرتی۔ محل کے محافظوں اور داسیوں کو علم تھا کہ یہ رانی کا محبوب ہے۔ لہٰذا وہ بھی اس کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے، مگر رانی کا کوئی بھی محبوب کبھی اس محل سے زندہ واپس جاتا نظر نہیں آیا۔ رانی صبح ہوتے ہی اس کو اپنے محافظوں کے حوالے کر دیتی جو اس کو وزنی پتھر باندھ کر تالاب میں پھینک دیتے جہاں وہ مچھلیوں کی غذا بن جاتا تھا۔ مگر یہ ایک راز ہی تھا جو رانی کی زندگی میں کسی پر فاش نہ ہوا اور نہ ہی کوئی دل والا رانی کی میزبانی قبول کر سکتا تھا۔

یہ داستان قلوپطرہ کی کہانی سے مشابہہ ہے یا غالباً اسی سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ اس میں کتنی سچائی ہے، لیکن ہم نے رانی کملا پتی کا محل ضرور دیکھا ہے بلکہ اس راہ سے ہر گزرنے والا دن میں کئی بار اس محل کا نظارہ کرتا تھا۔ ہم تو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے کے بعد پھر کبھی اس ملک میں نہیں گئے، لیکن ہمارے جاننے والے عزیز رشتہ دار بتاتے ہیں کہ رانی کملا پتی کا محل آج بھی وہیں اور اسی حالت میں موجود ہے۔ بھوپال تال بھی ہے اس کے آس پاس کی سرسبز پہاڑیوں پر اب اہل ثروت نے خوبصورت بنگلے بنا لئے ہیں۔ مگر تالاب اور اس کے اردگرد کے قدرتی حسن کو برقرار رکھا ہے۔ ان خوبصورت تعمیرات کی وجہ سے اب اس مقام کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

بھوپال کے بارے میں کیا بتائیں؟ یہ عجیب و غریب قسم کی خصوصیات کا حامل قدرتی مناظر سے مالا مال شہر تھا۔ بندھیا چل پہاڑی سلسلے پر واقع یہ شہر اور تمام علاقہ کسی مصوّر کے شاہکار کی مانند تھا۔ یہاں کے موسم بہت معتدل تھے۔ سردی، گرمی، برسات، لیکن گرمی ایسی کہ تکلیف نہیں دیتی تھی۔ سردی اچھی خاصی پڑتی تھی۔ بزرگ روئی کے دگلے اور روئی کی بنڈی پہن کر اور سروں کو ٹوپیوں سے گرم کنٹوپ سے ڈھانپ کر رکھتے تھے۔ انگیٹھیاں جل جاتی تھیں۔ امیر، غریب سب کے گھروں میں خشک میوہ ضرور موجود ہوتا تھا۔ بادام، کشمش، اخروٹ کی گری، اس میں بھنے ہوئے چنے بڑے بڑے برتنوں میں رکھ لئے جاتے۔ شام ہوتے ہی بچوں کو دو دو مٹھی بھر کے دیئے جاتے۔ وہ چباتے پھرتے۔ خوشحال لوگوں کے بچے سارا دن میوہ کھاتے تھے، جس میں بھنے ہوئے چنے شامل نہیں کیے جاتے تھے۔

بھوپال سے باہر نکل کر معلوم ہوا کہ سردی کیا ہوتی ہے۔ ہم اسی سردی کو بہت زیادہ سردی سمجھتے تھے۔ بارشیں اپنے ساتھ ایک نیا حسن لے کر آتی تھیں۔ بھوپال شہر پہاڑیوں پر واقع تھا۔ اونچی نیچی پتھریلی سڑکیں۔ تارکول کی سڑکیں اس وقت شہر میں کم ہی نظر آتی تھی۔ کتنا ہی موسلا دھار مہینہ برسے کیا مجال جو پانی کا ایک قطرہ بھی سڑکوں پر نظر آئے۔ سارا پانی بہہ کر نشیب کی جانب چلا جاتا تھا۔ سیوریج کا نظام نہ تھا لیکن سڑکوں کے اطراف میں نالیاں ہوتی تھیں جن کے ذریعے آسمان سے بارش ہوتی رہتی اور نشیبی سڑکوں اور نالیوں کی وجہ سے پانی بہہ کر آگے نکل جاتا۔

بارش کا پانی کھڑا ہو جائے یہ اس وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بارش کے ساتھ ہوا کے تیز جھکڑ پانی کو زور زور سے عمارتوں اور انسانوں پر پانی کی چھڑیوں کی طرح مارتے تو بہت لطف آتا تھا۔ تیز ہوا جب اونچی عمارتوں سے ٹکراتی تو سائیں سائیں کی خوفناک آوازوں سے بچے ڈر کر ماؤں کی گودوں میں چھپ جاتے۔ گرد و غبار اور کیچڑ سے ہم ناواقف تھے۔ شہر جسے آج کل ڈاؤن ٹاؤن

کہتے ہیں، درختوں کی زینت سے محروم تھا لیکن جہاں خالی جگہیں تھی وہ سبزے سے بھری ہوتی تھیں۔ پرانے گھنے سایہ دار درختوں کا اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ البتہ شہر کے اردگرد سبزہ زاروں کی کمی نہ تھی۔ وہ پہاڑیاں جہاں اس زمانے میں گنتی کی رہائشی عمارتیں تھی اور وہ بھی نواب یا ان کے رشتے داروں کی ملکیت تھیں، کھلونے معلوم ہوتی تھیں۔ سنا ہے اب وہاں خوبصورت، جدید آبادیاں بن گئی ہیں۔ بھوپال کو موسموں اور قدرتی مناظر کے باعث جنت کہا جاتا تھا۔ امیر غریب کا دیکھنے میں کوئی فرق نہ تھا۔ لوگ اپنے خاندان یا علم وفضل کے باعث عزت پاتے تھے۔ سادگی اور قناعت کا زمانہ تھا۔ نمود ونمائش سے عام لوگ تو کیا شاہی خاندان بھی پرہیز کرتا تھا۔ نواب اور ان کے خاندان سے لوگ سچ مچ محبت کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے، تقسیم سے پہلے بھی اس چھوٹی سی ریاست کو انہوں نے فلاحی ریاست بنا رکھا تھا۔ تعلیم مفت، علاج معالجہ مفت، عام لوگوں کے لیے کوئی ٹیکس نہیں۔ اس زمانے میں پردے کا رواج تھا۔ اس لئے ہر مردانہ اور زنانہ تعلیمی ادارے الگ الگ تھے۔ لڑکیوں کو اسکول اور کالج لے جانے کے لئے تعلیمی اداروں کی بسیں موجود تھیں۔ وہ طب یونانی کے علاج کا دور تھا۔ حکیموں کے مطب آباد رہا کرتے تھے۔ پرائیویٹ پریکٹس کرنے والا کوئی ڈاکٹر ہم نے وہاں نہیں دیکھا۔ شہر میں دیسی علاج کے لئے ایک بہت وسیع وعریض شفاخانہ تھا جہاں حکیم حضرات موجود ہوتے تھے۔ یہاں سے ادویات بھی مفت ملتی تھیں۔ ایک انگریزی اسپتال بھی تھا۔ یہاں نواب بھوپال نے بیرونی تعلیم یافتہ ڈاکٹر ملازم رکھے تھے۔ یہاں بھی معائنہ اور علاج مفت تھا، لیکن انگریزی دواخانے کا رخ بہت کم لوگ اور بحالت مجبوری ہی کرتے تھے ورنہ ماہر فن حکیموں سے ہی رجوع کیا جاتا تھا۔ چند ممتاز اور نامور حکیموں کے اپنے شفاخانے تھے۔ نہایت صاف ستھرے، یہاں قیمت ادا کر کے ادویات ملتی تھیں، مگر برائے نام قیمت پر۔ خدا جانے یہ لوگ گزارہ کیسے کرتے تھے؟

حکیم سلطان محمود سب سے زیادہ شہرت یافتہ حکیم تھے۔ انہیں دوسرے شہروں اور صوبوں سے بھی بلاوے آتے تھے۔ دیکھنے میں حکیم سے زیادہ فرشتہ نظر آتے تھے۔ سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی۔ سرخ وسفید رنگت، سفید کرتے پاجامے اور دہرے کالر کی سفید براق شیروانی، سر پر ٹوپی، یہ ان کا مستقل لباس تھا۔ انتہائی مہذّب، شائستہ اور با اخلاق انسان تھے۔ خاندانی حضرات سے کرسی سے اٹھ کر ملتے تھے خواہ ان کی مالی حالت کس قدر خستہ ہو۔ اپنے عملے کو بھی ہدایت کرتے رہتے تھے کہ فلاں صاحب کتنے خاندانی یا صاحب عمل ہیں۔ ان کے لباس اور ظاہری حلئے پر نہ جانا۔ انہیں دوسروں سے زیادہ احترام دینا۔ ہم آکامیاں (اپنے والد) کے ہمراہ اکثر حکیم صاحب کے پاس جایا کرتے تھے۔ شہر کے سبھی لوگوں کو وہ نہ صرف ذاتی طور پر جانتے تھے بلکہ ان کے خاندانی شجرے اور حسب نسب سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے حیرت انگیز علاج کر کے دور دور تک شہرت حاصل کر لی تھی۔ ادویات کے علاوہ فصد کھول کر بھی علاج کرتے تھے۔ اب تو یہ طریقہ متروک ہے لیکن اس زمانے میں بچے بھی اس سے واقف تھے۔ بعض امراض میں پیر کی کسی رگ کو چیرا لگا کر (سرجری کو اس زمانے میں یہی کہا جاتا تھا۔ فاسد خون کے ساتھ فاسد مادہ بھی خارج کر دیا جاتا تھا اور مریض صحت یاب ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات جسم کے حصوں پر جونکیں لگا کر بھی علاج کیا جاتا تھا۔ یہ ہمارے لئے ایک انوکھی بات تھی۔ یہ طریقے دراصل آپریشن یعنی سرجری کے طبی نعم البدل تھے اور بیحد مفید ثابت ہوتے تھے۔ حکیم سلطان محمود صاحب نے تو بچپن میں خود ہمارا اس وقت علاج کیا تھا جب حکیموں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ بچے کو شہر میں نہ رکھا جائے۔ یہ چھوت کی بیماری ہے۔ دوسرے بچوں کو بھی لگ سکتی ہے۔ مگر حکیم سلطان محمود نے نبض دیکھ کر فرمایا۔

(جاری ہے)

◆◆◆

تمہیں یاد ہو.....

.....1.....

عزیز میرٹھی

سُنا فسانۂ ہستی تو درمیاں سے سُنا
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

''میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔'' کل کی صدیوں لمبی کالی راتوں میں، تمہاری یادوں کے جگنو چمکتے رہے ایک پل کو آنکھ نہ لگنے پائی۔ بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے پہلو میں درد جاگ اُٹھا۔ مگر صبح نے رُونمائی کا نام نہ لیا، ستارۂ سحری تو دکھائی دیا مگر عروسِ سحر نے اپنا آنچل اُٹھا کر رُخ روشن نہ دکھایا۔ آخر کار طلسمِ شبِ تار ٹوٹا تو دل زندانِ غم سے چھوٹا۔

ابھی اپنی حیاتِ مستعار کو چھہتر واں دورِ خزاں ہے مگر محسوس یہ ہوتا ہے، جیسے میں کوئی پیر صد سالہ ہوں۔ دسمبر کا مہینہ ہے، پروائی کے جھونکوں سے، ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے ہوتے ہیں۔ اپنی کوٹھی کے برآمدے میں اُداس بیٹھا سردیوں کی نیم گرم دھوپ قطرہ قطرہ پی رہا ہوں۔ نیم سے جھڑتے زرد پتے باغیچے میں تتلیوں کی طرح ادھر اُدھر اُڑتے پھر رہے ہیں۔ آم کے درخت، امرود اور مالٹوں کے پودے کہرے کی چادر میں لپٹے ابھی تک محوِ خواب ہیں۔ یہاں سے وہاں تک کیاری کسی بیوہ کے سہاگ کی طرح اُجڑی پڑی ہے۔ انگور کی بیل مرجھا چکی ہے۔ اب جہاں کونے میں خس و خاشاک کا ڈھیر لگا ہے، وہاں کبھی سورج مکھی اور گیندے کے پھول کھلا کرتے تھے دوسری طرف موتیا، چنبیلی، اور شب دلہن کی تیز مہک سے رات نشیلی ہو کر جھوم اُٹھتی تھی۔ نرگس اور نیلوفر کے پودے الگ اپنی بہار دکھاتے۔ ویران کیاری میں پڑے کپکپاتے خشک پتوں کی جگہ اس سرے سے اُس سرے تک تمہارے لبوں کی لالی چرا کر سرخ گلاب مہکا کرتے تھے۔ کیلے کے درخت تو خود تم نے یہ کہہ کر کٹوا دیئے تھے کہ انہیں جب تک تراشا نہ جائے پھل نہیں دیتے۔ مگر سبز پتوں کی اوٹ سے انگوروں کے خوشے جھانکا کرتے تھے، جیسے کواڑ کی اوٹ سے سندر کنیائیں بر دکھاوے کے لئے آنے والے شرمیلے بر کو دیکھتی ہیں۔ جب چھوٹے بھائی عبدالحمید نظامی اور دوسرے بھائی بہن اپنے بچوں کے لشکر سمیت آتے تو تم کس گرم جوشی سے اُن کا استقبال کرتیں، اور کس قدر خاطر تواضع کرتی تھیں۔

اس چھوٹے سے باغیچے پر بچھے ہوئے گھاس کے سبز قالین پر بیٹھ کر، جہاں اب خاک اُڑتی ہے، وہ پر تکلّف کھانے کھایا کرتے تھے تم جلدی جلدی، اظہار مسرت کرتے ہوئے دسترخوان پر، کبھی ایک ڈش، کبھی دوسری ڈش، پانی سے بھرے بلّوریں جگ اور گلاس رکھتی،

ان کی خاطر مدارت میں لگی رہتیں۔ایک میلہ سا لگا رہتا، جیسے گھر میں کوئی بارات اُتری ہوئی ہو۔ممکن ہے مہمان نوازی کے اس اہتمام میں تمہارے فطری اخلاق ومرّوت اور خوش مزاجی کے پس پردہ احساسِ خودنمائی اور شوق نمود ونمائش بھی کارفرما ہو۔مگر دیکھو، سارے خاندان میں ایک میں ہی ایسے خوبصورت بنگلے کی مالک ومختار ہوں اگر چہ دل تسلیم نہیں کرتا کہ ایسے اوچھے خیال کا تمہارے دل ودماغ میں گذر بھی ہو۔تم تو سراپا خلوص وایثار تھیں میں چونکہ فطرتاً تنہائی پسند ہوں، مجھے بچوں کے شور وہنگامے سے سخت وحشت ہوتی۔کبھی کبھی تو چڑ چڑا ہو کر بڑبڑانے لگتا کہ میں نے فیض باغ کے بے فیض اور پس ماندہ علاقے سے نقل مکانی کر کے، ایک نئی خوبصورت سکیم سمن آباد میں اپنا نشیمن بنا کر ایک مصیبت مول لے لی۔آئے دن کی مہمان داری، اوپر سے بچوں کی ریل پیل، ایک ایک عزیز کے ساتھ سات سات بچوں کی قطار کہ گلی میں داخل ہوں تو آتے ہی چلے جائیں، ختم ہونے کا نام ہی نہ لیں۔اور پھر وہ دھما چوکڑی، وہ چیخ دھاڑ کہ الاماں والحفیظ۔لیکن میری اس کیفیت کو بھانپ کر تم آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈانٹ کر مجھے باور کراتیں کہ مہمان تو خدا کی رحمت اور پھر مہمان بھی کوئی غیر نہیں۔اپنا خون، اپنے ہی عزیز واقربا ہیں، کوئی کسی کے کھانے کا بھوکا نہیں ہوتا۔ہر آنے والا اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔خون کی کشش اپنوں میں کھینچ لاتی ہے ورنہ بن بلائے کون کسی کے گھر جاتا ہے۔مہمان نوازی، خلوص وہمدردی اور ایثار وقربانی کے علاوہ کئی اور بہت سی خوبیوں سے نوازتے ہیں۔ قدرت نے بڑی فراخ دلی اور فیّاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔تم خدمت گذار اور وفا شعار بیوی بھی تھیں۔اپنے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی اور اپنے بچوں کی اچھی ماں بھی تھیں، تم میری دوست بھی تھیں اور ہم راز بھی۔انیس وغم گسار بھی تھیں اور ہمدم ودمساز بھی، تم میرے عیبوں کی پردہ پوش، نام نہاد خوبیوں کی مدّاح اور عزّت وناموس کی محافظ تھیں۔تم نے کبھی کوئی غلط مشورہ دیا نہ کوئی فرمائش کی۔سوائے بچپن کی ایک آرزو کہ میرا کوئی اپنا گھر ہو۔شادی کے تیس صبر آزما برسوں کے بعد خالقِ کون ومکاں نے تمہاری یہ دیرینہ تمنا بھی پوری کر دی، جب کہ اُن دنوں سوائے ابّا جان کے خاندان کے سبھی افراد کرائے کے مکانوں میں رہائش پذیر تھے

ایک طرف تم اچھی بہو تھیں تو دوسری طرف اچھی ساس بھی تھیں۔تمہاری بڑی بہو تو تمہاری زندگی ہی میں اپنے شوہر پروفیسر اسلم عادل کے ساتھ شکر گڑھ میں رہنے لگی تھیں۔مگر تمہاری چھوٹی بہو صحافی اکرم کامل کی بیوی اور تمہاری بیٹیوں نے گھر کو اسی طرح صاف ستھرا رکھا ہوا ہے جیسا تمہاری زندگی میں ہوتا تھا۔گندگی سے تمہیں سخت نفرت تھی۔تم خود بھی ہر وقت کتنی صاف ستھری اور دُھلی دھلائی سی رہا کرتی تھیں۔البتہ باغیچے کی دیکھ بھال ان کے بس کا روگ نہیں تھا، روزانہ کھرپی لے کر پودوں کی تلالی کرنا، کاٹ چھانٹ اور صبح شام آبیاری کا کام میں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔میں نے تمہارے لئے یہ چھوٹا سا باغ لگایا تھا۔اس کی حفاظت بھی میری ذمہ داری ہے۔سوچتا ہوں اب کے موسم آتے ہی اس اجاڑ کیاری میں پھر سے گلاب کی قلمیں لگا دوں۔لیکن کیا اب وہ بہاریں لوٹ کر آ سکتی ہیں، جو صرف تمہارے دم قدم سے تھیں۔ہائے وہ دن کہ.....

صحنِ گلشن میں تبسّم سے ترے پھول کھلیں
نقشِ بہزاد ترے نقشِ قدم سے نکلے

کتنے ہی موسم بدلیں۔کتنے ہی پھول کھلیں، اب وہ بہاریں کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گی جنہیں تم اپنے ساتھ ہی لے گئی ہو۔اور میرے لئے کبھی نہ بھولنے والی یادیں چھوڑ گئی ہو۔عمر رفتہ کی راکھ کریدتا ہوں تو خود کو نولکھا پارک والے دومنزلہ حویلی نما مکان میں پاتا ہوں۔ یہ مکان ابّا مرحوم نے 1934ء کے اوائل میں بنوایا تھا۔امّاں روٹی پکا رہی ہیں، ابّا چولہے کے قریب بیٹھے حقّے کی نَے منہ سے لگائے کسی

کتاب کے مطالعے میں گم ہیں۔ میں ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کے لئے آتا ہوں اور اچانک اماں سے سوال کرتا ہوں۔

''امّاں! جب آپ مجھے روتا چھوڑ کر اپنے گاؤں بیگم آباد چلی گئی تھیں بھلا اس وقت میں کتنا بڑا تھا؟''

امّاں کے ہاتھ سے آٹے کا پیڑہ چھوٹ کر پرات میں جا گرا۔ جیسے انہیں کوئی دھچکا لگا ہو۔ انہوں نے حیرت اور تعجب کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر ابا کو مخاطب کر کے بولیں۔

''میں نے کہا کچھ سنتے ہو۔ یہ عزیز کیا کہہ رہا ہے؟''

''نہیں تو۔ کیا بات ہے؟'' ابّا نے رسالے سے نظریں اٹھائیں اور حقے کی نَے منہ سے الگ کر کے پوچھا۔

''اے وہ بات یاد ہے، جب ایک بار آپ سے ناراض ہو کر اپنے میکے بیگم آباد چلی گئی تھی۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں:

''ارے اس وقت تو، مشکل سے تین برس کا ہوگا۔''

ابّا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ فخریہ انداز میں بولے۔ ''بیٹا کس کا ہے؟''

اماں چڑ گئیں۔ ''بس بس، زیادہ اتراؤ نہیں۔ خون اس کی رگوں میں میرا بھی ہے۔ دودھ اس نے میرا پیا ہے۔''

''ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے۔ اس کا حافظہ بڑا اچھا ہے۔''

''امّاں! میں پیدا کب ہوا تھا؟'' میں نے کھٹ سے دوسرا سوال کر ڈالا۔

امّاں میرے بار بار سوالوں پر جھنجھلا کر ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔

''چپ رہ بڑا ابا تونی ہے تو۔'' مگر اس وقت اچھے موڈ میں تھیں۔ بڑے ارمان سے بولیں۔ ''بھئی تاریخ تو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ البتہ سن 24ء تھا۔ تمہارے ابا یہاں ریلوے کے درزی خانے میں ٹھیکیدار تھے۔ میں ہر سال آموں کے موسم میں اپنے میکے بیگم آباد جایا کرتی تھی؟ تمہارے ابا دادا کے وطن میرٹھ کا ایک قصبہ تھا۔ نو دس برس پہلے جب میں میرٹھ میں امید سے تھی، ساون کا مہینہ تھا آسمان پر کالے کالے بادل چھائے گرج رہے تھے، اور میں درد سے بری طرح تڑپ رہی تھی۔ بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ میرا دل دہل گیا—— ''اور تو اس دنیا میں آ گیا۔'' ابا نے لقمہ دیا:

''شاید اس لئے اس کا رنگ سانولا اور طبیعت سیمابی ہے۔''

اب میں ابّا سے مخاطب ہوا۔ ''ابّا جی میرٹھ کو میرٹھ کیوں کہتے ہیں؟''

''لو اور سنو! بھئی جس شہر کا نام میرٹھ ہے، اسے میرٹھ نہ کہیں تو اور پھر کیا کہیں؟''

''میں آپ سے یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ اس کا نام میرٹھ کیوں ہے؟

''اوہ..... تمہارا مطلب اب میری سمجھ میں آیا۔ جس طرح ہر شہر کی کوئی وجہ تسمیہ ہوتی ہے تم میرٹھ کی وجہ تسمیہ جاننا چاہتے ہو؟''

میں نے یونہی کچھ سمجھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو سنو! میں نے کسی تاریخ میں تو نہیں پڑھا۔ مگر سینہ بہ سینہ روایت چلی آتی ہے کہ جہاں آج کل شہر میرٹھ آباد ہے، صدیوں پہلے وہاں کوسوں تک ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ کورو اور پانڈوؤں کی مشہور جنگ شروع ہونے والی تھی۔ دونوں طرف گھمسان کا رن

پڑنے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔جس طرح ''ہیلن آف ٹرائے کی جنگ میں''۔

ابا بات کرتے کرتے رُک گئے اور بولے۔''اب یہ سوال نہ کر بیٹھنا۔ابا جی! یہ ہیلن کون تھی۔ بتاتے بتاتے صبح ہو جائے گی اور تمہارا میرٹھ بہت پیچھے رہ جائے گا۔''

''نہیں نہیں میں آپ سے اور کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

''اچھا تو جس طرح ٹرائے کی جنگ میں حملہ آور غنیم ایک فلک بوس چوبی گھوڑا میدان جنگ میں لے آئے تھے اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر دشمن پر شب خون مارنے کے ارادے سے گھوڑے کے پیٹ میں بنا ہوا ایک دروازہ کھول کر، سینکڑوں مسلّح جنگ جو زمین پر کود پڑے تھے اور شہر پر قبضہ کر لیا۔اسی طرح اس میدان میں پانڈو لکڑی کا ایک بلند و بالا رتھ بنا رہے تھے جس پر بیک وقت اگنی بان سے مسلح سینکڑوں سورما سوار ہو کر دشمن کے گھوڑ سوار دستوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔سینکڑوں ترکھان اور مزدور اسے تکمیل تک پہنچانے کے لئے شب و روز مصروف تھے۔گرد و نواح کے لوگ ٹولیوں کی شکل اس عجوبۂ روزگار رتھ کو دیکھنے جایا کرتے تھے۔راہ گیروں کے پوچھنے پر انہیں بتاتے کہ ہم مہارتھ کی یاترا کرنے جا رہے ہیں۔بس یہی مہارتھ وقت گزرنے کے ساتھ میرتھ بن گیا اور انگریز بہادر نے، بزدلوں اور غداروں کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد میرٹھ بنا دیا۔''

میں نے ابا سے ایک اور سوال کیا: ''ابا جی! ہم لاہور میں کب آئے تھے؟!!

''بھئی مجھے سن تو ٹھیک سے یاد نہیں لیکن جب پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ہم لاہور ہی میں تھے۔واقعہ دراصل یہ ہوا کہ تمہارے دادا میرٹھ کی فوجی چھاؤنی میں درزی کا کام کرتے تھے، ایک بہت ہی خوش پوش کرنل کو فراک کوٹ سلوانے کی ضرورت آ پڑی مگر پوری چھاؤنی میں کوئی ایک درزی بھی ایسا نہ تھا جو صاحب بہادر کے لئے ڈنر کے موقعے پر پہننے والا فراک کوٹ سی سکتا۔اگر کوئی یہ بیڑہ اٹھانے کی سکت رکھتا بھی تھا تو اس خوف سے حامی نہیں بھرتا تھا کہ اگر ذرا سی خامی بھی رہ گئی تو صاحب کا کپڑا ابھی ضائع ہو جائے گا جو اس نے ولایت سے منگایا تھا، اس صورت میں بجائے کچھ انعام ملنے کے صاحب بہادر کی ناراضگی مول لینی پڑے گی بلکہ ممکن ہے روزگار سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں۔مگر جب کرنل نے تمہارے دادا سے یہی فرمائش کی تو انہوں نے کہا صاحب بہادر اگر اپنا کوئی پرانا کوٹ یا اس کی تصویر دکھا دیں تو میں ضرور ٹرائی کروں گا۔صاحب نے اپنا پرانا کوٹ تو شاید کسی اردلی یا بھنگی کو دے دیا تھا لیکن تمہارے دادا کو ایک کیٹلاگ لا دی جس میں فراک کوٹ کے علاوہ اور بہت سے لیڈیز اور جینٹس لباسوں کے ڈیزائن موجود تھے۔تمہارے دادا نے پہلے تو کیٹلاگ میں دیکھ کر ڈیزائن کے مطابق کاغذ کے پیٹرن کاٹے۔پھر انہیں کپڑے پر رکھ کر کوٹ کے تمام حصے، دایاں، بایاں، بیک، آستین، کالر اور پاکٹ وغیرہ کی کٹنگ کی۔اس کے بعد کوٹ کو کچا کر کے صاحب کی ٹرائی کی کہ کہیں جھول یا کوئی اور نقص رہ گیا ہو تو اُسے درست کر لیا جائے۔ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد، جب انہوں نے شکنیں دور کرنے کے لئے اپنے گھٹنوں پر روئی کے بندر کھ کر آئرن کی تو گویا مردے میں جان پڑ گئی۔

(جاری ہے)

◆◆◆

سفر نامہ

سفرِ شمال

.....7.....

طارق محمود

خیبر، تیرہ، باجوڑ میں ایسے کئی بحالیاتی منصوبوں کے ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ باجوڑ سے بار بار پیغام آتا تھا۔ پرزور دعوت تھی۔ وجہ بھی معقول تھی۔ سول سروس اکیڈیمی میں میرا ایک زیرِ تربیت افسر، سلیم خان ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا پولیٹیکل ایجنٹ بن چکا تھا۔ سلیم اُن دنوں باجوڑ میں تعینات تھے۔ میں نے وقت نکال کر باجوڑ جانے کا پروگرام ترتیب دے دیا۔ سلیم خان تو جیسے پہلے ہی سے منتظر بیٹھا تھا۔

پشاور سے نکلے تو لینڈ کروزر شب قدر کی سمت فراٹے بھر رہی تھی۔ شہر کی رونق عبور کی تو خاصہ داروں کی تیز رفتار ڈبل کیبن (Double Cabin) نے آن لیا۔ ہم اس علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ شاہ محمد تیز رفتار ڈبل کیبن کا پیچھا کر رہا تھا۔ خاصہ دار گاڑی میں لوہے کے فریم تھامے ڈبل کیبن کے کھلے حصے میں کھڑے تھے۔ تیز ہوا میں اُن کی شلوار قمیض اور گھنے دراز بال ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔

ہم اس وقت مومند ایجنسی میں سے گزر رہے تھے۔ ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ فدا خان نے بھی مدعو کر رکھا تھا۔ طے پایا کہ باجوڑ سے واپسی پر فدا خان سے بھی ملاقات کی جائے گی۔ بل کھاتی سڑک قرب و جوار میں سنگلاخ پہاڑوں اور عمودی چٹانوں کا ناختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ ہی دیر میں خاصہ داروں کی ڈبل کیبن کی رفتار میں کمی آ گئی۔ شاہ محمد نے بھی گاڑی کی سپیڈ کم کر دی۔ آبادی شروع تھی۔ ہم اس وقت مومند کے صدر مقام 'غلانائی' سے گزر رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ دوکانوں اور چائے کے کھوکھوں کی قطار دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک کنارے سست روی سے گھوم رہے تھے۔ کھلے گھیرے کے شلوار قمیض اور سر پر چترالی اور سواتی ٹوپیوں میں ملبوس ان لوگوں کے چہروں سے سکون اور طمانیت عیاں تھی، غلانائی سے اگلا سفر بھی خاموشی میں کٹ گیا۔ دن ڈھل چکا تھا اور شام کے سایے پھیل رہے تھے۔ ہم باجوڑ کے صدر مقام خار پہنچ چکے تھے۔ قصبہ نما شہر کے صدر بازار سے گزرنے پر کچھ ہی دیر میں ہم پولیٹیکل ایجنٹ کی رہائش گاہ سے ملحقہ اینیکسی (Annexe) میں تھے۔ سلیم خان بڑے تپاک سے ملا۔ میں نے کمرے میں اپنا سامان رکھا اور واش روم سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ سلیم کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ شروع تھی۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں چائے بھی آ گئی۔ طے پایا کہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔ رات کھانے پر سلیم کے ہاں مدعو تھے۔ جیسے سلیم رخصت ہوا میں کمر سیدھی کرنے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا۔ آنکھ لگتے پتہ ہی نہ چلا۔ آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ تیار ہوا اور ایک ملازم کے ہمراہ مختصر سا راستہ طے کر کے سلیم کے ہاں پہنچ گیا۔ وہاں چند اور لوگوں سے

بھی ملاقات ہوئی۔ اگلے روز کا پروگرام طے کیا۔ خار میں مقامی ہسپتال کا وزٹ تھا۔ فراغت ہوتے ہی پہاڑوں کے دامن میں گھرے 'برنگ' کے علاقے کا دورہ تھا جہاں پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈیپارمنٹ کی معاونت سے کئی منصوبے جاری تھے۔

سلیم کے ہاں حسن یوسف زئی نامی نوجوان افسر سے ملاقات ہوئی۔ حسن کی حال ہی میں بطور اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ تعیناتی ہوئی تھی۔ اس سے قبل وہ چترال میں تھا۔ پوسٹنگ کی خبر ملتے ہی میں نے چترال سے فوری طور پر نکلنے کا ارادہ کرلیا، حسن کہنے لگا ''چند روز میں لورائی ٹاپ بالکل بند ہو جاتا۔ دس دس فٹ برف کی تہیں لگ چکی تھیں۔ چترال سے رخصتی کا پروگرام بنایا تو معلوم ہوا، اس وقت دِیر پہنچنے کے لیے ٹرانسپورٹ نہ تھی۔ وہ اپنی روداد سنا رہا تھا! مزید تاخیر کا مطب یہ تھا کہ مجھے اگلے چار پانچ ماہ تک راستے کھلنے کا انتظار کرنا پڑتا، حسن نے اپنی گفتگو جاری رکھی اُسے باجوڑ پہنچنے کی جلدی تھی۔ بالاخر طے پایا کہ گرم چشمہ سے سرحد عبور کر کے افغانستان سے ہوتا ہوا پشاور پہنچا جائے۔ میرے لئے یہ حیران کن انکشاف تھا۔ سلیم بتانے لگا کہ جاڑے کے دنوں میں جب راستے مسدود ہو جاتے ہیں تو چترال اور پشاور کے درمیان، افغانستان کے صوبے کنڑ کے راستے ہی سفر کیا جانا چاہیے۔ سرحدیں اور سیاسی اکائیاں اور ملکوں کا وجود اپنی جگہ۔ جغرافیائی عنصر بھی کتنا اہم تھا جسے ہم اپنی معاشرتی اور تمدنی زندگی میں بھلا بیٹھے۔ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ممالک بھی ایک دوسرے پر اسی طرح کا انحصار کئے ہوئے تھے۔ جغرافیائی اور معاشی معروضیت نے انہیں ایک منڈی (Market) اور برادری (Union) میں پرو دیا اور عہدِ حاضر میں اہلِ یورپ اپنی کاروں میں سوار سفر کرتے ہوئے دن میں کئی ملکوں کی سرحدیں عبور کر جاتے ہیں۔

حسن نے افغان سرحد عبور کی تو شام ہو چکی تھی۔ افغان حکام کو خبر تھی کہ کسی پاکستانی افسر کا گزر تھا۔ رات اُس نے وہیں قریبی بستی میں قیام کیا۔ کسی اہم سرکاری عہدے دار کی رہائش گاہ تھی۔ غالباً ڈپٹی گورنر کے عہدے کا افغانی منصب دار تھا۔ کہنے کو تو وہ ڈپٹی گورنر تھا لیکن اُس نے ایک حجرے میں حسن کا خیر مقدم کیا۔ لالٹین کی مدہم روشنی میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ لال لوبیے کے شوربے اور افغانی نان اور قہوے سے تواضع کی گئی۔ حسن کے افغانی میزبان کو موسیقی سے بھی شغف تھا، طالبان حکومت کے اہم عہدے دار کا شوق جان کر اُسے قدرے حیرت بھی ہوئی حسن وہاں سے رخصت ہوا تو میزبان نے چند ہندی گانوں کے کیسٹ کی فرمائش بھی کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ پشاور پہنچتے ہی خوبرو جواں سال افغانی عہدے دار کو گیتوں کے کیسٹ ارسال کرے گا۔

میں رات گہری نیند سویا گیسٹ روم کی نیم وا کھڑکی سے خنک ہوا کے جھونکوں نے اپنا کام دکھایا۔ صبح اُٹھا تو تازہ دم تھا۔ مصروف دن تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں اور سلیم نکل پڑے۔ شہر سے نکلے تو دائیں بائیں کھیتوں کے سلسلے تھے۔ نظریں دور تک اُٹھتیں تو سرمئی پہاڑی سلسلے دکھائی دیتے۔ ہم اس وقت عین سڑک سے ہٹ کر، پختہ دیہی سڑک پر تھے۔ سڑک کی سطح بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ہم گاہے گاہے رکتے جاتے۔ راستے میں زیرِ تعمیر سکول، ڈسپنسریاں، دیہی راستوں کی کشادگی کے منصوبے دیکھ رہے تھے۔ کہیں کہیں مقامی آبادی کی مدد سے پانی کے چینل (Channel) بن رہے تھے۔ ہم جیسے ہی کہیں رُکتے، قریبی بستیوں سے لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ سلیم بڑے انہماک سے اُن کی بات سنتا۔ اہم نکات نوٹ کرتا۔ میزبانوں نے کسی سکول اور کہیں کسی ڈسپنسری کے دالان میں چارپائیاں اور کرسیاں بچھا رکھیں تھیں۔ سنجیدہ گفت وشنید کے بعد ہماری قہوے کی پیالی سے تواضع ہو رہی تھی۔

دشوار گزار سفر کے بعد اس وقت ہم پہاڑی چوٹی کے قریب سے گزر رہے تھے۔ قریب ہی پتھروں سے بنی ایک چیک پوسٹ دکھائی دی جس پر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ غالباً باجوڑ سکاؤٹس کی چیک پوسٹ تھی۔ ڈیوٹی پر معمور شخص ٹکٹکی باندھے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ سلیم نے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا۔ اُس شخص نے بھی جواباً بڑی خوش دلی سے ہاتھ ہلایا۔ ہم جیسے ہی پہاڑ کی چوٹی سر کر کے دوسری طرف پہنچے

سامنے عجب نظارہ تھا۔ دور دور تک پہاڑی سلسلوں میں گھری کشادہ وادیاں اور پگڈنڈیوں کا لامتناہی سلسلہ تھا، لوگ سبھی رفتار سے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ قریب ہی ایک کٹیا کے باہر دراز قد شخص دکھائی دیا اُس کی گھنی سیاہ داڑھی اور پگڑی کا طرّہ تیز ہوا میں پھریرے لے رہا تھا۔ وہ شخص صاف ستھرے سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ اُس نے دور سے ہاتھ ہلایا۔ سلیم نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ کٹیا کے اوپر سفید رنگ کا جھنڈا پھریرے لے رہا تھا۔ قریب ہی ایک شکستہ بنچ اور چٹائی پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ اُس شخص کی گردن میں سٹیتھو سکوپ حمائل تھا۔ اس ویرانے میں یہ عجیب منظر تھا۔ یہ شخص پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے، شہر میں کلینک ہے، سلیم بتانے لگا، خدمت خلق کے جذبے سے معمور ہفتے میں دو تین دن، چند گھنٹوں کے لئے مریض دیکھنے یہاں آ جاتا ہے۔ لوگوں کا مفت علاج کرتا ہے، سلیم کی بات سن کر میں قدرے چونکا یہاں تک دور دور تک کہیں آبادی کا نشان نہ تھا۔ اُس نے میری حیرت دور کرتے ہوئے بتایا کہ وادی میں ہر طرف بکھری ہوئی بستیاں تھیں لوگ دور دراز سے چلے آتے۔ لوگ جیسے ہی کٹیا کے اوپر پھڑ پھڑاتا سفید جھنڈہ دیکھتے انہیں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر ہو جاتی۔ حاجت مند لاٹھی ٹیکے کشاں کشاں، بل کھاتی پگڈنڈیاں عبور کرتے کرتے یہاں پہنچ جاتے۔ کمزور، لاغر اور بوڑھے مریضوں کو پالکیوں اور چارپائیوں پر لاد کر لے آتے۔

برنگ کی مختلف آبادیوں سے ہوتے ہوئے اب ہم واپسی کے سفر پر تھے۔ مین روڈ پر پہنچے تو سلیم نے دائیں جانب پہاڑی سلسلے کی طرف اشارہ کیا۔ نوے کی دہائی کے وسط میں ان پہاڑیوں پر قبضہ ہو گیا تھا۔ باجوڑ اور اس کے ملحقہ علاقوں میں صوفی محمد اور اُس کے ساتھیوں نے یورش بپا کر دیا تھی۔ صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت سیاسی شدت اختیار کی کہ اس کے داعی و حامی اور قانون نافذ کرنے والے ادارے ایک دوسرے کے سامنے صف آرا تھے۔ شدت پسندوں نے ان پہاڑوں پر قبضہ کر لیا اور نشیبی علاقوں کو راکٹوں کی زد میں لے لیا۔ کئی روز تک علاقے بھر میں گولے داغتے رہے۔ حکومت نے کڑی کوششوں کے بعد اس اُفتاد پر قابو پایا۔ سارے علاقے کو شدت پسندوں سے صاف کرایا۔ ان واقعات کو دو دہائیاں ہو گئیں۔ مسائل آج بھی وہیں کھڑے تھے ان میں مزید پیچیدگی در آئی تھی۔ وقت کے ساتھ باجوڑ کی پرسکون وادیوں کو کیسی کیسی قیمت چکانا پڑی، یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

رات گئے ہم باجوڑ سے بہت دور نکل آئے تھے۔ اس وقت ہم قبائلی علاقے کی حدود سے باہر آ چکے تھے۔ دیر زیریں میں تیمر گرہ کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ برہنگم ٹریفک رواں تھی، کچھ دیر شہر کے معروف چوک میں رُکے۔ ایک راستہ اوپر دیر سے ہوتا ہوا چترال جا رہا تھا۔ دوسرا راستہ چکدرہ سے ہوتا ہوا، سوات کی طرف جاتا، مالاکنڈ کی طرف ہوتے تو تخت بائی اور مردان نکل گئے۔

اگلے دن پشاور واپسی تھی۔ باجوڑ سے نکلتے دوپہر ہو گئی۔ غلہ ئی میں فدا میرے انتظار میں تھے۔ چائے سے تازہ دم ہوا۔ فدا نے میری دلچسپی کا اندازہ کرتے ہوئے جیپ اسٹارٹ کی اور راستے کی دھول اُڑاتے ہوئے بے آب پہاڑوں کا رُخ کیا۔ کہیں کہیں اِکا دُکا کچے گھر دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت ہم پہاڑوں کے بالکل قریب تھے۔ ہر طرف خام راستے دکھائی دے رہے تھے۔ فِدا بتا رہا تھا انہی راستوں سے افغانیوں کی آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری تھا۔ سرکارِ برطانیہ نے ڈیورنڈ لائن تو کھینچ دی۔ اس وقت زمین پر ہمیں اس حدِ فاصل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی ہم ڈیورنڈ لائن کو ایک زمینی حقیقت نہ بنا پائے تھے۔ اغلباً اسی بنیاد پر سرحد کے دونوں اطراف سے آج بھی مبینہ دراندایاں جاری تھیں۔

(ختم شد)

◆◆◆

سورج کے رُخ پر

.....1.....

ڈاکٹر ابدال بیلا

مجھے اس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ زندگی میں جن جن راستوں پہ قدم رکھنے ہیں، وہ رستے خدا نے مسافر کی ہتھیلی پہ کھرچے ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا تھا، ہر سفر مسافر اپنی مرضی اور منشاء پر اپنی سہولت اور مجبوری دیکھ کے چنتا ہے، یہ نہ جانتا تھا کہ سفر خود اپنے مسافر کا انتخاب کرتا ہے۔ راہیں اپنے مسافر کی راہ تکا کرتی ہیں۔ رستے مسافر کو انگلی سے لگائے قدم قدم چلائے پھرتے ہیں۔ کس سفر میں کتنی تھکان ہے کتنی سرشاری، سب پہلے سے لکھا ہوتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا، کیا ہونے والا ہے۔ میں اسی میں مست تھا جو ہو رہا تھا۔ وہ بڑے خوشگوار دن تھے۔ میں کشمیر کی جنت نظیر وادی میں دور تک پھیلی اپنی سپاہ کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ جیپ میں بیٹھ کے چیڑ، دیودار اور چنار کے پہاڑ جنگلوں میں بنی بل کھاتی کچی پکی اونچی نیچی سڑکوں پہ گھوما کرتا تھا۔ ان دنوں میری سب سے چھوٹی بیٹی کے پیدا ہونے میں کچھ مہینے رہتے تھے۔ تین بیٹے تھے۔ تیسرا چھوٹو تو ان دنوں پیمپر پہن کر قدم قدم چلا کرتا تھا۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر بنے گھر میں گھاس کا کھلا میدان تھا جہاں پولو بھی کھیلی جا سکتی تھی۔ سیب، آڑو، ناشپاتی اور آلو بخارے کے درخت پھلوں سے لدے رہتے۔ دو بڑے بیٹے تیسری اور چوتھی جماعت کے طالب علم تھے، میں نے انہیں حافظِ قرآن بنانے کا ارادہ کر لیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن اپنی بٹالین مسجد کی توسیع کراتے ہوئے میں نے خطیب صاحب سے کہا آپ اڑوس پڑوس کے سب بچوں کو قرآن پڑھائیں، انہیں حفظ کرائیں۔ نماز کے بعد کی وہ مسجد میں ایک غیر رسمی سی گفتگو تھی۔ چونکہ کہی ہوئی بات اس وقت کمانڈنگ آفیسر کے منہ سے نکلی تھی اس لئے سب نے مستعدی سے سر ہلا دیا۔ خطیب صاحب کی نگاہ میں ایک شک کی لہر ہلی۔ جیسے شکوہ کرنے والے ہوں کہ اپنے بچے حفظ کے لئے ادھر بھیجے گا کون؟ میں نے اس کی نگاہ بولی پڑھتے ہی کہا، میرے دونوں بیٹے کل سے سیپارہ لے کر پہنچ جائیں گے۔ وہ سکول نہیں، صرف اس مسجد میں پڑھیں گے، جب تک قرآن حفظ نہ ہو۔ ایسا ہی ہوا۔ مسجد آباد ہو گئی۔ مسجد کے برابر میں میرا گھر تھا۔ گھر پہ انہی دنوں میرا لاڈلا چھوٹا بھائی بلال آ گیا۔ اس نے مشغلے کے طور پہ پامسٹری کا علم حاصل کیا ہوا ہے۔ جہاں کہیں کسی سے ہاتھ ملاتا ہے تو اسی ہاتھ کو کھول کے اس کی ہتھیلی پڑھنے لگتا ہے۔ ایک دن میرا ہاتھ دیکھتے دیکھتے وہ ایک دم اچھلا اور بڑے جوش سے خوش خبری سنانے والا چہرہ بنا کے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے متوجہ کر کے بولا، بھائی جان! یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔

''یار، ہاتھ میلا ہے، دھو کے آتا ہوں۔''

''نہیں، ادھر تو سفر کی لکیریں ہیں۔''

''ہاں، یہاں اکثر پہاڑ پہ چڑھنے اترنے کا سفر رہتا ہے۔ وادی لیپا میں میرا ہسپتال ہے۔ ادھر اکثر جاتا ہوں۔''

''نہیں، دور، بہت دور تک کا سفر ہے۔''

''لاہور بھی جاتا ہوں۔''

''بھائی جان'' اب اس نے میرے کندھے پکڑ لئے اور انہیں ہلاتے ہوئے بولا ''یہ بیرون ملک سفر کی لکیریں ہیں۔ ایک نہیں، کئی ملک۔''

میں نے پہلی بار بلال کی بات کو سنجیدگی سے سنا۔ اگلے لمحے ہی دل میں خیال آیا، اللہ کے بندے تُو فوج کا ملازم ہے، کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا چیف ایگزیکٹو تھوڑی ہے۔ یہ دل لگی میں خوش کر رہا ہے، خوش ہو جا۔ میں خوش تو ہوا، پھر اپنا شک بول دیا۔ بلال جلال میں آ گیا، ادھر ادھر ہاتھ مار کے ایک کاغذ اٹھایا، اس پہ لکھا ''اس سال 1997ء میں آپ مغرب کی طرف ہوائی سفر سے کئی ممالک میں جائیں گے۔ اگر میری بات غلط ہوئی تو میرا نام بدل دیجئے گا۔'' نیچے دستخط کئے، تاریخ ڈالی اور پورا ایفی ڈیوٹ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے کاغذ تو پکڑ لیا مگر ہنستا رہا۔ دل خوش بھی تھا مگر شک وشبہوں میں پلا ہوا تھا۔ کاغذ تہہ کر کے میں نے اسے اپنے پرس کی اندرونی اس خفیہ درز میں ڈال دیا جس میں مہینے کی تنخواہ کا آخری ہزار کا نوٹ چھپا کر رکھتا تھا۔ پھر بلال کی گردن پکڑ کے ہنستے ہوئے کہا'' اب تُو اپنا نیا نام سوچنا شروع کر دے۔ یہاں کشمیر کے پہاڑ سے کسی فوجی افسر کا مغرب کی طرف اڑنا ایسے ہی ہے جیسے سورج اسے خود بلانے آیا ہو۔ تو نے خوش کرنا تھا، کر دیا۔ اب ڈر کہ تیرا نیا نام مغربی لہجے میں بلال سے بالٹی موڑ نہ بن جائے۔'' بات ہنسی مذاق میں ٹل گئی۔ بلال کا لکھا کاغذ میرے پرس میں ہی تھا، ابھی اس مہینے کے آخر میں اس کاغذ کے ساتھ پڑے ہزار کے نوٹ کے نکلوانے کی باری نہ آئی تھی کہ جی ایچ کیو سے ملٹری سیکرٹری کا فون آ گیا۔ ''کرنل صاحب، آپ سامان سمیٹنا شروع کر دیں۔ ایم ایس سی ایڈوانس ہاسپٹل مینجمنٹ کورس کے لئے آپ کا نام آ گیا۔ کل تک سگنل پہنچ جائے گا۔'' اس وقت تک میں یہی جانتا تھا کہ یہ کورس اگلی ترقی کے لئے ضروری تو ہے مگر ہے یہ راولپنڈی میں ہی۔ ادھر میرے دو بیٹے فوجی مسجد میں حفظ میں لگے تھے۔ تیسرا گھر کے گھاس میدان میں گرے ہوئے پکے سیب، آڑو اور آلو بخاروں سے پل رہا تھا۔ میں نے فون کرنے والے کو بڑی دلیلیں دیں کہ ابھی رہنے دیں، اگلے سال کے لئے میرا نام رکھ لیں۔ اس نے ایک نہ سنی۔ آخر میں قرآن کو بیچ میں لے آیا۔ دیکھیں، میرے بیٹے قرآن حفظ کر رہے ہیں، ان کا حفظ رہ جائے گا۔ پہلی بار جی ایچ کیو کی طرف سے آتی آواز مدھم ہوئی۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ پھر اس آواز کا لہجہ بدلا جیسے اس نے سر پہ رکھوایا قرآن ایک طرف سرکا دیا ہو اور وہی پاٹ دار آواز آئی ''حفظ قرآن ادھر راولپنڈی میں بھی ہوتا رہے گا، آپ تیاری کریں۔ تین دن بعد آپ کو رپورٹ کرنی ہے'' اور فون بند ہو گیا۔ اگلے دن تحریری حکم نامہ بھی پہنچ گیا۔ تین دن میں کھلے بھرے گھر کا سامان تھوڑی پیک ہوتا ہے۔ بہرحال سامان پیک کرنے والے پیکنگ میں جت گئے اور میں راولپنڈی پہنچ گیا۔ جی ایچ کیو کے ساتھ ہی سی ایم ایچ کے پچھواڑے میں ہمارا پوسٹ گرایجویٹ میڈیکل کالج ہے۔ وہاں ہماری ایم ایس سی شروع ہو گئی۔ اس وقت تک کسی کو علم نہ تھا کہ اس کورس کا ایک حصہ ملک سے باہر پڑھایا جانا ہے۔ ایک آدھ مہینے بعد کشمیر سے سامان اور بچے بھی پہنچ گئے۔ راولپنڈی میں نیا گھر بھی مل گیا۔ سامان پھر کھل گیا۔ ایک فوجی مسجد میں بچے بھی قرآنِ مجید حفظ کرنے لگے۔ بڑا بیٹا حارث حفظ میں تیز تھا، چھوٹا سست۔ کشمیر میں تو شاید اسے سکول سے آتے جاتے یونیفارم میں بچے کم نظر آتے، ادھر تو ہر صبح سکول بس گھروں کے آگے ٹیں ٹیں کرتی، بچے بھاگتے دوڑتے، چڑھتے اترتے۔ یہ دونوں سر پہ ٹوپیاں رکھے لوگوں کے گھروں میں سیپارے پڑھنے والے مسکین بچوں جیسا

حلیہ بنائے مسجد کی راہ لیتے۔ایک دن چھوٹا بیٹا نبیل باغی ہوگیا۔بولا''میں نے سکول جانا ہے۔'' کہا''چند مہینے میں حفظ کرلو، پھر سکول کالج ہر جگہ پڑھنا ہے۔''بولا:''نہیں ابھی۔'' ناچار اسے سکول داخل کرادیا۔ بڑا اکیلا ہی بڑی باقاعدگی سے مسجد جاتا رہا، آٹھ مہینوں میں قرآن حفظ کرگیا۔مگر ابھی اس کا آٹھواں مہینہ نہیں آیا تھا کہ خبر ملی کہ ہماری ایم ایس سی کلاس کی باقی پڑھائی جرمنی میں ہوگی، تیاری کرو۔ یہ خبر سنتے ہی مجھے اپنا چھوٹا بھائی بلال اور اس کا لکھا ہوا دعویٰ یاد آ گیا۔ پرس نکال کے اس کی تحریر پھر پڑھی۔ نیچے اس کے دستخط اور تاریخ دیکھی۔فون اٹھا کے اس کا نمبر ملایا۔وہ میری ہیلو سنتے ہی بولا:''بھائی جان! یورپ کب جارہے ہیں آپ؟''

''یار، یہ بتا ہاتھ کے سفر کی لکیروں پہ رخ بھی لکھا ہوتا ہے؟''

بولا:''ہاں جی۔''

میں ہنستے ہوئے بولا:''بلال بادشاہ تُو بچ گیا۔سمجھ آ گئی اللہ کو تیرا یہی نام بہت پسند ہے۔اس نے اسے بدلنے نہیں دیا۔جرمنی جانے کا حکم آ گیا ہے۔'' اس نے فون پہ نعرہ لگایا، بولا''صرف جرمنی نہیں، بہت دور دور تک، بہت ممالک میں جانا ہے آپ کو۔''

''دیکھ تُو پھر پھیل رہا ہے، میرے لئے یہی بہت ہے۔''

''میں کہہ رہا ہوں ناں بھائی جان، جرمنی کے ساتھ باقی یورپ بھی اور بھی بہت آگے مغرب میں۔'' اب میں فون پہ اسے کیا سمجھاتا کہ آگے مغرب میں تو سمندر ہی سمندر ہے۔

کلاس میں باقی دوستوں سے جرمنی کے سفر کی باتیں ہونے لگیں۔ پتا چلا ادھر تھوڑے دنوں بعد لمبی مدت کی چھٹیاں ملیں گی۔ کلاس میں سفر کے معاملات طے کرنے کے لئے کمیٹیاں بن گئیں۔ پاسپورٹ، ویزے لگوانے اور ٹکٹ بنوانے کی ذمہ داری مجھے مل گئی۔ چونکہ ہمیں نیلے سرکاری پاسپورٹ ملے تھے، اس لئے دنیا کے زیادہ تر ممالک میں تو جانے کے لئے ہمیں ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ان ممالک میں جرمنی، سویڈن، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، سپین، ترکی اور چین وغیرہ جیسے کوئی پینتیس چالیس ممالک کے نام تھے۔ پھر بھی ساتھی افسروں نے جن جن ممالک میں جانا تھا، اس کے نام لکھ لکھ کے مجھے دینے لگے۔اب جب دوسروں کے ویزے لگوانے ہی تھے تو اپنے پاسپورٹ سے کیا دشمنی تھی۔یوں دیکھا دیکھی میں میں نے بھی اپنے پاسپورٹ کو ویزوں سے بھر لیا۔

سویڈن میں تو میری ایک سالی رہتی تھی۔اس کی فیملی ادھر تھی۔ادھر جانے کا سن کے میری بیگم بھی مسکرائی۔ پہلے مسکرائی پھر منہ بسورنے لگی۔میں نے پوچھا، یہ کیا۔ پہلے سن کے خوش ہوئی اور پھر دکھی ہوگئی۔تم تو وہ کررہی ہو جو آدم خور کے ہاتھ آئی شہزادی نے کیا تھا۔ بولی:''میں بھی تو آدم خور کے ہتھے چڑھی ہوئی ہوں۔خوش اس لئے ہوئی کہ میری بہن اور اس کی فیملی سے ملنے جارہے ہو۔ پھر دل بے چین ہوا کہ بہن میری ہے اور جاتم رہے ہو'' سویڈن کی ایک ادبی انجمن کو پتا چلا تو انہوں نے سٹاک ہومز میں میری صدارت میں ایک جلسہ رکھ دیا۔ڈنمارک میں میرا یار نصر ملک ریڈیو ڈنمارک کی اردو سروس کا انچارج تھا۔پچھلے پچیس سالوں سے ادھر بیٹھا تھا۔میری ایک کتاب کا اس نے ڈینش میں ترجمہ بھی کیا۔اسے فون کیا تو لگا کہ وہ فون کے دوسرے سرے پہ ناچ رہا ہے، خوشی سے۔اب یورپ میں مجھے جن دوسرے ملکوں میں پھرنے کا شوق تھا وہ فرانس، انگلینڈ اور سپین تھے۔فرانس والوں نے شنجن ویزہ لگا کے مجھے پورے یورپ کے سیر سپاٹے کی کھلی چھٹی دے دی۔لندن میں میرا بھتیجا پوسٹ گریجوایٹ انجینئرنگ کرکے گوروں کے پل بنوا رہا تھا۔جب سے وہ پیدا ہوا، اسے منا ہی کہتا آیا تھا۔اس کا اصلی نام سوچنے میں کچھ دیر لگی۔اسے فون پہ بتا دیا کہ کب پیرس سے سمندر کے نیچے بنی ٹنل میں چلتی ٹرین پہ بیٹھ کے آؤں گا، اگر

خدا نے چاہا۔ پیرس اور اس کے مضاف کے سیر سپاٹے کا سارا انتظام عکسی مفتی نے یونیسکو کی ایک نائب صدر کے ذمے لگا دیا۔ وہ لوک ورثہ کی وراثت سے مالا مال ایک منچلی حسینا تھی۔ سپین میں بھی جانے کا سوچا ہوا تھا، انتظامات ابھی کرنا تھے۔ انتظامات میں ہر کوئی لگا ہوا تھا، اسی کلاس میں میرا ایک گہرا دوست کرنل جہانگیر تھا، جو بعد میں جرنل بنا۔ ہم دونوں سکول کے بچوں کی طرح اکٹھے مل کے پڑھائی کیا کرتے تھے۔ اسی سے چھٹیوں میں جرمنی کے علاوہ یورپ گھومنے کا پروگرام ڈسکس کرنے لگا۔ اس نے پوچھا، امریکہ پہلے گئے ہو؟

''نہ، سعودی عرب سے آگے پہلی بار جا رہا ہوں۔''

بولا ''پھر امریکہ کا ویزہ لگوالو۔ ابھی ادھر ہو آؤ، سپین بعد میں سہی۔''

''اسے پہلے دیکھنا تیرا ضروری ہے۔''

''ضروری کیوں؟''

''ضروری اس لئے کہ تمہیں، تمہارے سوالوں کا جواب نہیں ملے گا، اگر ادھر نہ گئے۔ سمجھ نہیں آئے گی تمہیں۔''

''کس بات کی؟''

''اس بات کی کہ سپین ہم مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا کیسے اور باقی دنیا بھر کے مسلمان ملکوں کو سپین بنانے کا منصوبہ کدھر بن رہا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں، تمہاری بات۔''

''دیکھ، پوری دنیا کو اپنی ہتھیلی پہ رکھ کے نچانے والے ہیں کون، ہیں کیسے اور ہیں کیوں؟ یہ پہلے دیکھ۔''

''اچھا۔''

''جی۔ ویسے سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک تم اپنی آنکھوں سے نیویارک کا براڈوے، باسٹن کی آکسفورڈ اور واشنگٹن ڈی سی کا خلائی میوزیم نہ دیکھ لو۔''

یہ 9/11 سے پہلے کی بات ہے۔ اگلے دن میں امریکی سفارت خانے پہنچ گیا۔ ادھر دیکھا، لوگ باہر لمبی لمبی قطاروں میں بھکاریوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ جگہ جگہ ناکہ بندیاں ہیں۔ سٹیل کے کڑوں والے تالا بند گیٹ ہیں، جیسے بندہ کسی سفارت خانے میں نہیں، نوٹ چھاپنے والی سیکورٹی پرنٹنگ پریس کے اندر جا رہا ہے، جہاں صرف ہزار ہزار کے نوٹ چھاپے جاتے ہیں۔ اندر ویزہ افسروں کی الگ الگ کھڑکیاں تھیں، جن کے باہر کھڑکی کے جھروکے پہ جھکے اچھے خاصے معزز نظر آتے لوگ گال کھڑکی کے آگے کی پتھر سل پہ ایسے ادب سے ٹکائے کھڑے تھے جیسے کسی درگاہ پہ حاضر ہوں۔ منہ پو پلا کئے، آنکھیں پھیلائے، عاجزی کی ہر انتہاء سے آگے کی کوئی تصویر بنے وہ ویزے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ ایک دو کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی گفتگو سنی۔ کھڑکی کے اندر بیٹھا کوئی گورا یا کالا ایسے تفاخر سے پھیل کے بیٹھا ہوا تھا، جیسے وہ انسان نہ ہو، خدا ہو، یونان کا غصیلہ جیوسپیٹر دیوتا ہو یا ہند کی کالی دیوی میں حلول ہوا شیو مہاراج، جسے لوگوں میں اپنی پسند اور ناپسند کے لحاظ سے رزق، زندگی اور موت بانٹنے کی گدی ملی ہوئی ہو۔ کھڑکی پہ جھکی کوئی بوڑھی عورت ہاتھ میں پکڑے کاغذوں کے پلندے میں سے کبھی بینک سٹیٹمنٹ نکال کے ویزہ افسر کے سامنے کرتی۔ وہ الٹے ہاتھ کی پشت سے وہ کاغذ پرے پھینکتا اور منہ میں کوئی ثقیل سی گالی بڑبڑاتا۔ وہ عورت پھر دوسرے ہاتھ میں پکڑے کاغذوں میں اپنے گھر، پلاٹ، دکان یا پلازوں کی رجسٹریاں سیدھی کر کے کھڑکی کے

جھروکے سے آگے سرکاتی اور کہتی، ''دیکھیں حضور! یہ سب میرے نام ہیں۔ میں وہاں رکوں گی نہیں، واپس لوٹ آؤں گی۔ بس اپنے بیٹے کو ایک بار ملنا ہے۔'' اندر سے پھر کوئی نفیس سی گالی بولی جاتی جسے سن کے الٹا وہ عورت مسکراتی اور فریادی لہجے میں ایک بھکارن کا شدومد شامل کر دیتی۔ ماں کی بیٹے کے لئے تڑپ اور اپنی امارت کا اظہار بھی کرتی جاتی۔ کھڑکی کے اندر سے آواز آتی، ''یہاں سب یونہی اپنی ساہوکاری کے ثبوت دیتے ہیں۔ اگر اتنی ہی تم جائداد والی ہو تو تمہارا بیٹا ادھر کیوں گیراج میں ہماری میلی گاڑیاں دھو رہا ہے۔ ہٹو، تم آؤ۔ تم بھی ہٹو، گیٹ لاسٹ۔'' مجھے تو اس ویزے کے حصول سے کراہت آنے لگی۔ ویزہ فارم میں نے بھی بھرا ہوا تھا۔ بھرا کیا، چند ایک جگہوں پر لکھا تھا، باقی کاٹے مارے تھے۔ نام پتہ لکھ دیا، پروفیشن بتا دیا۔ بینک سٹیمنٹ کے لمبے چوڑے کالم تھے، سب پہ کچھ لکھے بغیر لکیر ماردی۔ امریکہ جانے کی وجہ جہاں پوچھی تھی وہاں لکھ دیا، سیر سپاٹا۔ امریکہ میں کسی جاننے والے کا کالم آیا تو لکھ دیا، پاکستان ایمبیسی۔ حالانکہ ادھر باسٹن میں بھی میری ایک سالی رہتی تھی، اس کی فیملی کا نام پتا نہ لکھا کہ خواہ مخواہ کے سوال ہوں گے۔ بچوں کے کالم میں لکھ دیا، ''بڑا بیٹا مدرسے میں حفظ قرآن کر رہا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مدرسوں میں پڑھنے والے امریکہ کے خاص مرّبی، مہربان اور ساتھی سمجھے جاتے تھے۔ انہی کی فوج بنا کے امریکہ نے ہمارے ہاتھوں سے روس کو گرایا تھا۔ 9/11 کا ڈرامہ ابھی دور تھا جب امریکہ نے اپنے نقطہ نظر کو دکھاوے کی خاطر ایک سواسی ڈگری پہ بدلا تھا۔ مدرسے کے طالبان کو امریکہ نے بظاہر دشمن دکھا کے کوئی اور کام سونپنا تھا۔ شاید ویزہ فارم میں اس وقت کی لکھی وہ سطر میرے حق میں تھی۔ نیچے دستخط کئے، ساتھ نیلا سرکاری پاسپورٹ۔ پاسپورٹ جمع کروانے والی کھڑکی پہ پاسپورٹ اور فارم جمع کروا دیئے۔ ابھی آگے انتظار گاہ میں بیٹھا ہی تھا کہ سپیکر پہ میرا نام بولا گیا، ساتھ کاؤنٹر نمبر بھی۔ میں گیا، کاؤنٹر پہ ایک کالا ویزہ افسر بیٹھا تھا۔ چوڑے کندھے، سر پیش سے جڑے چھوٹے کٹے ہوئے نوکیلے گھنگریالے بال، تنگ پیشانی، موٹا ناک اور ناک پہ پھسلتے ہوئے چشمے کے اندر تشکیک سے دیکھنے کی عادی دو خشمگیں آنکھیں۔ اس نے ایک لمحے میں میرا فارم پڑھ لیا۔ پھر شائستگی سے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا: ''بینک سٹیٹمنٹ پلیز۔'' مجھے چند لمحے پہلے بھاری بھاری بینک سٹیٹمنٹ اور جائدادوں کی رجسٹریوں کا ہوا حال یاد آ گیا۔ میں ایک دم دفاعی انداز میں آ گیا اور اپنے فوجی لہجے میں بولا ''میں نے لکھا تو ہے کہ یہ ضروری نہیں۔ اس لئے نہیں لایا وہ۔'' ''وہ تمہارے متعلقہ نہیں ہیں۔'' اس کالے کی عینک میرا آخری جملہ ''دیٹ از ناٹ ریلونٹ ٹو یو'' سن کے ناک پہ پھسلی۔ اس نے جھنجلا کے مجھے دیکھا۔ اسے شاید امید تھی کہ میں بھی کوئی فریاد کروں گا۔ مگر میں سیدھا کھڑا تھا۔ شیشے کی کھڑکی کے کھلے دہانے پہ وہ میری پتلون کے بکل سے ہم کلام تھا۔ اس نے شیشے پہ دستک دے کر مجھے مخاطب کیا اور شیشے کے سوراخ میں بولا: ''بینک سٹیٹمنٹ ضروری ہے۔''

''مے بی، فار یو، ناٹ فار می''، میں یہ کہہ کے پھر کھڑا ہو گیا۔

اب وہ جو دیوتائی گدی پہ بیٹھا تھا، اس کے نتھنے پھول گئے۔ منہ سے جیسے جھاگ سی نکلی۔ اس کی ایک آنکھ میں کسی سانپ نے منہ کھول کے دو دھاری زبان ہلائی اور میرے پاسپورٹ کو ڈس جانے کے انداز میں اس نے اس پہ ہاتھ مارا اور بولا، ''سوری، ناٹ ود آؤٹ بینک سٹیٹمنٹ''۔ اور میرا پاسپورٹ اور فارم مجھے پکڑا دیئے۔ میں نے دونوں اس کے ہاتھ سے لئے اور منہ سے صرف اتنا کہا، ''اٹ از او کے'' اور چلا آیا۔ اندر دل کی کوئی بتی بجھ گئی۔ اداسی کا ایک ہیولا سا لپکا اور میں نے گاڑی چلاتے چلاتے سر اٹھا کے آسمان کی طرف ایک بار دیکھا اور کہا: ''اللہ جی، یہ کیا؟ ان کو اپنی گدی پہ بٹھا دیا، مگر اپنے جیسا ظرف نہ دیا۔

◆◆◆

(جاری ہے)

طنزومزاح

پڑیے ''گھر'' بیمار

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، کراچی

آج کل ہمارے سرمایہ دار حضرات شہریوں کی صحت کے بارے میں کچھ زیادہ ہی فکر مند نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسپتال پہ اسپتال تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ بقول ان کے، وہ قوم کے خادم اور غم خوار ہیں اور لوگوں کو گھروں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے نہیں دیکھ سکتے۔ لہٰذا انہوں نے عوام کے لیے انتہائی رعایتی نرخوں پر اسپتال میں جان دینے کا تسلی بخش انتظام کیا ہے۔ ''رعایتی نرخوں'' کے تعیّن کا حق انہوں نے خود اپنے نام محفوظ رکھا ہے۔ شاید اسی لیے اسکولوں کے بعد اسپتال اب سرمایہ کاری کا بہترین ذریعہ بن گئے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ وسیع و عریض عمارتوں کے بجائے اب اسپتال زیادہ تر پلازوں اور رہائشی فلیٹوں میں قائم ہو رہے ہیں تاکہ ان کے مکین اور قریب و جوار کے رہائشی، اسپتال کے علاج اور داخلے کے سلسلے میں خود کفیل ہو جائیں۔ اس قسم کے اسپتالوں میں بھی جنرل وارڈ اور اسپیشل کمرے ہوتے ہیں۔ اسپیشل کمرے، فلیٹ کے کسی ایک کمرے کو ہارڈ بورڈ کے تختوں کی مدد سے چار، چھ، آٹھ یا دس غیر برابر حصوں میں تقسیم کر کے بنا لیے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر ڈربے میں جو جگہ بنتی ہے وہ ایک مریض کی پلنگڑی کے لیے بالکل کافی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات کونے میں اتنی جگہ بچ جاتی ہے کہ آپ چھوٹے سے اسٹول پر اپنی دوا کی شیشی، گلاس وغیرہ با آسانی رکھ سکتے ہیں۔ (اس ''کشادگی'' پہ کون نہ مر جائے اے خدا!)

ان ہمدردانِ قوم کی کارگزاریوں کے باعث اب آپ کسی بھی نجی اسپتال میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ سہولت سے اور کم وقت میں بستر حاصل کر کے جان، جانِ آفریں کے سپرد کر سکتے ہیں۔ آج کل اشاعتی ادارے اپنی تشہیر میں کہتے ہیں کہ مسودہ لائیے اور مکمل کتاب لے جائیے۔ کچھ دن جاتے ہیں کہ پرائیوٹ اسپتالوں کی جانب سے اس نوع کے اشتہار شائع کرائے جائیں گے کہ ''مریض لائیے اور مکمل تابوت لے جائیے۔'' اسپتالوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے مالکان مریضوں کے لیے ترس رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کثیر تعداد میں فاضل بستر موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک اسپتال کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام بستروں پر مریض ہوں۔ یہ ایک اچھی بات ہے لیکن اتنی بھی اچھی نہیں۔

گزشتہ دنوں ہمیں اپنے ایک بیمار دوست کی عیادت کے لیے ایک ''فلیٹی اسپتال'' جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم نے پہلے استقبالیہ سے رابطہ قائم کیا جہاں علاج کے لیے آنے والے مریضوں کا اندراج بھی ہو رہا تھا۔ اس سے قبل کہ ہم اپنے دوست کے کمرے کا پتا پوچھتے، استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی خاتون نے جلدی جلدی ہم سے ہمارا نام، عمر، جنس اور پیشہ دریافت کر کے ایک کارڈ پُر کیا۔ اس روز ہمیں یہ احساس بھی

ہوا کہ ہم اگر ڈاڑھی مونچھ صاف نہ ہوتے تو کم از کم ''جنس'' کے بارے میں سوال نہ کیا جاتا۔ بہر حال، ہمیں مزید سنے بغیر اس پھرتیلی نے کسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ ہم اسے یہ بتانے والے تھے ''مِس! ہم تو ایک دوست کی مزاج پرسی کے لیے آئے ہیں۔'' مگر اس کی نوبت نہ آئی اور اسپتال کے دو موٹے تازے ملازم ایک پہیّے دار کرسی لے کر آ پہنچے۔ انہوں نے پہلے ایک نگاہ غلط انداز ہم پر ڈالی اور پھر... پوری قوّت سے اٹھا کر ہمیں کرسی کے اندر ''فکس اپ'' کر دیا۔

وہ کرسی کھینچ کر وارڈ کی طرف لے چلے۔ ہم پوری قوّت سے چلّاتے رہے ''خدا کے لیے چھوڑ دو ہم بیمار نہیں، ہم تو اپنے بیمار دوست کو دیکھنے آئے ہیں۔ تم لوگ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہو؟'' لیکن اس چیخ پکار کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وارڈ کی طرف سفر جاری رہا۔ تاہم ہمارے مسلسل احتجاج پر ان میں سے ایک جو دوسرے سے ذرا زیادہ موٹا تھا بولا ''آپ کا دوست آیا تو ہم اسے آپ کے کمرے میں بھیج دیں گے، بے فکر رہیں۔''

''لیکن وہ تو پہلے سے یہاں ہے'' ہم چیخے۔ مگر اس نے اس اطلاع کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بقراطیت کا یوں مظاہرہ کیا ''جناب والا! ایک بار ہم نے آپ کو بستر پر ڈال دیا تو کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ وہ جب چاہے گا یہیں آ کر آپ سے مل لے گا۔''

چند لمحوں کے بعد ہم نے خود کو ایک چھوٹے سے کیبن میں مقیّد پایا جس کے باہر جلی حروف میں ''پرائیوٹ'' لکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ ہدایت درج تھی کہ کمرے کا دروازہ احتیاط سے کھٹکھٹائیں (شاید انتظامیہ کو ڈر تھا کہ کسی نے ہلکی سی بھی طاقت کا مظاہرہ کیا تو دروازہ اپنی جگہ چھوڑ دے گا۔) یہاں بستر پر ڈال کر اُن بدی کے پتلوں نے ہمارے جسم کو اس خوش نما سوٹ سے محروم کر دیا جو ہم بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ گھر سے پہن کر نکلے تھے اور اس کی جگہ اسپتال کا بے رونق اور مختصر لباس جسم کے گرد لپیٹ دیا۔ البتہ وہ چلتے چلتے از راہ عنایت یہ بھی کہہ گئے ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلّف گھنٹی بجا دیجیے۔'' ہم نے کہا ''خدارا ہمارے کپڑے لوٹا دو، یہ ہمیں بہت عزیز ہیں۔''

''جناب والا! ہم پہ بھروسا رکھیے'' اس مرتبہ دوسرے نے تسلی دی جو ذرا کم موٹا تھا ''بالفرض آپ کی زندگی کو یہاں کوئی خطرہ لاحق ہو جائے تو بھی فکر نہ کریں۔ آپ کے کپڑے اور دوسری اشیا بحفاظت آپ کے ورثا تک پہنچانے کا تسلی بخش انتظام ہمارے پاس موجود ہے۔''

ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ یہاں سے کس طرح راہ فرار اختیار کی جائے کہ اچانک چھوٹے بڑے ڈاکٹروں کا ایک جوڑا کمرے میں داخل ہوا۔ ہماری جان میں جان آئی اور ہم نے ان میں سے ایک کے سامنے دوزانو جھک کر کہا ''خدا کا شکر ہے ڈاکٹر صاحب، بالآخر آپ آ گئے۔ ان کم بختوں نے تو میرا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ یقین جانیے نہ تو مجھے کہیں چوٹ لگی ہے اور نہ کوئی بیماری ہے۔ میں بالکل صحیح سالم ہوں۔''

یہ سن کر بڑے ڈاکٹر صاحب نے ہم پر ایک ترّحم آمیز نظر ڈالی اور چھوٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا ''اس قسم کے مریضوں سے نمٹنا مشکل ترین کام ہے۔ ایسے لوگ کبھی تسلیم نہیں کرتے کہ وہ بیمار ہیں حالانکہ وہ اندرونی طور پر شدید بیمار ہوتے ہیں۔ میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ مریض کبھی صحت یاب نہیں ہو سکے گا کیونکہ اسے اپنے بارے میں خوش فہمی ہے کہ یہ صحت مند ہے۔ یہ ہمیں ہرگز نہیں بتائے گا کہ اسے کہاں تکلیف ہے۔ لہٰذا ہمیں از خود اس کے جسم کے مختلف حصوں پر آزمائشی آپریشن کرنے ہوں گے تاکہ ہم اس کے اصل مرض کا سراغ لگا سکیں۔''

''لیکن مجھے کسی آپریشن کی ضرورت نہیں'' ہم نے ایک بار پھر صدائے احتجاج بلند کی۔ اس پر بڑے ڈاکٹر صاحب نے کمال

بے نیازی سے جواب دیا'' آپریشن کوئی شخص بھی پسند نہیں کرتا۔لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جو چیز کچھ عرصے بعد نکالنی ضروری ہو وہ آج ہی نکال کر پھینک دی جائے؟''

''لیکن ڈاکٹر صاحب!'' ہم پریشانی کے عالم میں چلّائے ''باہر نکالنے کے لیے کوئی بھی چیز نہیں ہے، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔بس آپ ہمیں باہر نکال دیں۔''اس پر ڈاکٹر صاحب نے ایک چارٹ پر کچھ لکھتے ہوئے جواب دیا''اگر ایسا ہے تو آٹھ دس دن میں آزمائشی آپریشنوں کے زخم بھرنے کے بعد آپ ایک پل بھی اس اسپتال میں نہیں رہیں گے۔''

اگلی صبح ان لوگوں نے ہمارے سینے کے بال صاف کیے اور ناشتہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ رات گئے، وہ ظالم ہمیں مسہل دے چکے تھے۔اب گویا ہم کو ایک جبری'' آپریشن کلین اپ'' کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔اسپتال کے دو وارڈ بوائے آئے اور انہوں نے ہمیں اسٹریچر پر ڈال دیا۔پھر وہ آپریشن تھیٹر کی جانب روانہ ہوئے۔بڑی نرس ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور وہ ہمیں تسلی بھی دیتی جاتی تھی۔ہم نے مدد کے لیے چاروں طرف دیکھا مگر ارد گرد اُن مکروہ چہروں کے سوا کچھ نہ تھا۔آخر کار وہ لوگ اسٹریچر کو دھکیل کر آپریشن تھیٹر میں لے آئے اور ہمیں ایک لمبی میز پر لٹا دیا۔

''ٹھہرو، یہ آپریشن نہیں ہوسکتا!'' ہم نے انہیں سختی سے تنبیہہ کی'' مجھے ایک ضروری بات کہنی ہے۔'' وہ سب ہمہ تن گوش ہوئے تو ہم ان سے مخاطب ہوئے۔''اس میں شک نہیں کہ میں شدید طور پر بیمار ہوں۔مجھے مکمل ''اوور ہالنگ'' کی ضرورت ہے مگر بدقسمتی سے میری زندگی کا بیمہ نہیں ہے۔میں ایک مفلس انسان ہوں اور آپریشن کے لیے بے ہوش کرنے والے کی فیس بھی ادا نہیں کر سکتا۔میں تو یہاں داخل اپنے ایک دوست سے قرض لینے آیا تھا۔اگر آپ لوگ ادھار پر آپریشن کر سکتے ہیں تو جتنے چاہیں کر لیں۔''

یہ سن کر سب سے پہلے بے ہوشی کے ماہر نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ہم نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا'' میرے پاس سرجن کو ادائیگی کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔میں تو خود کوڑی کوڑی کا محتاج ہوں۔''اب سرجن نے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے آلات واپس ٹرے میں رکھ دیے۔پھر ہم نے بڑی نرس کی طرف دیکھتے ہوئے متنبہ کیا'' اور محترمہ، میں کمرے کا کرایہ ادا کرنے سے بھی قاصر ہوں۔آپ جتنے دن چاہیں میری یہاں تواضع کر لیں لیکن کھانا میرے مرضی کا ہونا چاہیے۔''

ہماری اس صاف گوئی پر وہ سب آگ بگولہ ہوگئے۔ان کی آنکھوں سے غصے اور ناکوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں اور پھر...نہ جانے کب اور کس طرح دوبارہ شہری لباس ہمارے جسم پر آیا۔ہمیں تو اتنا یاد ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں لا کر سڑک پر پٹخ دیا تھا۔

ہوش آنے پر ہم دوبارہ اسپتال میں آئے اور استقبالیہ سے دریافت کیا کہ ہمارا دوست کون سے کمرے میں ہے؟ مگر استقبالیہ کلرک ہم پر برس پڑا'' مسٹر، ہم لوگ تمہارا ناپسندیدہ چہرہ اس اسپتال میں نہیں دیکھنا چاہتے۔یہاں تمہارا کوئی دوست نہیں۔''

اس آخری جملے کی صداقت نے ہمیں لاجواب کر دیا تھا۔ہم واپسی کے لیے پلٹے کہ ناگاہ وہی دو مسٹنڈے، خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ہم خوف زدہ ہو کر بھاگے مگر ایک کالی کلوٹی نرس سے ٹکرا کر فرش پر چاروں شانے چت گر پڑے اور ایک بار پھر بے ہوش ہوگئے۔اس دفعہ جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اُسی پہلے والے کیبن کے بستر پر پڑے ہوئے ہیں۔ہم اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھے تھے۔ہمارا وہ دوست جس کی عیادت کے لیے ہم اس نام نہاد اسپتال میں آئے تھے ڈسچارج ہو چکا تھا اور اب وہ سرہانے کھڑا ہماری عیادت کر رہا تھا۔دروازے پر چھوٹے بڑے دونوں ڈاکٹر موجود تھے جو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

◆◆◆

آئینے

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

کہتے ہیں کہ صبح سویرے اٹھ کر باقی لوگوں کے علاوہ ایک انسان کو ضرور خوش کرنا چاہیے جس کا پیارا سا منہ آپ سورج کی کرنیں نکلنے سے پہلے (یا جو لوگ دیر سے اٹھتے ہیں وہ ان کرنوں کی روشنی پھیلنے کے بعد) آئینے میں دیکھتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ ضرور دیکھ لیجئے گا کہ آئینے میں نظر آنے والے انسان کو خوش کرنے کے لیے صرف وہ خواہشیں کرے جو ایک ''بندے کے پتر'' سے متوقع ہیں۔ یعنی اسے اوقات میں رہ کر جائز جائز خواہشیں کرنی ہوں گی تاکہ اس سے دوسرے لوگ بھی خوش ہو سکیں۔

ایک دوست دوسرے کو کہہ رہا تھا ''یار آئینے کے بڑے فائدے ہیں.....''

''وہ کیا؟ مجھے تو ایک ہی فائدہ نظر آتا ہے کہ اس میں اپنا منہ دیکھا جا سکتا ہے اور کنگھی و نگھی کی جا سکتی ہے.....''

''بس! تو تو یار جاہل کا جاہل ہی رہا.....''

''اچھا چل تو بتا اس کے کیا فوائد ہیں؟''

''دیکھو جب آپ نے سٹڈی کرنا ہو اور کوئی آپ کے پاس بیٹھنے کو تیار نہ ہو تو آپ آئینے کے سامنے بیٹھ کر کمبائنڈ سٹڈی کر لیں۔''

''واہ۔ واہ.....''

''دوسرا فائدہ.....''

''دوسرا یہ کہ آپ اپنے سبق کو دوہرا کے یاد کر سکتے ہیں اور اس شخص کو سنا سکتے ہیں جو آئینے میں آپ کے ساتھ پڑھ رہا ہے.....''

''تیسرا فائدہ؟.....''

''تیسرا یہ کہ آئینے میں دیکھ کر آپ کا وہ دوست بتا سکتا ہے کہ پڑھائی سے آپ کے چہرے پہ کیا اثر پڑ رہا ہے یعنی کتنی افسردگی طاری ہو گئی ہے یا یہ کہ کتنی شکل بگڑ گئی ہے.....''

''چوتھا فائدہ تو اسی کو بتانا جو تجھے آئینے میں نظر آ رہا ہو گا''

اس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔

ویسے تو حجام کی دکان پہ جائیں تو آپ کو ہر طرف آئینے ہی آئینے نظر آئیں گے تاکہ آپ چاروں طرف بلکہ چھت پہ بھی آئینہ لگا ہو تو پانچوں طرف دیکھ سکیں کہ آپ کے بالوں کا نائی کیا حشر کر رہا ہے.....لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ جب نائی بال کاٹ رہا ہو تو نجانے

کیوں ایک سرور کا احساس ہوتا ہے اور بندے کو ہلکی ہلکی خماری اور پھر نیند آنے لگتی ہے اور اسی دوران نائی اپنا کام دکھا جاتا ہے۔ لیکن گاڑی میں لگے پچھلی طرف دیکھنے والے آئینے یا بیک مرر بڑے کام کی چیز ہوتے ہیں۔ بڑا فائدہ تو پیچھے آنے والی ٹریفک دیکھ کر چوکنا رہنا ہوتا ہے مگر ایک فلم (شاید) آئینہ میں شبنم (ہیروئن) نے اس کا زبردست استعمال یوں کیا کہ اس نے ہوٹل سے رخصتی کے وقت اپنا وزٹنگ کارڈ ندیم (ہیرو) کو بخوشی عنایت کیا۔ پھر کار کو ذرا آگے بڑھایا تو دیکھا کہ ہیرو نے تو وہ کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا کہ بہت سی ''دیسی میمیں'' اسے روز ایسا کارڈ دے جاتی ہیں۔ ہیروئن یہ دیکھ کر ہنسنے لگی۔ ہیرو کو یہ احساس نہیں تھا کہ سب کچھ بیک مرر میں ہیروئن دیکھ رہی ہے۔ اب چونکہ ہیروئن کو ایک نظر میں ہی پیار ہو گیا تھا تو اس نے گاڑی کو واپس موڑا اور ایک نیا نویلا وزٹنگ کارڈ ہیرو کے حوالے کر دیا۔ ہیرو ذرا شرمندہ تو ہوا مگر جعلی مسکراہٹ اس نے چہرے پر سجا کر کام چلا لیا۔ ویسے یہ تو اکثر یہاں ایسا کھیل ہوتا ہے کہ ہم دوستوں کی یا ملنے والوں کی منہ پہ تعریف کیے جاتے ہیں اور جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں ہم اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ اللہ میاں نے ہمارے سر پہ بیک مرر نہیں لگائے ہوئے ورنہ یہاں لوگ روز جھگڑا کرتے۔ البتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تب لوگ ایسا کرتے وقت احتیاط ضرور کرتے لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ وہ بدتعریفی کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کر لیتے۔ تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اللہ میاں ہمیں بیک مرر لگاتا تو لگاتا کہاں پہ..... شاید کانوں کے پیچھے اس کی مناسب جگہ ہے..... اگر ایسا ہوتا تو کانوں پہ لگے ان آئینوں میں دیکھنے کے لئے ہمیں سر کے بال اچھی طرح ترشوا کے رکھنے پڑتے تاکہ پیچھے دیکھنے میں دقت نہ ہو.....

یہ بھی سچ ہے کہ آئینے جھوٹ نہیں بولتے..... کبھی کوئی ہم سے کہہ دے کہ ''جا آئینے میں جا کر اپنی شکل دیکھ'' تو آئینے میں دیکھنے سے ہمیں اپنی اوریجنل شکل ہی دکھائی دیتی ہے۔ ہاں البتہ منہ پہ بارہ بجے ہوں تو آئینہ دیکھ کر موڈ ٹھیک کیا جا سکتا ہے اور یوں منہ کچھ ٹھیک نظر آنے لگتا ہے۔ ایک اور سچ یہ بھی ہے کہ یہ آئینے ہمارے سچے دوست بھی ہوتے ہیں جب ہم ہنستے ہیں تو یہ بھی ہنستے ہیں اور جب ہم روتے ہیں تو ہمارے ساتھ روتے ہیں۔ تاہم کئی مرتبہ ہمیں سچ پسند نہیں آتا۔ ہمارے ایک دوست ہاتھ زخمی کروا کے ہمارے پاس آئے ہم نے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا تو بولے ''آج ہمیں آئینے پہ ہاتھ اٹھانا پڑا'' ظالم سچ بولنے سے باز نہیں آتا..... تاہم یہ آئینہ اتنا ظالم ہوتا ہے کہ کرچی کرچی بھی ہو جائے تب بھی اس کی ہر کرچی پہ ہمیں اپنا اصل چہرہ ہی نظر آتا ہے اور یہ اتنی مار کھا کر بھی کسی سچے دوست کی طرح سچ بولنے سے باز نہیں آتا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ ''آئینہ ان کو دکھایا تو بُرا مان گئے۔'' اب بھلا آپ ہر جگہ لوگوں کو آئینہ ہی دکھاتے رہیں گے تو دوست تو ناراض ہوں گے ہی نا..... پھر کبھی آپ یہ آئینہ اپنے باس کو دکھانا شروع کر دیں تو سمجھ لیں آج ہی آپ نوکری سے فارغ کر دیئے جائیں گے۔ ''تب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت.....'' پھر یہی آئینہ لے کر آپ اپنے آپ کو تکتے رہ جائیں گے اور یہی آئینہ آپ سے پوچھے گا کہ یہ آپ نے کیا کیا.....؟ ہر کوئی سچائی کو پسند نہیں کرتا سو اس بات پہ توجہ کرو کہ کس کو آئینہ دکھانا ہے اور کس کو نہیں..... جو برداشت نہیں کر سکتا اور جس کا جواب آپ برداشت نہیں کر سکتے تو مجھے اپنی جیب میں ہی آرام کرنے دو وہاں سے نہ نکالو.....

آئینے کی رومانوی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ہم نے یہ دوہا لکھا تھا۔

نیند سے جاگی ناری تو لی کھل کر اک انگڑائی
نظر پڑی جو آئینے پہ یک دم ہے شرمائی

خیر اپنے حسن پہ وہی شرمائے گا جو واقعی حسین ہو گا مگر یہ بھی سچ ہے کہ ماں کی نظر میں ہر بچہ ہی خوبصورت ہے، اس لئے ہم بھی

اکثر آئینہ دیکھ کر خواہ مخواہ شرمائے جاتے ہیں۔ تاہم حقیقت پسند لوگوں کو ہم نے اللہ کے سامنے بھی شکوہ کرتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ کہتے سنا ہے کہ کاش اللہ میاں تو ذرا سی اور محنت کر لیتا تو ہمیں طرح طرح کی باتیں تو نہ سننی پڑتیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس طرح ایک روز ہمارے ساتھ ہوا۔ ہم نے اپنے ایک قریبی دوست سے کہا کہ یار آج یہ جو آندھی آ رہی ہے پھر سے ماحول خراب کرے گی۔ جواباً اس نے ہماری آنکھوں پہ چڑھی عینک کو دیکھا، اسے اتارا، صاف کیا، پھر ہماری آنکھوں پہ سجانے کے لئے کانوں پہ بٹھا دی تو وہ آندھی غائب تھی۔ ہم کھسیانے سے ہو لیے لیکن کیا کیا جائے کہ ہم اپنی آنکھوں پہ پڑی دھول کی بجائے آئینہ صاف کرنے کی بے ثمر سعی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ دھول تعصب کی ہوتی ہے، کبھی نفرت کی، کبھی غلط فہمیوں کی۔ یوں ہم چیزوں کو غیر حقیقی نظروں سے دیکھتے اور غلط نتیجے اخذ کرتے رہتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب آئینے ہماری مرضی کا عکس منعکس نہیں کرتے تو ہم آئینوں پہ ہاتھ اٹھانے سے بھی نہیں چوکتے، اور اپنے ہی ہاتھ زخمی کر کے لہو کی سرخی میں رنگ لیتے ہیں، اسی وجہ سے شاید محسن نقوی کو کہنا پڑا تھا۔

میں نے گھر کے سارے آئینے توڑ دیئے محسنؔ
محبت سے ہارا ہوا شخص مجھ سے دیکھا نہیں جاتا

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید کے ''انٹرویوز'' کی دو کتابیں

آپس کی باتیں

اور

برسبیلِ گفتگو

شائع ہوگئی ہیں

ملنے کا پتہ: مقبول اکیڈیمی، سرکلر روڈ، چوک اُردو بازار، لاہور (فون:37324164-042)

جائزے

''بابونگر''___ کا مزاح نگار___ حسین احمد شیرازی

انورسدید

پڑوس کی سڑک پر واقع خوردہ فروش کی دکان سے مجھے ''کافی'' نہ ملی تو شیائیکا درد نے بڑی دکان پر جانے کی اجازت نہ دی اور میں اپنی تیسری ٹانگ کا سہارا لیتا ہوا گھر واپس آنے لگا۔گلی کا موڑ مڑا تو حیرت زدہ ہو گیا کہ میرے ''پانچ مرلے کے محل'' کے سامنے اردو کے ممتاز طنز نگار کنہیا لعل کپور موجود ہیں اور ان کے ساتھ قتیل شفائی مرحوم کے صاحبزادے نوید کھڑے تھے۔قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ جس دھان پان شخص کے چہرے پر چوڑے کان اور اونچی نوکیلی ناک نمایاں تھی' وہ حسین احمد شیرازی تھے جن کے مطائبات ''اردو ڈائجسٹ'' ''نیرنگِ خیال'' اور ''ادبِ لطیف'' میں پڑھتا تو محسوس کرتا کہ طنز و مزاح کی جو بشاشت آمیز کرسی پطرس بخاری نے خالی کی تھی' اس پر اب حسین احمد شیرازی بیٹھ گئے ہیں اور زندگی کی ناہمواریوں پر کسی اصطلاحی مقصد کے بغیر ہمدردانہ نظر ڈال رہے ہیں اور ان مسکراہٹوں کو بیدار کر رہے ہیں جو کسی عالی حوصلہ اور کشادہ نظر مصنّف کے قلم کی گدگدی سے بے ساختہ پیدا ہو جاتی ہیں۔معلوم ہوا کہ حسین احمد شیرازی کے مزاحیہ مضامین کی کتاب ''بابونگر'' سنگِ میل (لاہور) جیسے ممتاز ادبی اشاعتی ادارے سے شائع ہوگئی ہے۔اور ناشر نیاز احمد نے اس کی قیمت اپنے ادارے کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے نوسو پچانوے روپے رکھی ہے تا کہ انورسدید جیسا معمولی اور کم آمدنی والا قاری یہ کتاب خرید کر نہ پڑھ سکے۔

مجھے بے پایاں خوشی ہوئی کہ حسین احمد شیرازی صاحب نے نشست پر بیٹھنے سے پہلے یہ کتاب، جس کا قیمتی اشتہار انگریزی اخبار ''ڈان'' کے سنڈے ایڈیشن میں ہر ہفتے باقاعدگی سے چھپ رہا تھا، مجھے تحفتہً عطا فرمائی۔خوشی کا باعث یہ تھا کہ میں جس کتاب کے اشتہار پر حسرت کی نظر ڈالتا تھا' وہ اب میری دسترس میں تھی۔اور اس کے مصنّف نے میری کٹیا کو اپنی تشریف آوری سے رونق افروز کر رکھا تھا۔اور ''اپنی خوش گفتاری اور ذہانت کی چمک سے اس طرح محوِ کلام تھے کہ بقول سید ضمیر جعفری' ساون کی پہلی پھوار کی طرح محسوس ہوتے تھے اور حال کی دھند کو صاف کرتے جاتے تھے''۔میں نے اپنی زندگی میں صرف دو ادیبوں کو دیکھا، جو مزاح لکھتے ہی نہیں' مزاح بولتے بھی ہیں اور اپنی باتوں سے گرد و پیش کو بھی مسکرانے کا موقعہ دیتے ہیں۔ایک پروفیسر غلام جیلانی اصغر تھے اور دوسرے مشتاق احمد یوسفی ہیں۔اب حسین احمد شیرازی سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ ان کی باتیں بھی گلِ نوشگفتہ کی طرح ہیں۔سید ضمیر جعفری نے درست لکھا ہے کہ ''شوکت تھانوی' مولا بخش خضر تمیمی اور محمود نظامی کے بعد مزاح نگاروں میں سے بجلی کی طرح کوندتی ہوئی برجستہ گفتاری ہم نے انہیں (حسین احمد شیرازی) کی باتوں میں پائی''۔

اردو مزاح کی جس روایت کو اسد اللہ خان غالبؔ نے اپنے خطوط میں فروغ دیا تھا اسے بیسویں صدی کی نثر میں تسلسل اور توسیع فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شفیق الرحمان، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، محمد خالد اختر، عظیم بیگ چغتائی، مجتبیٰ حسین، کرنل محمد خان، ابن انشاء اور سید ضمیر جعفری نے دی۔ ان میں حسین احمد شیرازی بھی ایک اہم نام ہے۔ جنہیں فطرت نے ایک ''حیوانِ بحریف'' کی خصوصیات ودیعت کی تھیں۔ بلاشبہ وہ اپنی گردوپیش کی زندگی کی بوالعجبیوں کو مزاح نگار کی آنکھ سے دیکھتے رہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ محکمہ کسٹم کی ایک اعلیٰ ملازمت اور پیشہ ورانہ زندگی نے جس میں فرائض کی دیانت دارانہ بجا آوری نے ہمیشہ فوقیت حاصل کی، ان کا زیادہ وقت لیا۔ چنانچہ ادبِ لطیف، نیرنگِ خیال اور الطاف حسن قریشی کے رسالہ ''اردو ڈائجسٹ'' میں وقتاً فوقتاً اپنے مضامین شائع کرانے کے باوجود ان کے نام کا سِکہ رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، مشتاق احمد یوسفی اور ضمیر جعفری کے نام کی طرح چل نہ سکا۔ لیکن اب ان کی ضخیم کتاب ''بابونگر'' چھپی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو کے ممتاز ترین مزاح نگاروں کے محبوب مصنّف تھے۔ چنانچہ انہوں نے ''آل پاکستان طنز ومزاح کانفرنس'' منعقدہ ۱۹۸۳ء میں اپنا مضمون ''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے'' اسلام آباد میں پڑھا تو کانفرنس کے مہمان خصوصی میجر جنرل شفیق الرحمٰن ان کا ہاتھ پکڑ کر ''نیرنگِ خیال'' کے مدیر سلطان رشک صاحب کے پاس لے گئے اور کہا:

> ''رشک صاحب! آئندہ اپنے رسالے میں شائع کرنے کے لیے مضمون کے تقاضے کا فون مجھے کرنے کی بجائے حسین احمد شیرازی صاحب کو کیا کریں''۔

ایک بے حد دلچسپ رائے سیّد المزاح ضمیر جعفری نے یوں دی ہے۔

> ''حسین شیرازی زندگی کو یرقانی آنکھ سے نہیں، ارغوانی آنکھ سے دیکھتا ہے''۔

ان کے خیال میں:

> ''وہ اپنے قاری کے خیالات میں چلتا ہوا زندگی کی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ دراصل اپنی خوشی کے لیے لکھتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جو شخص خود خوش نہیں وہ دوسروں کو خوش نہیں کرسکتا۔ وہ یہ سوچ کر نہیں لکھتا کہ لوگ کیا پڑھنا پسند کریں گے۔ حسین شیرازی کے اس روّیے نے بھی اس کی حسنِ ظرافت کو البیلا اور شادی شدہ عورت بنا دیا ہے''۔

معروف دانشور ڈاکٹر خالد اقبال یاسرؔ نے حسین احمد شیرازی کے بابونگر کی حدود میں داخل ہوکر ان کے مضامین پڑھے تو بے اختیارانہ کہہ اٹھے:

> ''ان میں اس معصوم فطری مزاح کی فراوانی ہے جو کسی نہیں وہبی ہوتا ہے۔ ان میں بے ضرر پھل جھڑیاں ہیں جنہیں دیکھ کر سبزے سے حاصل ہونے والی طراوت ملتی ہے۔ شرارتیں ہمیں جو گدگدیاں لگتی ہیں۔ دلآویز بے تکلّفی ہے اور قہقہہ اور چٹکلے ہیں''۔

''بابونگر'' پاکستان کے ایک مشہور شہر کی علامت ہے جسے بعض لوگ کھمبوں کا شہر کہتے ہیں اور زیادہ لوگوں کے نزدیک یہ گریڈوں کا شہر ہے جہاں سے جاری ہونے والے احکامات پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور اٹھارہ کروڑ عوام کو بحرانوں میں مبتلا کردیتے ہیں۔ حسین احمد شیرازی نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا بیشتر حصّہ اسی شہر میں گزارا ہے لیکن اسے ایک فرد کی نظر سے دیکھنے کی بجائے مزاح نگار کی

آنکھ سے دیکھا اور ناہمواریوں پر ہمدردانہ اندازِ نظر کا مظاہرہ کیا، اور صحت مندانہ تاثر پیدا کرنے کے لیے ہر مشاہدے کی کوکھ سے کبھی مسکراہٹ اور کبھی بے ساختہ قہقہہ برآمد کیا۔ بعض لوگ اسے حسین احمد شیرازی کی شوریدہ سری بھی قرار دے سکتے ہیں لیکن یہ ایسی شوریدہ سری ہے جس پر وہ خود بھی ہنس رہے ہیں۔ اور اس عمل میں اندر کے ''راز'' کو فاش کرنے سے باز نہیں آتے۔ مثلاً ایک واقعہ پر اپنی گواہی یوں رقم کرتے ہیں:

''ایک دفعہ ہم ایک ایسے انٹرویو بورڈ کے رکن تھے جس کے سربراہ نے سفارشی امیدوار سے اس قسم کے سوال کیے تھے:

- ''صدر جنرل ضیاء الحق کا پورا نام بتاؤ؟''
- ''روزے رمضان کی کس تاریخ سے شروع ہوتے ہیں؟''
- ''صدر سکندر مرزا حکومت کے کس عہدے پر فائز تھے۔''؟
- ''گلوکارہ نور جہاں کیوں مشہور ہے''؟

حسین احمد شیرازی کا قولِ فیصل ہے کہ ''بابو نگر'' میں ضمیر نامی جن کو بوتل میں بند کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ انہوں اس قول کے اثبات کے لیے ایک واقعہ یوں لکھا؟:

''ایک اہلکار سائل کو کہہ رہے تھے کہ اگر آپ مجھے کوئی ''غیر سرکاری تحفہ'' دینے لگے ہیں تو میں پہلے انکار کروں گا لیکن آپ اصرار کیجئے گا.....انہوں نے وجہ پوچھی تو بولے:

''اس طرح میرا ضمیر مطمئن ہو جائے گا کہ میں آپ کی ضد پر یہ غلط کام کرنے لگا ہوں''

حسین احمد شیرازی عصرِ حاضر کے مزاح نگار ہیں۔ چنانچہ انہوں نے متعدد واقعات ایسے بھی بیان کیے ہیں جو معاشرے کی اجتماعی یادداشت کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہ واقعات جب زیرِ عمل تھے تو معمول کی زندگی کا حصہ نظر آتے تھے لیکن اب انہیں واقعات کو حسین احمد شیرازی نے لکھا ہے تو مزاح کی شوخی تبسم بن کر اُبھر آئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہمارے ایک دوست اپنے افسر کے بعض ساتھیوں کے اس روّیے کے بارے میں بہت پریشان تھے کہ یہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد بھی دفتر میں اپنے باس (BOSS) کے پیچھے نماز میں حاضری لگوانے کے لیے یہ کشٹ اٹھاتے ہیں۔ نماز سے یاد آیا کہ ہم نے صدر ضیاء کے دفتر میں لوگوں کو غسل خانے سے خشک ہاتھوں کے ساتھ باہر آ کر نماز میں شمولیت کرتے دیکھا تھا اور ایک بے تکلّف نیت یہ بتاتے تھے:

''چار رکعت نماز جبر، بحکم جنرل ضیاء کے، منہ طرف جی، ایچ، کیو شریف کے، مارشل لاء.....اللہ اکبر''

ریٹائرمنٹ کے باب میں ایک تاریخی واقعے کا دلچسپ ذکر بھی آ گیا ہے:

''صدر آئزن ہاور سے کسی نے پوچھا وائٹ ہاؤس چھوڑنے کے بعد انہوں نے زندگی میں کیا تبدیلی محسوس کی؟''۔ انہوں نے جواب دیا ''اگرچہ اب میں پہلے سے بہتر گالف کھیلتا ہوں لیکن آج کل پھر بہت زیادہ لوگوں سے ہارنے لگا ہوں''

''بابونگر'' ایک حکومتی دارالسلطنت کی اندرونی کہانی ہے جس میں سچے واقعات سے فطری مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ چند مزاحیہ حقیقتیں حسب ذیل ہیں:

O ''ملازم کام سے نہیں گھبراتا بلکہ کام کرنے سے گھبراتا ہے۔''

O ''ہمارے ایک ہمسائے نے ایک دفعہ کسی نگران وزیراعظم کی دعوت کی تو ہم بھی اس میں شریک ہو لئے' آب تلخ کے دور چل رہے تھے۔ اور کئی بڑے بابو بھی اپنا حلق کڑوا کرنے میں مصروف تھے۔ دعوت کے بعد میزبان کے گھر سے باہر نکلے تو ہم نے ایک سرکاری گاڑی کے وائرلیس پر چلتا ہوا یہ پیغام سنا۔

''دیسی شراب کی چھ بوتلیں اور دو ملزم گرفتار کر لیے ہیں۔''

O ہمارا دوست راحت سگریٹ نہیں پیتا لیکن جیب میں ماچس ضرور رکھتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ جیسے ہی اس کا باس (BOSS) ڈبیہ میں سے سگریٹ نکالتا ہے یہ سرکس کے کرتب دکھانے والے فنکار کی تھی ماچس کی تیلی جلا کر اس کا سگریٹ سلگاتا اور ڈبیہ پھر اپنی جیب میں اڑس لیتا ہے۔ ہم نے مشورہ دیا کہ تم یہ ماچس باس (BOSS) کی سگریٹ کی ڈبیا کے پاس کیوں نہیں رکھ دیتے؟ تو بولا: ''ہر دفعہ جب میں سگریٹ سلگاتا ہوں تو میری حاضری لگتی ہے۔ حاضری کے نمبر بنتے ہیں۔ اور ان نمبروں سے میرا گراف اونچا ہوتا ہے''۔

O کاؤنٹی کرکٹ میچ میں ایک بلّے باز پہلے گیند پر ہی آؤٹ ہو گیا۔ وکٹ کیپر بولا ''دوست! پچھلے اتوار تم ایک سو دس سکور کے ساتھ ناٹ آؤٹ رہے تھے۔'' اس پر بلّے باز چلّایا ''ہاں' اور سنچری بنانے کے بعد جب میں پویلین پہنچا تو ساری شراب پی جا چکی تھی''۔

.....

O ایک بڑے بابو اعلیٰ افسران کی صدارت کرتے ہوئے سیاسی سفارشوں کے خلاف جہاد کرنے اور دونوں جہانوں میں اس طرز کی برکات پر خطبہ دے رہے تھے۔ لبِ لباب یہ تھا کہ آج سے سیاسی سفارش بالکل نہیں چلے گی۔ آپ بھی نہ مانیں''

اسی اثنا میں کسی نے دروازے میں سے جھانکا۔ تو بڑے بابو یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ایم این اے صاحب آ گئے ہیں۔ اجلاس برخواست کیا جاتا ہے''۔

.....

''بابونگر'' کے 44 ابواب اس شہر کی تاریخ اور جغرافیے پر ہی روشنی نہیں ڈالتے بلکہ اس کے داخلی مزاج کا مطائبانہ تجزیہ بھی کرتے ہیں اور ''اختیارات کی مرکزیت اور جبر''—— ''بصیرت سے نفرت''—— ''جیسا چہرہ ویسا قانون''—— ''بابو اور دربار''—— ''سفارش''، ''کرپشن''، ذات پات''، ''گروہ بندی''، ''ریٹائرمنٹ''—— خوشامد اور چمچہ گیری اور ذات پاک کی قدروں کی داخلیت کو بھی آشکار کرتے ہیں۔ ضمیر جعفری نے درست لکھا ہے:

> ''یہ تحریریں شائستہ، ذہین اور بشاش ظرافت کی اس سطح کی نمائندگی کرتی ہیں، جس سے کسی قوم کی تہذیبی سطح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں اگر رواروی میں پڑھو تو ''کامیڈی'' معلوم ہوتی ہیں اور سوچ کر پڑھو تو ''ٹریجڈی'' محسوس ہوتی ہے۔''

خوبی کی بات یہ ہے کہ حسین احمد شیرازی نے ''بابونگر'' کے محیط کو پھیلایا تو سفرنامہ، ڈرامہ، ناٹک اور قصہ کہانی کی صنف کو بھی اس میں شامل کیا۔ ''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے'' سفرنامہ ہے۔ ''منزل کے بغیر مسافتیں'' ڈرامہ ہے۔ ''جدید قصّہ چہار درویش'' میں میر امّن کی مشہور داستان کی پیروڈی کی گئی ہے۔ ''آبِ حیات اور گٹر کے ڈھکنے'' ـــــ مہمان بلائے جان'' ـــــ ''کھیر، چرخہ، کتا اور ڈھول'' ـــــ ''مسٹر، معاشرہ اور منافقین'' اور ''میں ایک ممبر ہوں'' ـــــ جیسے عنوانات مضامین کے تنوّع کے مظہر ہیں لیکن یہ سب مضامین حسین احمد شیرازی کے ذوقِ مزاح اور میلانِ طبع کی شگفتگی کو آشکار کرتے ہیں تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صورت واقعہ کو چاک پر چڑھا کر اسے گردش کس طرح دیتے اور زندگی کے مضحک پہلوؤں کو کس طرح ابھارتے ہیں۔ ''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے'' میں لندن کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

''ہمارے ایک دوست نے ہمیں کھانے پر مدعو کیا اور ڈنر کے لیے نو بجے کا وقت مقرر ہوا۔ شام کے وقت ان کا فون آیا کہ نو بجے کی بجائے آٹھ بجے ٹھیک رہے گا۔ مہمان بے چارہ تو ویسے ہی بے زبان ہوتا ہے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ آپ ان کا اور ہمارا تقابل بالترتیب امریکہ اور پاکستان سے کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس تجویز پر آمناً و صدقناً کہا حالاں کہ وقت کی تبدیلی سے ہمیں ساڑھے سات بجے والی ایک ملاقات منسوخ کرنا پڑی۔ ہم آٹھ بجے ریسٹورنٹ پہنچ گئے لیکن ہمارے میزبان جب نو بجے پہنچے تو اس دوران میں کیفے کا عملہ دہشت گردی کے اس دور میں شکّی نصف بہتروں کی طرح ہماری حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنے میزبان سے گِلہ کرتے ہوئے پوچھا:

''جناب اگر آپ نے نو بجے ہی آنا تھا تو پھر نو بجے کا مقررہ وقت کیوں تبدیل کیا؟ انہوں نے فرمایا ''بھائی شیرازی! دراصل مجھے ہر جگہ ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچنے کی عادت ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اگر نو بجے کا وقت رکھا گیا اور میں ریسٹورنٹ میں اس لمحے پہنچا تو تمہارا ڈنر بہت لیٹ ہو جائے گا۔ میں نے تو احتیاط کرتے ہوئے تمہارا بھلا سوچا تھا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تم رات کا کھانا جلدی کھانے کے عادی ہو۔''

''مہمان بلائے جان'' میں ایک بہجت افروز واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے:

''چچا کے عزیزوں کی شادی کا قصّہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ موسیقی کی محفل میں مغنّیہ بڑی خوبصورت تھی۔ وہ پہلے تو اپنی عینک کے شیشوں کو رگڑ رگڑ کر چمکاتے رہے۔ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ بیگم نے خشمگیں نظروں سے دیکھا تو کچھ پیچھے ہٹے لیکن چند لمحوں کے بعد پھر آگے بڑھنے لگے۔ اس پر بیگم نے ہاتھ بڑھا کر ان کی عینک اتار لی اور لان سے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کی سہیلی نے پوچھا کہ اس کو اکیلا چھوڑ آئی ہو۔'' تو بولیں..... ''عینک کے بغیر تو یہ مجھے بھی پہچان نہیں سکتا۔ اب جتنا چاہے آگے بڑھتا رہے۔''

مضمون ''مرحوم'' کو ایسا وفاتیہ سمجھئے جسے مصنّف نے اپنی ''وفات حسرت آیات'' پر لکھا ہے اور حسین احمد مرحوم کو اپنا دوست قرار دیا ہے جس کی عادات وخصائل اور حالات واطوار پر حسین احمد شیرازی کڑی نظر رکھتے ہیں لیکن اس نظر میں فکاہ کا کثیر عنصر موجود ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''مرحوم کا چہرہ تو دلرباؤں جیسا نہیں تھا لیکن جسم ان سے بھی زیادہ نازک اندام تھا۔ ان کے جسم میں گوشت یا چربی

نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی بلکہ ہڈیوں پر چمڑے کو خوب کس کر لپیٹ دیا گیا تھا۔ ان کی جسمانی ساخت دیکھ کر خدائے لم یزل کے قادرِ مطلق ہونے پر یقین آ جاتا تھا کہ واقعی ان ہڈیوں پر کھال چڑھانے والا ہر کام کی طاقت رکھتا ہے۔ تمام عمر زمانہ مرحوم کی کھال اتارتا رہا چنانچہ وفات تک ان کی ہڈیاں کھال سے سبکدوش ہو چکی تھیں لیکن صاحب! زمانے کا کیا ہے وہ تو بال کی بھی کھال اتار لیتا ہے۔ زمانے کے سلوک سے مرحوم ہمیشہ شاکی رہے اور

''ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا''

کا راگ الاپتے رہے۔ مرحوم کی وفات سے یہ ثابت ہو گیا کہ واقعی ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا''

اچھے مزاح نگار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی ناہمواریوں پر بھی مضحک نظر ڈال سکتا ہے اور اپنی ہئیت کذائی کا نہ صرف ادراک کرتا ہے بلکہ اس کی ہنسی بھی خود اُڑاتا ہے۔ اس قسم کا ایک ''خود وفاتیہ'' اردو کے ممتاز افسانہ نگار اشفاق احمد نے بھی اپنی زندگی میں لکھا تھا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کے دوست اور معاصرین کس قسم کے ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس حسین احمد شیرازی نے خود اپنا مضحک تجزیہ کرنے کی کاوش کی ہے اور ''خود وفاتیہ'' کو ظریفانہ دانش سے تہی نہیں ہونے دیا۔

حسین احمد شیرازی نے اپنے مزاح کے تاثر کو گہرا کرنے کے لیے اپنے شعری ذوق سے بھی بے پناہ استفادہ کیا ہے۔ اساتذہ کے بے شمار اشعار ان کی لوحِ دماغ پر ثبت ہیں اور مضمون لکھتے وقت انہیں حسبِ موقعہ یاد آ جاتے ہیں اور جہاں ضرورت پڑتی ہے وہ اشعار کی پیروڈی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ڈاکٹر خالد اقبال یاسر نے ان کی تحسین کی ہے کہ ''حسین احمد شیرازی ایسے نازک مرحلوں پر مسلم دانشوروں اور مفکرّوں کے اقوال اور کلاسیکی شعرا کے اشعار کو اپنی کمک اور ڈھال بنا لیتے ہیں۔'' چند اشعار حسبِ ذیل استعمال ہوئے ہیں اور مزاح کی افزائش میں معاون ثابت ہوئے ہیں:

سب چھوڑ دے دھندے تخریبی کچھ کام ذرا تعمیری کر　　کچھ اور نہیں تو یار مرے اس دور میں چمچہ گیری کر

.....

جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں　　مارچ میں بلبل ہوں تو جولائی میں پروانہ ہوں

.....

ہمیشہ جھوٹ ہم آپس میں بولتے آئے　　نہ تیرے دل پہ ..... نہ میری زباں پہ ہے چھالا

حسین احمد شیرازی نے مزاح میں سچ کہنے کی روایت کو فروغ دیا ہے۔ وہ معاشرے کے مضحک پہلوؤں کو اپنائیت سے دیکھتے اور انہیں عالی حوصلگی سے اپنے بیانیہ کا حصّہ بنا لیتے ہیں۔ انہوں نے کوئی مزاحیہ کردار تخلیق نہیں کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے پورا معاشرہ ایک مزاحیہ کردار ہے جس کی بوالعجبیوں کو اُبھار کر وہ ہمیں اپنے باطن میں جھانکنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ گویا ان کا مزاح خیر کا عمل ہے۔

◆◆◆

خس وخاشاک زمانے

سیمی کرن

مستنصر حسین تارڑ ادبی دنیا کے جِنات میں سے ایک ایسا قوی جِن ہے جو بڑی طاقت وقوت سے ایک طلسماتی دنیا اک طلسم ہوشربا تخلیق کرتا ہے اور آپ کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے، ''خس وخاشاک زمانے'' ایک ایسا ہی ناول ہے جو آپ کو چناب کے پانیوں کے ساتھ خس وخاشاک کی طرح بہالے جائے گا اک مدت آپ ان انوکھے کرداروں کے سحر سے خود کو آزاد نہیں کروا پائیں گے!

''خس وخاشاک زمانے'' ان وقتوں، ان زمانوں کی کہانیاں وحقائق وکردار ہیں جو آپ نے اپنی نانیوں، دادیوں اور پردادیوں سے سنے ہوں گے مگر اتنے چمکتے دمکتے اور خوبصورت کردار جنہیں زمانے کی گرد چھو ہی نہیں سکی جو آپ کو آج بھی اپنے عشق میں گرفتار کرنے کی پوری قوّت رکھتے ہیں۔

''دریا'' شاید مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں بڑا سیاسی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں بھی چناب کے شفاف پانی آپ کو اپنی طرف بلائیں گے، اس کے گھنے جنگل بیلے، ان کے سایوں سے پڑتا سیاہ ہوتا پانی گہرے سمندروں جیسا، ویسا دریا جسے سوکھنے کا خوف لاحق نہ ہو! اور اڑتے انوکھے ست رنگ پرندے! اور مستنصر حسین تارڑ نے اپنے اس ناول کو منسوب بھی تو ''عطّار کے پرندوں اور نئے آدم'' کے نام کیا ہے!

اک انوکھی اور نیاری دنیا ''دنیا پور، کی جہاں بخت جہاں سا اڑیل گھبرو جاٹ ہے اور اس کی مسخ شدہ جتے مگر حسین صورت پیٹی گرامو فون پر ''بدریا برس گئی اس پار'' اور جب دل ہی ٹوٹ گیا'' سنتی نظر آتی ہے! اک انوکھا ناول اور بڑے انوکھے نیارے کردار، ہر کردار اپنی جگہ اک روشن ستارہ، اک مقناطیس ہے جو اپنی جانب کھینچتا اپنی وادیوں میں اپنی ذات کی پہنائیوں میں گم ہو جانے کی دعوت دیتا ہے۔

اس دنیا پور کی نور بیگم ہے، روشن کو جنم دینے کا فخر حاصل کرنے والی، چوہدری محمد جہان نمبردار کی آخری بیٹی، امیر بخش کی بیوی، چیمی جاٹ ہونے کے باوجود اپنی ماں بہشت بی بی کی تمکنت ووقار اور اپنے باپ محمد جہان کی نرمی وحلاوت فطرت میں گھلی ہوئی، وہ نور بیگم جس کے شوق نرالے تھے اور دنیا پور والے اس کے ''شریک'' اسے تمسخر سے مرغیوں کی ماں کہتے اور اسے اس لقب سے کچھ ملال نہ ہوتا بلکہ فخر مند ہوتی کہ اگر ایک بلیوں کا باپ یعنی ''ابو ہریرہ'' ہو سکتا ہے تو وہ بھی مرغیوں کی ماں ہو سکتی تھی۔ نسبت کی بات ہے جس کو سمجھ آ جائے تو!

یہ ان خس وخاشاک زمانوں کی داستان ہے جب پاکستان بننے میں قرنوں کا فاصلہ تھا۔ وہ زمانے جب کوئی بارات گاؤں میں آ تر تی تھی تو

> ''اسروز پوری برادری کی بھینسوں کا دودھ گھر نہیں جاتا تھا، چوپال یا دارے میں اترے ہوئے باراتیوں کی مدارات کو جاتا تھا۔ کئی روز بیشتر دلہن والے برادری کے گھروں میں چارپائیاں اور بستر اکٹھے کرنے لگتے تھے تب ایک چوہدرانی

کے لیے پرفخر لمحہ وہ ہوتا تھا جب وہ پچھلی کوٹھڑیوں میں سے نیچے اوپر رکھی نواری راتگلے پایوں والی متعدد چارپائیاں اور تہہ شدہ درجنوں بستر درآمد کر کے دلہن کے گھر والوں کو پیش کر دیتی تھی اور وہ شکر گزار ہو کر کہتے چوہدارنی پورے گھر گاؤں میں سب سے زیادہ اورنویں نکور بستر تمہارے گھر سے نکلے ہیں.....''

اور پھر داستان فسادات کے ان زمانوں تک سرک آتی ہے جب روشن جنم لیتا ہے وہ روشن جس کے پیدا ہونے پر نور بیگم کے بقول

''وہ اپنے رب کی اتنی شکر گزار تھی کہ اسے روشن بخش ایسا بیٹا نصیب ہوا کہ اس نے چاچے کے گناہوں کو بھی درگزر کر دیا''

اور اسی نور بیگم کی بہن ''ایک تھی ماہلو'' وہ ماہلو جس کے قصے کہانیاں میں نے بچپن میں اپنی نانی سے سنے جو لوک قصوں کا حصہ بن گئی، حسنِ فتنہ طراز کی مالک، ماہلو بقول تارڑ:

''یہی سوہنی جو ہمیشہ ماہلو کہلاتی تھی محمد جہان کے گھر پیدا ہوئی.....جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی اس کے حسن کی روشنائی سے دنیا پور کے کچے بام و در روشن ہونے لگے''

اور جو ایک پینگ کے ہلانے میں امام بخش کے گھبرو کا دل لے گئی۔ وہ امام بخش جس کے ساتھ اس کا نکاح عرش پر پہلے ہوا تھا اور جس سے اس نے پہلی رات بڑی نیاری سی فرمائش کی تھی ''مجھے چڑھتے مہینے کی پہلی جمعرات اپنے چاچے اور بے بے سے ملنے دنیا پور جانے دینا'' میری اس گھوڑی کے پاؤں میں جو دنیا پور سے کوٹ مراد لے کر آئی جھانجھریں ڈلوا دینا اور تو کاشتکاری واہی بیجی ترک کر کے میرے سامنے بیٹھا رہا کر'' اور

''وہ اس نسل کی ماہلو تھی جو کبھی بھاگ والی نہیں ہوتی.....مولوی حاکم دنیا پوری کے زمانوں کی دوسو برس پیشتر کی ماہلو تھی اور عہدِ حاضر کی 1929ء کی ماہلو محمد جہان نمبردار کی بڑی بیٹی گھوڑی پر سوار اپنے میکے جاتی تھی۔''

پھر بخت جہاں جیسا اکھڑ چیما جاٹ ہے جس کا متکبر حُسن و وجاہت جانے کتنی عورتوں کو گھائل کر چکا اور کتنی اتھری گھوڑیوں کو رام کر چکا! ایک ایسا متضاد کردار جو ہر طرح کی برائی میں ملوث ہونے کے باوجود آپ کو مجبور کرے گا کہ آپ اُس کی محبت میں مبتلا ہو جائیں! وہ اکھڑ متکبر بخت جہاں جس کو دیکھ کر امرت کور اپنا دھن دھرم سب بھلا بیٹھی اور کنیز فاطمہ بن کر اُس کی زندگی میں چلی آئی۔ وہ بخت جہاں جو کہتا ہے:

''نہیں لحاظ کیا تھا دھیے میں کوئی انکار کرتا ہوں تو خود چیمی ہے جانتی ہے کہ چیمہ جاٹ ذرا کھردرے اپنی خصلت سے اور تکبر سے مجبور ہوتے ہیں اگر میں نے لحاظ نہیں کیا تھا تو میں بھی مجبور تھا۔ میری گردن کوئی جماندرو ٹیڑھی نہ تھی۔''

پھر امیر بخش جیسا مضبوط ٹھنڈا ٹھار چناب کے پانیوں جیسا گہرا میٹھا کردار ہے، ایسا کردار جس نے مجھے اپنی اور اس شدت سے کھینچا کہ جب امیر بخش خود بیکٹیریین بن کر دُھند میں گم ہو گیا تو میرا دل چاہا کہ مَیں اُسے کھوجنے نکل جاؤں مجھے جانے کیوں لگا کہ وہ اب بھی کسی پرندے کا بدن اوڑھ کر چناب پہ اُڑتا ہو گا، اسی چناب کے اُوپر جس کے پانیوں میں تیرتا وہ محکم دین کو روٹی دینے جایا کرتا تھا، وہ محکم دین کوٹ ستارہ کا محکم دین جو صرف اُس روٹی کا نوالہ لیتا جس پر اُس کی گھر والی کی اُنگلیوں کے نشان کھبے ہوتے! امیر بخش، جسے پنکھ

پکھیڑوں اور جنگل بیلے میں رہنے والے جانوروں سے عجیب سا اُنس تھا، جو گاڈھی پر سویوں کی طرح گرتے سانپوں پر بھی ہاتھ نہیں اُٹھاتا تھا۔ بقول مستنصر حسین تارڑ:

''اُس کی آئندہ زندگی بھی اِسی خصلت کے تابع رہی بہت سے انسان اُس کی جان کے آزار کو آئے، اُس کے رزق کے درپے ہوئے، اُسے ایذا دینے اور حیات کو مشکل بنانے کے درپے رہے۔ اُس کی زندگی کی گاڈھی میں سے سانپ کی طرح سویوں کی مانند گرتے رہے، پر اُس نے اپنی خصلت کے تابع اُنھیں بھی بخش دیا۔ اُن پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔''

وہ امیر بخش جس کو دریا کے اُوپر اِک اور دھند کے دریا میں ان دیکھے پرندے نظر آتے تھے۔ چناب کے پانیوں میں ان تنی ان دیکھی مچھلیاں، کچھوے، لُدھر سانپ اور مگرمچھ دیکھے جن کے منہ حیرت سے کھل گئے کہ اُن کی آبی دنیا میں اک دس برس کا بچہ بے خطر تیرتا چلا جا رہا ہے۔

وہ امیر بخش جس پر اُس کے چاچے خوشی محمد گوندل نے بولی کُتے چھوڑ دیے وہ لمحہ کہ ''اُن چند لمحوں میں اُس پر سارے بھید آشکار ہو گئے۔ کائنات کے کُل رموز آسمانی صحیفے، قضا و قدر، حیات بعد از موت، عالم ارواح، وہ ساری گتھیاں جو ویدوں اور حکیموں سے نہ سلجھ سکیں تھیں..... کائنات کے کل رموز پر، آسمانی صحیفوں پر، قضا و قدر پر حیات بعد از موت اور عالمِ ارواح پر صرف یہ تین بولی کتے جو راج کرتے تھے یہی آخری سچ تھے۔''

اور اِن کتوں نے جب اپنے نوکیلے دانتوں سے اُس کی پنڈلیوں کو بھنبھوڑا اور پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے اُس کے کالے بھورے بالوں پر برف اُتر آئی تھی اور یہ بھید جان لینے کی سزا تھی! اور پھر امیر بخش اپنی اس عریاں خون آلود پنڈلی پہ کھدے ''ٹکٹ'' کے سہارے پیدل گجرات سے لاہور چلا گیا۔ لاہور میں اپنی دُنیا بنانے کا عزم لیے اور وہ جو چناب کے پانیوں سے روز پوتّر ہوتا تھا اس شہر میں اِک مدّت تک بھوکے پیٹ، بغیر چھت اور ان دُھلا روز و شب کرتا رہا!

یہیں اُس کو عزیز جہاں جس کا اُس نے بہنوئی بن جانا تھا اور سروسانسی سے ملاقات ہوئی۔ سروسانسی اِک ایسا عجیب کردار کہ آپ مدتوں بھول نہ پائیں گے۔

دُنیا پور کے بڑے جوہر کے پار قبرستان سے مخالف سمت پر جہاں کوئی اور نہ بستا وہاں ان سانسیوں کی بستی تھی! وہ سانسی جو ہر دین دھرم سے آزاد، ہر حرام حلال کی پابندی سے آزاد کہ قدرت نے جتنے طیور اور چرند پرند پیدا کیے، کھانے کے لیے پیدا کیے! کتے، بلے، کچھوے، سانپ، گلہریاں اور خاص طور پر نیولے ان کی مرغوب غذا تھی! یہ کسی بھی طے شدہ مذہب کے پیروکار نہ تھے۔ انسانی جبلت سے سراسر ماورا! مردار کھانے والے جانوروں کی طرح بے سبب پیدا ہونے اور مر جانے والے اور اسی قوم کا نمائندہ سروسانسی!

پہلی ملاقات میں امیر بخش اسی سروسانسی کو ''اپنے چوہدری..... راجے کا کھٹیا'' مردار خور کو اپنے دسترخوان پر بٹھا کر ہمیشہ کے لیے خرید لیتا ہے! مملکت پاکستان خس و خاشاک زمانے سِرک کر آگے آتے ہیں اور اک نومولود ریاست جنم لے رہی ہے۔ امیر بخش عزیز جہاں اور سروسانسی اپنے خاندانوں سمیت لاہور میں پیر جما چکے ہیں اور سوہن سنگھ بھی لاہور میں اِن کے ساتھ ہے۔ کون سوہن سنگھ، کوٹ ستارہ کا سوہن سنگھ، پر وہ سکھ جاٹ ہیں جو دُنیا پور اور کوٹ ستارہ میں قیام پاکستان میں مسلم جاٹوں کے ساتھ کس ہم آہنگی اور بھائی چارے سے رہتے تھے۔ یہ وہ سوہن سنگھ ہے جس کے ساتھ اُس کے امیر بخش کے واہے ایسے ہم آہنگ تھے جیسے جڑواں بھائیوں کے! اور یہ وہ زمانے ہیں جب پوری ٹرینیں خون اور گوشت کے لوتھڑوں سے کٹی اور لتھڑی آتی تھیں اور ٹکٹ چیکر باتونی ٹکٹ چیکر سودائی ہوا پھرتا داستانیں

سناتا کہتا تھا ''کہانی مختصر''!

اور کوٹ ستارہ میں بھی ان دنوں اک عجیب بارات اُتری تھی جسے گاؤں کے کسی باسی نے اپنی بیٹی دینے کا وعدہ نہ کیا تھا۔ یہ وہ باراتی تھے جو لُٹ لٹا کر اپنی ماؤں، بہنوں کے ریزہ ریزہ بدنوں، آبروؤں کو دیکھ کر حواس باختہ تھے۔ جنہوں نے مردہ بچوں کو برچھیوں میں پروئے دیکھا تھا، وہ اب اُن کے کسی بھی بچے کو پیدا ہوتے نہ دیکھ سکے تھے! انہی فسادات کے زمانے میں سوہن سنگھ کے خاندان کو بچاتے امیر بخش اپنا باز و گنوا بیٹھا ہے اور خود بھی نیلی دُھند میں گم ہو جاتا ہے! ہاں امیر بخش جیسا انوکھا پنچھی کسی دھند میں ہی گم ہو سکتا ہے!

پھر اِک انعام اللہ ہے جسے سروسانسی نے مسجد کی سیڑھیوں سے اُٹھا کر زندگی کا اک نیا در کھولا تھا۔

فسادات کے زمانوں میں یا پھر لاہور میں زندگی کا اِک نیا آغاز یا پھر چناب کے پانیوں پر چھائی ہوئی دھند، امیر بخش اور اس کا ست رنگا رانگلہ پرندہ ناول پہ راج کرتا نظر آئے گا آپ کو، وہ خوشی محمد جس کے کتوں نے اُسے گیانی بنا دیا، قیام پاکستان کے وقت اُسے والٹن کیمپ میں ملا تو امیر بخش کے کردار کے آگے سر جھک جائے گا آپ کا!

یہ ناول آگے بڑھ کر مارشل لاء کے مکروہ دور میں داخل ہو جاتا ہے جہاں روشن اور انعام اللہ؟ کون انعام اللہ اُس کا بڑا بیٹا! صرف اُسی کا نہیں سروسانسی، عزیز جہاں اور سوہن سنگھ کا بھی بیٹا تھا۔ مارشل لاء سے نفرت آپ کو مستنصر کی تحریر میں بہت واضح نظر آئے گی۔ انعام اللہ جو امیر بخش کا منہ بولا بیٹا اک ناولسٹ ''ٹیکسی ڈرائیور از اے پراسٹیوٹ اور ''آٹو بائیوگرافی آف اے باسٹرڈ'' جیسے ناول کا لکھاری، آپ کو اک اور امیر بخش نظر آئے گا! سروسانسی کے بیٹے عجب رنگ دکھلاتے نظر آئیں گے بخت جہاں کی بے شمار اولادوں میں سے ایک اکبر جہاں کینیڈا میں جہان آباد کا معمار، جی ہاں ناول آگے بڑھ کر امریکہ و کینیڈا کی ہوش ربا تیز رفتار زندگی میں داخل ہو گیا ہے جہاں 9/11 کے سانحہ نے عراق جنگ میں مرجانے والے بچے اور پرندے انعام اللہ سے ہر احساس کی نرمی چھین لیتے ہیں۔ انعام اللہ بخت جہاں کا پوتا بخت جہاں اور شباہت سروسانسی کی پوتی اک نئی ٹرائیکا بناتے نظر آئیں گے۔

سانسیوں کی قدیم دانش و وحشت و حُسن آپ کو پاکستان کی فضاؤں سے انجانی شباہت میں نظر آئے گا۔ وہ شباہت جو کہتی ہے

''اس دھرتی پر جتنے بھی آدم کے مٹی کے بُت ہیں اِن کی مٹی کو پھر سے گوندھ کر اِک نئے انسان کو ایک نئے آدم کو تخلیق کرنا ہے۔''

لوک داستانوں، چناب کے پانیوں میں بہتی زمینوں پر بستی زندگیوں، عطار کے پرندوں اور نئے آدم کی نوید دیتا یہ ناول آپ کے ذہن و دل پر اِک گہرا عکس چھوڑے گا۔ عطار کے پرندوں اور نئے آدم سے نسبت ہی بڑی معنی خیز ہے۔ عطار کے وہ طائر جنہیں انوکھی وادیوں کے سفر درپیش تھے اِن وادیوں کے پار جہاں ''سیمرغ'' بستا ہے، فنا کی وادی سے کیا اِک نیا آدم جنم لے گا؟ کیا وہ آدم جو ترغیب و اُکساہٹ سے خالی ہو گا مگر آدم کی پُرتقصیر فطرت ہی تو اس کی آدمیت ہے!

وہ نیا آدم جو سانسیوں کی قدیم دانش و وحشت بن کر شباہت میں مجسم ہو گئی اور انعام اللہ جو خود اِک سوالیہ نشان ہے انسانیت کے لیے، وہ انعام اللہ جو عراق میں بمباری، بے دریغ بمباری میں مرنے والے چڑیوں کے سے دلوں والے بچے اور خود ننھی مُنی پھکتی چڑیوں کے مرجانے پر رنج و الم کی تفسیر بن جاتا ہے اور امریکہ اُس کے غیض و غضب کے نشان پر، وہ نیا آدم شباہت و انعام اللہ کے صلب سے تخلیق ہو گا! اک ضخیم ناول بے شمار کردار مگر ہر کردار اپنے پیچھے اِک داستان لیے ہوئے، تسبیح کے دانوں کی طرح مربوط ہے۔ یہی اِس ناول کا حُسن ہے!

◆◆◆

سلسلے محبتوں کے

دوستوں کے دوست اظہر جاوید کے خطوط ـــــ معاصرین کے نام

محترمہ جمیلہ شبنم کے نام

محترمہ جمیلہ شبنم!

پہلے آپ کا شبنمی خط ملا، پھر جمیل سامنی آرڈر پہنچ گیا۔تشکر!!

خط کو شبنمی اس لئے لکھا ہے کہ اس کا انداز شاعرانہ ہے۔

منی آرڈر کو جمیل اس واسطے لکھا کہ اس کا ٹھاٹ فاخرانہ ہے۔

میرے لئے دونوں بیش بہا ہیں.....آپ ایسے اہلِ نظر اور صاحبِ دل لوگ یوں سراہتے رہیں، تو جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔کچھ واقعی اچھا لکھنے کی تحریک ہوتی ہے.....

ساحرؔ آپ کا (بھی) پسندیدہ شاعر ہے.....میرے ایسے لوگ اس جیسا لکھنا تو کجا، اس جیسا سوچ بھی نہیں سکتے.....اظہار کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔

آپ نے جس طرح میرے نام کا ''شجرہ'' بنایا ہے، اس سے آپ کی روشن ضمیری ہویدا ہے، اور میں بچارا، شرمسار ہوتا رہا۔(الف۔جیم)

رب راکھا، آپ کا.....اظہر جاوید

12-06-2006

.....

جناب نارنگ ساقی کے نام

پیارے ساقی جی!

بہت دن ہو گئے آپ کا محبتوں سے لبریز ملفوف ملا تھا۔''تخلیق'' مصروفیات کی وجہ سے جلد جواب نہ لکھ سکا۔

ایک بات عرض کرتا ہوں۔

آپ وسیع القلب، روشن ضمیر اور سیاسیات سے بالاتر شخصیت ہیں اور آپ نے ہمیشہ تحریر اور گفتگو میں احتیاط سے کام لیا ہے، بلکہ ہمیں تلقین کرتے رہتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہ کریں جس سے پاکستان، ہندوستان کے تعلقات کا جوروّیہ بنتا ہے، اس سے اُلٹ کوئی

معاملہ ہو۔ آپ نے صابر دت کے مضمون میں ایک جملہ رواروی میں لکھ دیا تھا۔ میں نے یہاں تو دُرست کر لیا ہے، اُدھر کہیں چھپوائیں تو نظرثانی کر لیں۔

صابر دت کی جنم بھومی میر پور کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے لکھا..... ''یہ علاقہ اب پاکستان کے قبضے میں ہے۔'' حالاں کہ اتنا ہی کافی تھا: ''یہ علاقہ اب پاکستان میں ہے'' یہ لمبی بحث ہے، کہ کون سا روّیہ درست ہے، اور فقرہ بھی کیسے ''درست'' ہے.....؟ آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔

ایسے میں کیا کیا وضاحت کروں گا۔ میں بچارا تو مارا گیا۔

منہ بڑے کو ہدایت دے نہ دے، مجھے ضرور ''حفاظت'' دے تا کہ ہر وار سے بچا رہوں۔

ریحانہ روحی صاحبہ کے دو پتے ارسال ہیں۔ فہمیدہ ریاض صاحبہ کا فوری طور پر ملا نہیں۔ کہیں سے لے کر بھیج دوں گا۔ فی الحال اسی پر اکتفا کریں۔

دِلّی کے دوستوں کو (بشرطِ ملاقات یا فون پر بات پر) آداب کہیں۔

آپ نے جو بُری عادت ڈالی ہے، مجھے نہیں خود کو، کہ خواہ مخواہ زیر بار ہونا..... میں پھر اس بار انڈیا کے ٹکٹ نہیں لایا یہ بیگار بھی آپ ہی بھگتیں۔ یہاں آ کر چنن سنگھ ورک کا خط پھر پڑھا ہے۔ واقعی اُس کی جوان بیٹی (شبنم) نے خودکشی کر لی ہے۔ اُنہیں بھی خط لکھ رہا ہوں۔ رب آپ کو سُکھی اور شاداب رکھے۔ میں نے ابھی سے دسمبر کے کپڑے سنوارنے شروع کر دیئے ہیں۔ دِلّی میں بھی تو لاہور جیسا موسم ہوتا ہے۔

رب راکھا، آپ کا.....اظہر جاوید

23-08-1998 .....

پیارے ساقی صاحب!

رب آپ کو شاد آباد رکھے!

آپ کی محبت کے طفیل اور آپ کی عنایات کے سبب بھارت میں چند دن بہت اچھے گذر جاتے ہیں۔ اتنے اچھے، کہ واپس پہنچ کر بھی ایسے لگتا ہے، جیسے وہاں کچھ رہ گیا ہے بلکہ میں خود بھی وہیں کہیں رہ گیا ہوں۔

آپ جتنا کرم کرتے ہیں، جس قدر نوازتے ہیں، مجھ ایسا بندہ تو اس کا بھرپور جواب بھی نہیں دے سکتا۔ بس دُعا ہی دُعا ہے۔ اور میرا خیال ہے، آپ کو اللہ نے (بھگوان نے) اتنی محبت، دولت اور عزت دے رکھی ہے کہ اب آپ کو صرف دُعا ہی کی ضرورت ہے، اور کیا چاہیے؟ مجھ ایسے بندے کو جسے نشے اور سرور سے واقفیت ہی نہیں، اسے بھی یقین ہو رہا ہے، کہ ابھی تک میں آپ کی محبتوں کے کیف سے مخمور ہوں۔ (مخمور سعیدی نہیں)

لاہور میں کوئی خدمت ہو تو یاد فرمائیں..... آپ کے دیئے ہوئے سویٹر پہنچا دیئے ہیں۔ سب کو آداب، بچوں کو پیار!

رب راکھا، آپ کا.....اظہر جاوید

25-10-2000 .....

محترمہ خالدہ احسان کے نام

محترمہ خالدہ!

پچھلے کئی دنوں سے میں فیصلہ نہیں کر پایا، کہ آپ کو پُرسا دینے کے لئے فون کروں یا تعزیت کے لئے گھر جاؤں۔

آپ جس کرب میں ہیں، اُس کا کوئی اور کیا اندازہ کر سکتا ہے۔ ہمدردی کے لفظ مرہم سہی، لیکن یہ تو آپ کو پہلے ہی سے یقین ہے، کہ میرے ایسے نیازمند آپ کے لئے نیک جذبات رکھتے ہیں۔

ہم بے بس بندے اُس کردگارِ ازل کی رضا کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہیں۔ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے، کہ آپ حوصلہ مند ہیں، غم کو سہہ لیں گی مگر..... کہنے کی باتیں تو الگ ہوتی ہیں، حقیقت الگ!

میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں

رب راکھا، آپ کا.....**اظہر جاوید**

22-12-2000

.....

خالدہ صاحبہ!

آپ کے فون نے مجھے حیران اور آپ کے خط نے پریشان کر دیا۔ حیرانی اس بات پر ہوئی، کہ میرے دُکھ کو آپ نے اپنا سا سمجھا.....اور پریشانی یہ ہے کہ میں آپ کے خط کی کتھا پر، آپ کے لئے دُعا بھی نہیں کر سکتا.....

دُعا کرنے میں ڈر یہ ہے، کہ آپ سچ پر قائم رہیں گی، اور یہ معاشرہ آپ کو اور زیادہ دُکھی کرتا رہے گا۔

ہم جس دُنیا میں ہیں، اس میں تو اب سچ کہنے والا مرد، اکیلا رہ جاتا ہے، اور اس **''مرد معاشرے''** میں عورت تو ویسے ہی کچلی، مَسلی چلی جا رہی ہے۔

پھر آپ کے اس جذبے کو بہت سراہا کہ آپ نے ''تخلیق'' کی سالانہ قیمت بھی بھیج دی اور وہ بھی ڈھیر ساری.....

یقین کریں بی بی، آپ ایسی بہادر خواتین تو اس مقام اور مرتبے پر ہوتی ہیں کہ میرے جیسا بندہ، خود اُس کی دہلیز پر پہنچ کر اپنی ''کوشش'' کا ثمر پہنچائے۔

آپ کا جب جی چاہے، آپ، بقول اپنے Share کر سکتی ہیں۔ میرے پاس آپ ایسے جی دار لوگوں کی کہانیوں کا بہت سا خزانہ، بے انت امانتیں محفوظ ہیں۔ کیا آپ پنجابی پڑھ لیتی ہیں.....؟

پچھلے دنوں میں، میری پنجابی کہانیوں کی ایک کتاب بھی چھپی ہے..... میں آپ کو ''تحفہ'' دینا چاہتا ہوں.....اور تحفہ تو آپ کے لئے میری لکھی کتاب ''رابعہ بصریؒ'' کا بھی جانا چاہیے۔ جیتی رہیں.....شاد آباد رہیں۔

رابطہ رکھیں گی تو اچھا لگے گا..... ''تخلیق'' میں کچھ بھیجیں تو خوشی ہوگی۔

آپ کے طویل اور ''پُر دلیل'' خط کا جواب بھلا کیا لکھوں؟ **کاش میں آپ جیسا اچھا لکھ سکتا۔**

رب راکھا، آپ کا.....**اظہر جاوید**

02-06-2008

◆◆◆

مامون ایمنؔ (نیویارک)

نعت

عرشاں والا احمدؐ بے شک، ہادی وی ہے، رہ بر اے
اے سے خاطر اوہدا چہرا میرے دل دا منظر اے

عبداللہ تے آمنہ بی بی دا او سوہنا پتّر
رحمت بن کے آون والا ہر جگ دا پیغمبر اے

سچّے رب نے سب نبیاں نوں اُچّا درجہ دِتّا سی
لیکن اُس امّی پیغمبر دا تے درجہ دیگر اے

جیس نے اِک رب نوں مَنیاں او اپنے آپ دا ہویا
جیہڑا ہٹیا اس رستہ توں او تے ویراں در در دے

اک رب نُوں اک رب ہی کہنا اونے سانوں دسیا سی
دین دا رستہ بالکل اے سے راز دے اندر اے

شاہی اوہدی ذات تے قرباں ہوون نوں مَر مِٹّی
اوہدا دل فقیری ہے، او شاہی توں بختاور اے

ایمنؔ! تیرے لفظ وی پھوکے، جذبے تیرے خالی
اوہدا چہرہ جگ مگ چانن، تیرا کوئی جوہر اے

OOO

حنیف باوا

ترنّ نظماں

(1)

اوہ کڑی

اوس کڑی دا جُثّہ
جیٹھ ہاڑھ دی دُھپ
پر کی دساں
اوس کڑی دیاں اکھیّاں دے وِچ
اِک سائیں دی گلّی ورگا نِگھ

(2)

سنجوگ

توں جد مِلدی
میں کھڑ جاندا
جد ٹُر جاندی
پت جھڑ دا مَیں
اک پتّا ہوندا

(3)

اک مِکّ

تُوں حُسن دا
سُندر رُکھوڑ
میں عشقے دا دُھخدا سچ
مُڑ وی آ وَ
اِنج رل بہیئے
رہوے نہ کوئی کچّ

OOO

نُور زمان ناوکؔ

اچھے سنگ ترے

دودھ پتی جئی رنگت اوہدی
ہرنی ورگے نین
زلفاں مست گھٹاواں وانگر
واؤاں دے نال کھین
گلھاں اُتے حُسن ازل دی
سُرخی مارے ڈلکاں
محراباں دی زینت جاپن
اوہدیاں جھالر پلکاں
دنداں دا لشکارا ایسا
ہیرے پوے تریڑ
ہونٹاں دی کوملتا پاوے
پُھل کلیاں دا گیڑ
چہرہ نُور رسویر
گل، نفی دی گانی اوہدے
جُثّہ عجز کمان
ونڈی پھرے گیان
اونے جداَ کھ چُک کے، تکیا
چڑھیا مَیں میزان
ہنجو کرِ دے جان

OOO

منزہ شاہد

اِک نظم

ایہہ عشق دا چرخا کہندا اے
ایہنوں لَو نال کتنا پیندا اے

کسے حق دی سُولی چڑھ کَتیا
کِسے ہجر دی آتش سڑ کَتیا
کِسے سر نیزے تے دھر کَتیا
کوئی کتنوں باہجھ نہ رہندا اے
ایہہ عشق دا چرخا کہندا اے
ایہنوں لَو نال کَتنا پیندا اے

جدوں وچ ترنجن وَڈھ جاوے
جدوں تار عشق دی اَڑ جاوے
جدوں پُونی تکلے چڑھ جاوے
فیر گھوں گھوں کردا رہندا اے
ایہہ عشق دا چرخا کہندا اے
ایہنوں لَو نال کَتنا پیندا اے

ایہدی آتش تن من پُھوک دیوے
ایہہ جگ توں وکھری کوک دیوے
کدے ناگاں ورگی شُوک دیوے
ایہدا وار نہ ہر کوئی سہندا اے
ایہہ عشق دا چرخا کہندا اے
ایہنوں لَو نال کَتنا پیندا اے

ایہدی کُوک کلیجے لگدی اے
فیر رَت اکھیاں چوں وگدی اے
کوئی سُرت نہ رہندی جگ دی اے
جد ساہواں دے نال کھیندا اے
ایہہ عشق دا چرخا کہندا اے
ایہنوں لَو نال کَتنا پیندا اے

OOO

تبصرے

موسم کبھی بدلے (حسن عسکری کاظمی)

مبّصر : انور سدید

جناب حسن عسکری کاظمی غزل اور پابند نظم کے قادرالکلام شاعر تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ اس کا دستاویزی ثبوت ان کی شاعری کی کتابیں..... ''دشتِ بے صدا''..... ''خیمۂ خیال''..... ''ریزۂ خواب''..... ''لہولہو بولتا ہے'' اور ''شب تاب'' ہیں۔ غزل اور نظم کے ساتھ انہوں نے اپنی روحانی طمانیت، سکونِ قلب اور راحتِ جاں کے لیے باری تعالیٰ کی حمدیں لکھیں۔ رسولِ کریم حضرت محمد مصطفیٰؐ کے حضور میں نعتوں کے نذرانے پیش کیے، شہیدانِ کربلا کے مرثیے لکھے۔ ''جمالِ مصطفیٰؐ''..... ''دیدۂ نم ناک''..... ''آیاتِ درخشاں'' ان کی نعتوں کے مجموعے ہیں جن میں زمزمہ ہائے عقیدت نور کے چشموں سے پھوٹتے محسوس ہوتے ہیں۔ ''مناقب وسلام'' کی کتاب کا نام ''مقصودِ کائنات'' ہے۔ پانچ مرثیوں کا مجموعہ ''کنارِ دجلۂ اُلفت'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ شاعری کی کتابوں کی یہ تفصیل ظاہر کرتی ہے کہ حسن عسکری کاظمی کی ادبی زندگی فن کے ضابطوں اور قاعدوں کی مطابقت میں گزری ہے اور انہوں نے اظہار وابلاغ کے معروف قرینوں کو ہمیشہ خوش دلی سے قبول کیا اور ان سے اپنے باطن کو منکشف کرنے کا کام لیا ہے، اور تاہم جب ان کی شاعری کی نئی کتاب ''موسم کبھی بدلے'' آئی تو اسے شاعری کی آزاد ہیئت میں دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ وجہ یہ کہ فطرت نے جس شخص کو طبعِ موزوں عطا کی ہو، وہ ہیئت کے تمام اسالیب کو استعمال کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ جناب حسن عسکری کاظمی کی نئی کتاب ''موسم کبھی بدلے'' دیکھ کر مجھے خوشی اس لیے ہوئی کہ اب وہ اپنے باطن اور اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے نظمِ معرّیٰ اور نظمِ آزاد کی طرف آ گئے ہیں جو اس دور کی مقبول ہیئتیں ہیں۔ اور اب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تصدق حسین خالد، عطاء اللہ سجّاد، میراجی، اور ن۔م راشد سے لے کر دورِ جدید کے ممتاز شاعر ڈاکٹر وزیر آغا تک نے آزاد نظم کو مقبول بنانے میں جو مثبت کردار ادا کیا تھا، اس میں حسن عسکری کاظمی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اور نظمِ جدید کی تاریخ میں ان کا نام بھی سنہری لفظوں میں لکھا جائے گا۔

مجھے حسن عسکری کاظمی کے ہاں موضوعات کا دل آفریں تنوّع نظر آیا۔ ان کی ظاہر کی دو آنکھیں معاشرے کے واقعات، حالات اور مدوجزر کے علاوہ شخصیات کے افعال وکردار کا جائزہ لے رہی ہیں، زیرک نگہی سے ان کا مشاہدہ کر رہی ہیں لیکن ان سے جو تلاطم ان کے باطن میں پیدا ہوتا ہے اس کا جلال و جمال ان کی تیسری آنکھ دیکھتی ہے اور پھر نظم کی صورت دینے میں حسن عسکری کاظمی صاحب کی معاونت کرتی ہے..... ''فرصتِ ہستی''..... ''طلوعِ صبحِ الم''..... ''اُجالوں کا سفیر''..... ''امیدِ سحر''..... ''ہم کسے آواز دیں'' وغیرہ نظموں میں ایک

دردمند شاعر زوالِ عصرِ حاضر پر اپنی مثبت خیالی نقش کرتا نظر آتا ہے۔ایک سو سے زیادہ نظموں کی یہ کتاب بظاہر کاظمی صاحب کے تاثرات کا مجموعہ ہے لیکن آپ اسے قوم کا نامۂ اعمال بھی کہہ سکتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے پیش لفظ میں تسلیم کیا ہے کہ ''یہ نظمیں ایک طرف تو حسن عسکری کاظمی کے وسعت اختیار کرتے ہوئے عصری شعور کا پتہ دیتی ہیں تو دوسری طرف ان کے رجائی نقطۂ نظر کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔''اس کتاب کا مطالعہ آپ کے ذہن کو بھی مثبت انداز میں مہمیز کرے گا۔۲۱۴صفحات کی یہ کتاب خوبصورت سرورق سے مزّین ہے۔ جلد مضبوط ہے اور کاغذ سفید استعمال کیا گیا ہے۔ قیمت 300 روپے۔ ملنے کا پتہ.....اظہار سنز، اُردو بازار، لاہور۔ مصنّف کا پتہ.....حسن عسکری کاظمی، 72۔سی، اعوان ٹاؤن، لاہور (فون:0345-4698398)

.....

محبت سانس لیتی ہے

شاعرہ : فصیحہ آصف خان

صفحات : 136 قیمت : -/200 روپے مبصر: آفتاب خان

شاعرات پر ایک الزام بڑی دیر سے چپکا ہوا ہے کہ وہ شاعری خود نہیں کرتیں بلکہ مردوں سے لکھواتی ہیں۔ پروین شاکر کے ابتدائی دور میں اُن پر بھی یہی الزام لگا تھا۔ اُس کے بعد نوشی گیلانی سے لے کر عہدِ حاضر کی بے شمار شاعرات اِس الزام کی زد میں آ رہی ہیں۔ ظاہر ہے اِس میں کسی نہ کسی حد تک صداقت ضرور ہوگی ورنہ کوئی افواہ یونہی نہیں پھیل جاتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کی شاعرہ فصیحہ آصف پر یہ الزام اِس لیے نہیں لگ سکتا کہ انہوں نے نثری شاعری کی ہے اور اُن کی اِس کتاب میں سوائے ایک غزل کے کوئی چیز بھی وزن میں نہیں۔ (اگرچہ غزل کو بھی کمپوزر نے غلط ٹائپ کر کے بے وزن کر دیا ہے) لیکن اِس میں جو نظمیں کہی گئی ہیں اُن میں سچی لگن اور دل کے نازک احساسات پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک تڑپ اور کسک موجود ہے۔ انہوں نے ماں باپ، وطن، دھرتی، سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ ہجر و وصال کے جذبات کی بھرپور انداز میں ترجمانی کی ہے اور ان میں اپنا خونِ دل نچوڑ کر شامل کر دیا ہے مثلاً ایک مختصر نظم ''لڑکیاں'' ملاحظہ کریں:

کتنی عجیب ہوتی ہیں/ یہ/ الہڑ لڑکیاں/ عمر بھر کیلئے/ غموں کو قید کرنے کے لیے/ کسی کی آنکھوں میں ذرا سی/ محبت پا کر/ کھول دیتی ہیں دل کی کھڑکیاں/ پھر سنتی رہ جاتی ہیں/ اپنی بے صدا/ سسکیاں

اِسی طرح کتاب میں موجود واحد باوزن غزل کے دو اشعار بھی دیکھتے چلیں:

جدائی اک قیامت ہے مگر اِس میں بھی راحت ہے
تمہیں بیکار کب سمجھا ہمیں تیری ضرورت ہے

یہ کتاب شاید ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل نہیں کر سکے لیکن عوامی حلقوں میں اسے ضرور پسند کیا جائے گا کیونکہ اس میں جو شاعری کی گئی ہے وہ عام لوگوں کے دلی جذبات کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے فصیحہ آصف کو یہ تمام خدشات دل سے نکال دینے چاہئیں کہ اُن کی کتاب کی ادبی حیثیت کیا ہے یا اُن پر دوسروں سے لکھوانے کا الزام لگے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہائیکو جیسی صنف کو بھی فصیحہ جی نے نثری انداز میں رقم کر کے پہلی بار ایک نیا تجربہ کیا ہے۔

اُردو ادب کی تحریکیں

تحقیق وتحریر : ڈاکٹر انور سدید

صفحات : 600 قیمت : -/500 روپے مبصر : شفیع عقیل

ناشر : انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی

اگر ادب اور آرٹ میں رجحانات اور میلانات کی فکری اور اسالیبی تحریکوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، تو اس کے ڈانڈے قدیم یونان تک چلے جاتے ہیں، جہاں سقراط، ارسطو اور افلاطون کے ادوار میں فکر وخیال کے نئے نئے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ ویسے میلانات و رجحانات اور اسالیب واظہار کی جدید سے جدید تر کے سفر کی تحریکیں صرف ادب اور آرٹ تک ہی محدود نہیں ہیں، ان کا دائرہ تو پوری انسانی زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔ سیاسی، سماجی، اصلاحی، مذہبی، صوفیانہ اور عمرانی تحریکیں وغیرہ بے شمار ہیں، لیکن پیش نظر ضخیم کتاب صرف ادبی تحریکوں سے بحث کرتی ہے، کتاب کے مصنّف ڈاکٹر انور سدید اُردو کے معروف نقاد ہیں، جنہوں نے قدیم ادوار سے لے کر موجودہ عہد تک کے عرصے میں ادب میں پیدا ہونے والی تحریکوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ دراصل یہ مصنّف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے، جو انہوں نے برسوں پہلے تحریر کیا تھا اور جس پر پنجاب یونی ورسٹی نے انہیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی تھی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں انجمن ترقی اُردو نے اس کا آٹھواں ایڈیشن طبع کیا ہے۔

.....

یادوں کی بارشیں (نسبل صابری)

مبّصر : انور سدید

شاعرہ نسبل صابری نے لکھا ہے:

''وقت کا پنچھی تیزی سے اُڑتا جا رہا ہے۔ زندگی میں جب بھی حادثات کی ٹھوکر لگی ان ٹھوکروں نے ہی مجھے جینا سکھایا۔ کیوں کہ یہ احساس یقین میں بدل گیا ہے کہ خواہشوں کے اُداس گلشن سے ہی راحتوں کی کلیاں کھلتی ہیں۔''

محترمہ نسبل صابری نے اپنی راحتوں کی کلیاں شاعری میں پیش کرنے کا سلسلہ طویل عرصے سے شروع کر رکھا ہے اور وہ ان کلیوں کی خوشبو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتیں بلکہ مشاعروں میں عوام میں بے دریغ تقسیم بھی کرتی ہیں اور پھر کتاب کی صورت میں اس خوشبو کو دوامِ ابد بھی عطا کر دیتی ہیں۔ ان کی شاعری کی پہلی کتاب 1998ء میں ''پانی کا گھر'' کے نام سے چھپی تھی اور اس کتاب کا یہ شعر نسبل صابری کی پہچان بن گیا تھا۔

وہ عکس بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے عجیب شخص ہے ..... پانی کے گھر میں رہتا ہے

ان کی شاعری کی دوسری کتاب 2011ء میں ''روشنیوں کے رنگ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور اس میں انہوں نے اپنے لطیف لہجے میں ایسے رنگ بکھیرے کہ تاریکیاں مات کھا گئیں، معروف شاعر جسارت خیالی نے انہیں جرأت مند شاعرہ کہا تو بسمل صابری کے مزاج کی داخلی کیفیّت بھی منکشف کی کہ ''وہ محبتوں کی سفیر بن کر نفرتوں کے اندھیرے مٹانا چاہتی ہیں'' اور ان کا یہ شعر بھی اقتباس کیا جو ان کی فطرت کا آئینہ دار قرار دیا جا سکتا ہے:

نیا اُجلا سا اک روشن نگر، آواز دیتا ہے　　امیرِ شہر کو اک باخبر آواز دیتا ہے

اب اس تازہ فکر اور متنوّع خیالات کی نامور شاعرہ (بسمل صابری) کا نیا مجموعۂ کلام ''یادوں کی بارشیں'' کے نئے رسمِ ترکیبی سے شائع ہوا ہے جس کی پشت پر سوچتی ہوئی آنکھوں والی اس شاعرہ کا یہ شعر درج ہے:

بسملؔ بھگو گئیں تجھے یادوں کی بارشیں　　بھولی ہوئی تھی جس کو، وہ یاد آ گیا مجھے

آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ مشاعرے کے مقبول شعرا بالعموم اپنا مجموعۂ کلام چھپوانے اور شائع کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنی زندگی مشاعرے سے حاصل کی ہوئی اوسط درجے کے سامعین کی داد و تحسین پر ہی گزار دیتے ہیں، ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے شہادت دی ہے کہ ''بسمل صابری کا نام، کلام اور دل نشیں ترنّم مدّتوں مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بنا رہا'' ترقی پسند تحریک کے ممتاز شاعر علی سردار جعفری نے انبالہ کے انڈو پاک مشاعرہ میں ان سے کہا ''آپ کی آواز نور کی کرن ہے جو سخت سے سخت اندھیرے کو چیر کر نکل جاتی ہے۔ ''بسمل صابری کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مشاعروں کی عارضی شہرت کو اپنی بقا کی چھتری نہیں بنایا بلکہ اپنی خلوتوں کو ریاضِ فن کے لیے وقف کر دیا اور شاعری کے تین مجموعے پیش کیے تو یہ ان کے اعتمادِ ذات کے مظہر اور ان کے فن کی عظمت کے نقیب ہیں۔ ''یادوں کی بارشیں'' کی غزلیں دل کے تاروں کو ہلاتی ہیں اور اس معنویت کو متحرک کر دیتی ہیں جو درد کے حقیقی تجربے سے پیدا ہوتی اور زندگی کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ جناب فرخ سہیل گوئندی نے ان ایوارڈوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے جو معاشرے نے ان کو پیش کیے۔ میرے خیال میں بسمل صابری کی ہر غزل ان کا ایوارڈ ہے جو فطرت ان کو پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کی غزلوں نے مجھے اس وقت مسحور کیا جب موسیقی بسمل صابری کے گلے سے نکلنے کی بجائے اشعار کے باطن سے میری طرف سفر کر رہی تھی۔ شاعری کی یہ خوبصورت کتاب 224 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت -/550 روپے۔ ملنے کا پتہ: جمہوری پبلی کیشنز، 2-ایوان تجارت روڈ، لاہور۔

.....

''تخلیق'' سہ ماہی ''انتساب'' انڈیا کی نظر میں

مبصر : محمد متین ندوی (انڈیا)

ماہ نامہ ''تخلیق'' اُردو زبان و ادب کا ایک ایسا رسالہ ہے، جسے پوری ادبی دنیا نہ صرف جانتی ہے بلکہ پسند بھی کرتی ہے۔ یہ ماہ نامہ اپنی اشاعت کے 43 سال میں قدم رکھ چکا ہے، سال گذشتہ یہ ایک ایسے عظیم سانحہ سے دوچار ہوا جس کے بعد اس کی اشاعت کا سلسلہ ختم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا کیونکہ ''تخلیق'' کے بانی مدیر اظہر جاوید کے اچانک انتقال سے ادبی حلقوں میں یہ بات گردش کرتی ہوئی نظر آئی کہ اب اظہر جاوید کے ساتھ ان کا رسالہ بھی اپنا سفر مکمل کر چکا ہے۔

جہاں تک اظہر جاوید کا تعلق ہے تو انھوں نے تو ماہنامہ ''تخلیق'' کو آخری سانس تک جاری رکھنے کا عزمِ مصمم کر رکھا تھا اور انھوں نے اپنے عزم اور ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہوئے 14 رفروری 2012ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا، لیکن قابلِ مبارک باد ہیں ان کے فرزند سونان اظہر جاوید کہ انھوں نے اپنے والد کے ادبی کام کو اپنے ذمہ لیا اور بحسن وخوبی اس فرض کو نبھاتے ہوئے دو تین ماہ کے قلیل عرصہ میں تخلیق کا ضخیم شمارہ اظہر جاوید نمبر کی شکل میں شائع کر کے پوری ادبی دنیا کو ناامیدی کے غار میں گرنے سے بچالیا۔

ماہنامہ ''تخلیق'' کو ادبی دنیا میں آج جو شہرت ومقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے، اسے اس مقام تک پہنچانے میں اظہر جاوید مرحوم نے کتنی قربانیاں دی تھیں، کس قدر اپنے خونِ جگر سے اسے سینچا تھا، اس کا صحیح علم تو انور سدید، ڈاکٹر کیول دھیر، ڈاکٹر ابدال بیلا اور ان کے دیگر قریبی دوستوں اور ان کے افرادِ خانہ کو ہی ہوسکتا ہے اور ان کے لائق فرزند جناب سونان اظہر جاوید نے عملی شکل میں رسالہ کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، سونان اظہر جاوید لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنے والد کے کام کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری اپنے سر لی اور ساتھ ہی ''تخلیق'' کے معاون بھی قابلِ مبارک باد ہیں، کہ ان کا تعاون جہاں اظہر جاوید کو حاصل رہا وہیں وہ سونان اظہر جاوید کو بھی اپنا تعاون پیش کر رہے ہیں۔ جیسا کہ سونان اظہر جاوید نے خود بھی اجمالاً اپنے اداریہ میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔

ماہنامہ ''تخلیق'' کا شمارہ نمبر 9 رستمبر 2012ء اس وقت میرے سامنے ہے، ''پہلی بات'' کے عنوان سے سونان اظہر جاوید نے اچھا اداریہ لکھا ہے، اس اداریہ میں جہاں انھوں نے تخلیق کے تعلّق سے اس کی مسلسل اشاعت کے عزم کا اظہار کیا ہے وہیں تخلیق کے معاونین کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ ساتھ ہی ادارتی تجربہ نہ ہونے کا ذکر بھی کیا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اظہر جاوید نمبر اور اس کے بعد کے عام شماروں کو دیکھ اور پڑھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ایڈیٹر اس میدان میں نووارد ہے بلکہ ہر ایک یہی کہنے پر مجبور ہوگا کہ اس رسالہ کا ایڈیٹر ایک تجربہ کار، سلیقہ شعار اور میدان ادب وصحافت کا شہ سوار ہے۔

مضامین کی فہرست میں غلام شبیر رانا، انور سدید اور راشد محمود چدھڑ کے اچھے اور معلوماتی مضامین موجود ہیں۔ بالخصوص دانشور نقاد جناب انور سدید کا مضمون ''ناول کا فن اور نقاد'' بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ ومفید ہے اگرچہ انھوں نے کچھ زیادہ ہی اختصار سے کام لیا ہے جبکہ موضوع تفصیل کا متقاضی تھا، اگر تھوڑی تفصیل سے کام لے لیتے تو ہم جیسے ادب کے طالب علموں کو مزید فائدہ پہنچتا۔

شاہین، ثمینہ سیّد، علیم صبا نویدی، علی عباس امید اور فوقیہ مشتاق کی نظموں اور نجم الحسن رضوی، عطیہ سیّد، بشریٰ اعجاز، سرور سکھیرا اور یٰسین احمد کے افسانوں سے رسالہ مزّین ہے۔ آپ بیتی کے تحت فرخندہ لودھی، عزیز میرٹھی، طارق محمود اور نذیر فتح پوری کی قسط وار آپ بیتیاں موجود ہیں

گوشۂ اظہر جاوید کے تحت کئی معلوماتی تحریریں موجود ہیں بالخصوص ڈاکٹر ابدال بیلا کی تحریر کا جواب نہیں، ایسی دلچسپ اور منفرد تحریر کہ اس کے اندر افسانہ کا حُسن اور اس کی دلچسپی موجود ہے۔ ایسے ہی ''تخلیق'' کے ''اظہر جاوید نمبر'' پر بالخصوص انور سدید کا تبصرہ، اس نمبر کا بھرپور تعارف پیش کرتا ہے۔ بقیہ مشمولات بھی لائقِ مطالعہ ہیں۔

(بشکریہ مدیر ''انتساب'' ڈاکٹر سیفی سرونجی۔ انڈیا)

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ محترمی سونان اظہر!

اس مرتبہ ''تخلیق'' نے خوشگوار حیرت سے دوچار کیا اور حیرت کا باعث وہ رنگین صفحات تھے جو آپ نے ''تخلیق'' کے آغاز اور اختتام پر لگائے ہیں۔ یہ صفحات ثابت کرتے ہیں کہ ''تخلیق'' اب مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے اور یہ اظہر جاوید کی یادگار کے طور پر لمبے عرصے تک جاری رہے گا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر جمیل آذر، امجد اسلام امجد، پروین عاطف، عطیہ سیّد، عذرا اصغر، ڈاکٹر ابدال بیلا، امین راحت چغتائی، شاہین، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر جمال نقوی اور طارق محمود صاحب اسی طرح تعاون کر رہے ہیں جس طرح وہ اظہر جاوید صاحب کے ساتھ کرتے تھے۔ البتہ ''تخلیق'' کے صوری حسن اور پیشکش کے انداز کو آپ نے سنوارا ہے۔ ''پہلی بات'' ظاہر کرتی کہ ادب کے جرثومے آپ کو اظہر جاوید سے ورثے میں ملے ہیں اور آپ کی ادبی تربیت فطرت نے کی ہے۔ ماشاءاللہ!

آپ نے گوشۂ اظہر جاوید اس پرچے میں شامل نہیں کیا لیکن اظہر جاوید کی خوشبو ہر ورق پر موجود ہے۔ اظہر جاوید نے ''تخلیق'' میں اپنی تحریریں چھاپنے پر خود پابندی عائد کی رکھی تھی۔ اب یہ پابندی قدرت نے توڑ دی ہے اور ہماری ملاقات اس اظہر جاوید سے ہونے لگی ہے جن کی شاعری اور افسانہ نگاری کا بنیادی تھیم (Theme) ''عشق'' تھا۔ اس پرچے میں وہ ایک اعلیٰ پائے کے خاکہ نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا پر ان کا خاکہ ان کی محبت اور خلوص کا بیّن ثبوت ہے۔ یہ خاکہ ذاتی مطالعے کی ایک خصوصی جہت ہے۔ جناب حنیف باوا نے اظہر جاوید کے ایک پنجابی افسانے کا اردو میں ترجمہ کر کے تخلیق نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ باوا صاحب ہمیں اظہر جاوید کے مزید افسانے بھی عطا کریں گے۔ اظہر جاوید کے ''خوابیدہ خطوط'' کا سلسلہ بھی خوب ہے اور یہ جاری رہنا چاہیے۔

ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کا ''تخلیق'' اور اظہر جاوید سے تعلق دیرینہ ہے۔ وہ رسائل میں بہت کم لکھتے ہیں، آپ نے ان سے اقبال کی ایک فارسی نظم پر مضمون لکھوا کر معرکہ سر کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اب خواجہ زکریا صاحب ''تخلیق'' میں مسلسل لکھتے رہیں گے۔ پروین عاطف، عطیہ سیّد اور عذرا اصغر کے افسانے نسائی احساس کی عمدہ نمائندگی کرتے ہیں۔ عذرا اصغر صاحبہ نے تو مرحوم رفیق حسین کی یاد تازہ کر دی جو جانوروں کی نفسیات پر افسانے لکھتے تھے۔ ڈاکٹر ابدال بیلا نے اپنی بین ممتاز مفتی کے انداز میں بجائی ہے۔ شفیع ہمدم اور خاقان ساجد کے افسانے معاشرے کو حقیقت نگاری سے دیکھتے اور ان کے مشاہدات افسانے کی بُنت میں شامل ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ اظہر جاوید صاحب کی طرح آپ نے بھی انشائیہ کا پرچم بلند کر رکھا ہے اور اس سلسلے میں آپ کو ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا تعاون حاصل ہے جو انشائیہ کے مزاج آشنا ہیں۔ میں نے ملک غلام نبی اعوان کا خاکہ ''اپنے ملک صاحب'' بڑی دلچسپی سے

پڑھا۔لطف کی بات یہ ہے کہ ملک مقبول صاحب کی قربت کے بغیر اعوان صاحب نے ایسا خوبصورت خاکہ لکھا کہ ملک مقبول احمد کے قریب رہنے والے بھی شاید نہ لکھ سکیں۔غلام نبی اعوان نے قلم کو اسی طرح متحرک رکھا تو وہ اپنی مرحومہ بیگم کا غم بھول جائیں گے۔اور ادب ان کی دوسری بیوی بن جائے گی جس سے ''نکاح'' کی قانونی ضرورت بھی نہیں۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی اور ڈاکٹر محسن مگھیانہ کے مضمون میں مزاح فطری انداز میں اُبھرا ہے۔اور لطیف مسکراہٹ بیدار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ایک بڑی تبدیلی یہ نظر آئی کہ آپ نے اس مرتبہ ''تخلیق'' میں ''حمد'' کو بھی شامل کیا ہے۔اس ضمن میں حفیظ انجم اور نسرین نکہت سبزواری کی تخلیقات میں انفرادیت نظر آئی۔میرے خیال میں پرچے کا آغاز ہی حمد و نعت سے ہونا چاہیے تھا۔

شاعری کے حصّے میں غزلوں کی کثرت ہے لیکن آپ کا انتخاب لاجواب ہے۔بہت سے اشعار دل میں اُتر گئے۔یہاں چند اشعار پیش کرنا شاید مناسب ہو۔

لہو بکھرا ہوا ہے روشنی کا تو کیا خنجر چلا ہے تیرگی کا
(نسیم سحر)

اُمڈے ہوئے خیال! ذرا اور ضبط کر طولِ شبِ فراق کا تو دیکھ دم ابھی
(سیّد ریاض حسین زیدی)

نہ اس سے خوش ہے اور نہ شاد ہفت افلاک وہ شخص خود پہ گراں ہے بہت بہ خاک انداز
(کرشن کمار طور)

وصل کہتے ہیں کسے تجھ کو بھلا کیا معلوم تری قسمت میں تو لکھا ہے گریزاں لمحہ
(رومانہ رومی)

منظر تمام آج تک آنکھوں پہ بوجھ ہیں جتنے بھی خواب ہیں مری پلکوں پہ بوجھ ہیں
(نجمہ شاہین کھوسہ)

مجموعی طور پر مجھے ''تخلیق'' نے مطالعے کی مسّرت کے بہت سے قیمتی لمحات عطا کیے اور شعرا کی تازگی نے سرشار کر دیا۔مضامین نے سوچ کو کروٹ دی، مزاح نگاروں نے مسکراہٹیں عطا کیا۔شکریہ! صد ہزار بار شکریہ! ایک ذاتی بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اظہر جاوید مجھے اکثر شب کی تنہائی میں ملتے ہیں اور ہم دونوں تادیر باتیں کرتے رہتے ہیں۔صبح اٹھتا ہوں تو اظہر جاوید کا سراپا یاد رہتا ہے۔ان کی سب باتیں بھول جاتی ہیں۔اتنا یاد رہتا ہے کہ وہ ''تخلیق'' کی نئی پیشکش پر بہت خوش ہیں۔''انجمنِ خیال'' کی صورت اب تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔آپ کی اپیل پر قلم کاروں نے ''تخلیق'' کے مندرجات پر اپنی تنقیدی رائے لکھنے کو فوقیت دی ہے۔اس پرچے میں سلیم آغا قزلباش، مرزا شبیر بھیروی، صائمہ نورین بخاری، نجیب عمر، نسیم سحر اور علی سفیان آفاقی کے خطوط میں تنقیدی روشنی کی کرنیں موجود ہیں۔ان میں ادبی مکالمے کو جاری رکھنے کا انداز بھی نظر آتا ہے اور حفظِ مراتب کا خیال بھی رکھا گیا ہے یعنی تنقید بڑی شائستگی سے کی گئی ہے۔ماشاءاللہ۔

''تخلیق'' کے ایک سابقہ پرچے میں ابنِ سلطان صاحب نے ممتاز شیریں کی تنقید پر ایک جامع مضمون لکھ کر اُردو کی اس پہلی نقاد خاتون کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔بعد میں یہی مضمون رسالہ ''ادبِ لطیف'' میں ڈاکٹر غلام شبّیر رانا کے نام سے شائع ہوا ہے۔کیا ''غلام ابنِ

سلطان''.....غلام شبیر رانا کا دوسرا قلمی نام ہے''؟ رانا صاحب اردو کے معروف نقاد ہیں، انہیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ ایک اور فرضی نام اختیار کریں؟ اب تو شک ہوتا ہے کہ غلام ابنِ سلطان کا وجود ہی نہیں ہے؟ رانا غلام شبیر صاحب وضاحت فرما دیں تو ان کا ممنون ہوں گا۔ اس قسم کی ایک حرکت ڈاکٹر معین الرحمان نے اپنی زندگی میں کی تھی۔ اپنی ایک طالبہ کو اس کے ایم اے کے تحقیقی مقالے کا ایک باب لکھ کر دیا۔ اور پھر یہ باب اپنے نام سے ''نقوش'' میں چھپوا دیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر صدیق جاوید نے اس کا کڑا نوٹس لیا۔ ڈاکٹر معین الرحمان اس تنقید کا سامنا نہ کر سکے اور دنیا سے ہی پردہ کر گئے۔ اب یہ واقعہ تاریخ کا حصّہ بن چکا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

.....

﴿2﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا شمارہ نمبر 6 (جون 2013ء) نظر نواز ہوا۔ میں یہ خط آپ کے متعین کردہ اس اصول کے تحت لکھ رہا ہوں کہ

''صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ رسالے کی سب نظمیں، غزلیں، افسانے معیاری اور اعلیٰ پائے کے ہیں بلکہ یہ واضح ہونا چاہیے کہ آپ کو کوئی فن پارہ کیوں پسند آیا ہے اور اس ادب پارے کے محاسن و معائب کیا ہیں؟''

پہلی بات یہ کہ مجھے خطوط نویسی کا مذکورہ ضابطہ بہت پسند آیا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کس نے پرچہ پڑھ کر خط لکھا ہے اور کس نے محض حاضری لگانے کی خاطر۔ ''وفیات'' میں آئندہ ماہ ریاض الرحمٰن ساغر اور قنبر علی عباسی کو بھی شامل کر لیجیے۔ موخر الذکر تقریباً تین درجن کتابوں کے مصنّف تھے جن میں دو درجن سفرنامے شامل تھے۔ انتقال 31 مئی کو البنی (امریکہ) میں ہوا۔

''اقبال سے شناسائی'' (ڈاکٹر انور سدید) عمدہ مضمون ہے۔ مصنّف نے حضرت علاّمہ سے اپنی ذاتی اور دیگر اہل خاندان کی وابستگی کے حوالے سے چند دلچسپ واقعات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ یہ پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کے کتب خانے میں ''اقبالیات'' کے موضوع پر چار سو سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ ''پیار کا امرت رس'' کے عنوان سے اپنے تاثراتی مضمون میں پروفیسر جمیل آذر نے مرحوم اظہر جاوید کے مجموعۂ کلام ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' کے مختلف پہلوؤں کو بڑی عمدگی کے ساتھ اُجاگر کیا ہے اور برمحل اشعار بطور حوالہ استعمال کیے ہیں۔ ضمناً عرض ہے کہ صحیح لفظ ''آزر'' ہے ('ز' کے ساتھ) جو قرآن حکیم کی سورۂ انعام کی آیت نمبر 75 میں آیا ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تھا۔ ''آذر'' ('ذ' کے ساتھ) فارسی کا لفظ ہے اور اس کے معنی آگ کے ہیں۔ یہ ایرانی شمسی سال کے نویں مہینے کو بھی کہتے ہیں۔ (حوالے کے لیے دیکھیے ''فرہنگ جامع''، صفحہ نمبر 9، ناشر، سفارت خانہ اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد)۔ اگر ''آذر'' کمپوزنگ کی غلطی ہے تو اس کی تصحیح ضروری ہے لیکن اگر مصنّف اپنا نام اسی طرح لکھتے ہیں تو ہمارے لیے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔

افسانوں میں ''بین بجاؤ'' (ڈاکٹر ابدال بیلا) خوب ہے۔ اس کے کلائمکس کا جواب نہیں۔ ''وقت تتلی تھا'' (عذرا اصغر) شروع میں تو کچھ پلّے نہ پڑا لیکن پھر اس کی تہیں کھلتی گئیں، تو مزہ آ گیا۔ میرے نزدیک اس شمارے کا بہترین افسانہ ''نیل کی واپسی'' (نجیب عمر) ہے جس میں اسلامی تاریخ کے ایک واقعے کے گرد کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ تاہم ''دریائے نیل کے نام'' حضرت عمرؓ کے خط کا مکمل اور مستند متن یوں تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! اللہ کے بندے، مومنوں کے سردار عمر کی طرف سے مصر کے (دریائے) نیل کے

نام۔کائنات کی ہر شے اللہ کی مرضی کے تابع ہے۔تیری سطح کی بلندی بھی اللہ کی رضا کے مطابق ہے اور ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ وہ تجھے اپنی سطح بلند کرنے کا حکم دے۔''

سیّد مشکور حسین یاد کا انشائیہ ''رکوع میں جانے کی ادا'' فکر کی گہرائی سے مملو ہے جبکہ ''بادل'' (سلیم آغا قزلباش) بھی ایک تیکھی تحریر ہے۔''اپنے ملک صاحب'' (غلام نبی اعوان نے) ایک اچھا خاکہ ہے لیکن اس میں ایک شعر کا حلیہ بگڑا ہوا ہے۔مذکورہ شعر میرؔ کا ہے اور درست حالت میں اس طرح ہے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے　　اس کی زُلفوں کے سب اسیر ہوئے

عزیز میرٹھی صاحب فلمی دنیا کی خوب سیر کراتے ہیں۔اس بار انہوں نے پروڈکشن اور ڈائریکشن کے بعض سربستہ راز فاش کیے ہیں۔''سنگریزے'' میں غلام الثقلین نقوی صاحب کی 12 مارچ 1996ء کی ڈائری کا ورق بہت دل گداز ہے۔اتنے اعلیٰ معیار اور ٹھوس مواد کے حامل پرچے میں مجھے اپنا مضمون ''جشنِ آزادی'' مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا۔اشاعت کے لیے ممنون ہوں۔

آپ کی ''پہلی بات'' کے مقابلے میں اب میری آخری بات۔مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ پہلا ''تخلیق ایوارڈ'' ڈاکٹر انور سدید اور جناب شفیع عقیل کو دیا گیا۔اس سلسلے میں شفیع عقیل صاحب کا خط ان کی بڑائی پر دلالت کرتا ہے۔ایک ایسے دور میں جب لوگ اپنی ڈگریوں کے بار تلے خود دبے چلے جا رہے ہیں،موصوف کا یہ اعتراف لائقِ صد تحسین ہے کہ ''میں نے تو اسکول کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔صرف محلے کی مسجد میں قرآن ناظرہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔''

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی)

.....

﴿3﴾ برادرم سونان!

تازہ ''تخلیق'' پر چٹھی ملی،شرمندہ ہوں کہ میں ''تخلیق'' کے لئے کچھ پیش نہ کر سکا۔آپ کو علم نہ ہوگا کہ چند ماہ پہلے فالج کا حملہ ہوا،بس بچ گیا ورنہ آثار اچھے نہ تھے۔اس سلسلہ میں فزیوتھراپی اور سپیچ تھراپی ہنوز جاری ہیں اور قدرے افاقہ بھی ہے مگر لکھنے کے قابل نہیں ہوں۔یہ جو خوش خطی آپ دیکھ رہے ہیں اسی باعث ہے۔

گذشتہ برس پارکنسن (Parkinson) کی وجہ سے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تو لکھنا محال ہو گیا۔آپ کو یاد ہوگا جب آپ نے اظہر جاوید نمبر کے لئے مضمون لکھنے کو کہا تھا تو میں نے رعشہ کی بنا پر معذرت کی تھی۔اس پر آپ نے کہا تھا کہ میں ڈکٹیشن دے دوں۔چنانچہ آپ کے دفتر کی ایک لڑکی نے فون پر ڈکٹیشن لی تھی۔ابھی Parkinson سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ فالج نے دبوچ لیا اور حال یہ ہے :

گیا ہو جب اپنا جیوڑا نکل　　کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور)

.....

﴿4﴾ عزیز گرامی سونان اظہر جاوید جی!

ماہنامہ ''تخلیق'' کا جون کا شمارہ ملا تو دل خوش ہو گیا۔.....گویا آپ نے اپنے عظیم والد اظہر جاوید کی جلائی ہوئی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔دوسرے اسکا معیار بھی برقرار رکھا ہے۔

4 مضامین، 11 نظمیں، 20 خوبصورت افسانے، انشائیہ، خاکے، یادیں، حصہ شاعری میں (میرے سوا) ممتاز شاعروں کی غزلیں، طارق محمود کی خوبصورت آپ بیتی، غلام الثقلین نقوی کی ڈائری، ڈاکٹر معین قریشی اور ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا طنز و مزاح، خوابیدہ خطوط، جائزے، پنجاب رنگ، دلچسپ انجمن خیال.....غرض کیا نہیں ہے اس میں.....آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں۔ مرشد آپ کو سلامت رکھے اور پرچہ جاری رکھنے کی توفیق دے۔

(جناب انوار فیروز کا آخری خط ہے ''تخلیق'' کے نام.....اللہ مرحوم کی مغفرت کرے۔) **انوار فیروز (راولپنڈی)**

.....

﴿5﴾ عزیزی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' جون 2013ء کے ساتھ آپ نے جس انداز خلوص و یگانگت میں ''تخلیق'' سے دوری کی وجہ پوچھی، پڑھ کر بے ساختہ اپنے مرحوم بھائی اور کرم فرما اظہر جاوید کی محبتوں کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ آپ نے اظہر جاوید کے پرخلوص سلسلوں کو زیرِ نظر شمارے میں مشمولہ کئی تحریروں سے بخوبی جاری رکھا ہے۔ ''تخلیق'' سے اور آپ سے میری دوری کی وجہ میرے یکے بعد دیگرے عوارض قلب و چشم میں مبتلا رہنے اور دائیں آنکھ کی بینائی زائل ہو جانے کی وجہ ہے۔ سارا نظام اتھل پتھل اور تمام رواں دواں سلسلے معطل ہو کر رہ گئے ہیں۔ تاہم چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے کے مصداق قرطاس و قلم کے مشاغل نے اور ترسیل و ابلاغ کے رواں دواں سلسلوں نے شعر و ادب سے وابستگی برقرار رکھی ہے۔ البتہ ''تخلیق'' کو زندہ و پائندہ رکھنے کا عزم محترم مرحوم اظہر جاوید کے فیضِ رواں کے سلسلوں کو قیام و دوام عطا کرنے اور ان کے لیے ثوابِ جاریہ کے سرچشمے رواں دواں رکھنے کے مترادف ہے۔ اللہ آپ کے اس جذبے کو ثبات، حوصلوں کو توانائی اور وسائل کو فراوانی عطا فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر محبوب راہی (انڈیا) .....

﴿6﴾ عزیز گرامی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کے صفحۂ اوّل پر سرخ روشنائی سے مختصر تحریر میں آپ نے مجھے اور ''تخلیق'' کو لازم و ملزوم قرار دے کر اپنی محبت کا اظہار کیا لیکن مجھے شرمسار کیا، من آنم کہ من دانم۔ آپ نے ''دوستوں کے دوست اظہر جاوید کے خطوط—— معاصرین کے نام'' کا سلسلہ آغاز کیا، عہد ماضی کو عہد حال میں لا کھڑا کیا، اظہر جاوید کا قلم محبت کی روشنائی سے مستنیر ہے، کرنل خاقان ساجد ہوں، ڈاکٹر انور محمود خالد ہوں، نارنگ ساقی جی ہوں یا ہمارے آپ کے مہربان ڈاکٹر انور سدید، وہ خط کہاں لکھتے تھے، باتیں کرتے تھے، بے تکلفی، مکالمہ اور خوش طبعی کوئی اظہر جاوید سے سیکھے! وہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

آپ بھی کچھ کم نہیں، ''تخلیق'' کو نئی زندگی، نئی آن بان اور رکھ رکھاؤ بلکہ سجاؤ نا کے ساتھ ترتیب دینا اور ترتیب میں حُسن ترتیب کا لحاظ رکھنا کارے دارد کا حکم رکھتا ہے، ''پہلی بات'' میں حتمی بات کہہ دینا کہ ''دم ہے تو تخلیق پیہم رہے گا'' واہ یہ عزمِ مصمّم اور یہ تیور—— یقیناً اظہر کا مظہر سونان جو تخلیق پر سو جان سے قربان! میں اوروں کی طرح ایک نشست میں پورا جریدہ پڑھنے کے حق میں نہیں بلکہ ہر صنفِ ادب سے نمائندہ تحریر کا مطالعہ کرتا اور لطف اٹھاتا ہوں، مثلاً علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم از ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور اقبال سے شناسائی از ڈاکٹر انور

سدید، منظومات میں ''وہ ایک بات'' اور ''ایسے میں کوئی کیا کرے'' از امجد اسلام امجد نیز اعزاز احمد آذر کے ماہیے، عطیہ سیّد کا افسانہ جنازہ، امین راحت چغتائی، مشکور حسین یاد، آصف ثاقب، کرشن کمار طور، ایم زیڈ کنول اور میثم علی آغا کی غزل، ''اپنے ملک صاحب'' غلام نبی اعوان کا خاکہ، خورشید بیگ میلسوی کا تبصرہ، امکان در امکان پسند آئے۔

حسن عسکری کاظمی (لاہور)

.....

﴿7﴾ محترم جناب سونان اظہر جاوید جی!

آپ اظہر جاوید صاحب کے ادبی اثاثے کی حفاظت تو کر ہی رہے ہیں لیکن یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ عمرے کی سعادت حاصل کی (بہت بہت مبارک ہو) بلکہ آپ نے حرمین شریفین میں ماہنامہ ''تخلیق'' کے لکھاریوں (بشمول اس ناچیز کے) کے لیے بھی دعا کی۔ یہ آپ کا ادب اور ادیبوں، شاعروں سے محبت کا واضح ثبوت ہے۔ آپ نے تحقیق، شاعری، افسانے اور دوسری جہتوں میں جہاں ماہنامہ ''تخلیق'' کے معیار کو قائم رکھا ہے وہاں وہ خوش اسلوبی سے اس کی اشاعت کی ذمہ داری بھی نبھا رہے ہیں۔ انشاء اللہ! ہم بھی آپ کے اس کارِ خیر میں ہم سفر رہیں گے۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

.....

﴿8﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ (جون 2013ء) نظر نواز ہوا۔ اب کی بار ''تخلیق'' کی پیشانی پر بنا ہوا پھول اور سرورق کا عمدہ ڈیزائن ماضی کے ''تخلیق'' کی یاد تازہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور انور سدید کے مضامین اقبالیاتی تفہیم میں اپنا اپنا حصہ ضرور ڈالتے ہیں۔ پروفیسر جمیل آذر نے چمنستانِ محبت میں خوشیوں کا رس گھولنے والے، چاہتوں کے اسیر اور ''تخلیق'' کے خالق کو جذبات کی لڑی میں پرو کے لفظوں کے خوب صورت ہار ڈالے ہیں۔

اظہر جاوید کی سرگودھا سے محبت بھی نمایاں ہے اور رہے گی۔ انھوں نے وزیر آغا کا خاکہ دل کے قلم سے لکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آغا صاحب پورے پاکستان کی ادبی شناخت ہیں لیکن سرگودھا ان کی جنم بھومی ہے اور بے حد اہم ہے۔ اظہر جاوید نے بڑے عام فہم اسلوب میں جامعیت سے وزیر آغا کی شخصیت کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ سیّد مشکور حسین یاد اور ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے انشائیے کی صنف کے ساتھ اپنے تعلق کو نبھایا ہے۔ یہ انشائیے انشائی ادب میں نمایاں رہیں گے۔ سلیم آغا قزلباش نے ''بادل'' کے بہروپ کو جدید تناظر میں ملانے کی کوشش کی ہے۔ غلام الثقلین نقوی کے ''سنگریزے اور جواہر'' کے عنوان سے چند اقتباس قابلِ داد ہیں۔ انور سدید کا کتب مینار ''تخلیق'' میں بھی روشن نظر آتا ہے۔ ''تخلیق'' میں سجی خطوط کی انجمن ''تخلیق'' کی ادبی رونق میں اضافے کا سبب بن چکی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں مرزا شبیر احمد بھیروی کے تاثرات ''تخلیق'' کے ساتھ دلی محبت کا ثبوت بھی ہے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم باپ (اظہر جاوید) کے فطین بیٹے (سونان اظہر جاوید) کو مزید ادبی استقامت عطا فرمائے۔ (آمین)

سکندر حیات میکن (شاہ پور)

.....

﴿9﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ پڑھ لیا۔ رسالہ کی اُٹھان اور انداز وہی ہے جو مرحوم اظہر جاوید کے وقت ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اظہر جاوید آج بھی زندہ ہے اور رسالہ کو خود ایڈٹ کر رہا ہے۔ تھوڑا سا فرق آ گیا ہے، اُسے دور کیجیے۔ یعنی سہ ماہی نہیں دو ماہی ہی رکھیے تا کہ روایت قائم رہے۔ اظہر جاوید کی یاد میں آپ نے ''تخلیق'' ایوارڈ جاری کر کے اظہر جاوید کو زندہ وجاوید کر دیا ہے۔ فرمانبردار قسم کے بیٹے ایسا ہی کرتے ہیں۔ سونان زندہ باد! علامہ اقبالؒ کے بارے میں اچھے مضامین پڑھنے کو ملے۔ بہتر ہوگا اگر آپ ہر شمارے میں علاّمہ اقبالؒ کے لیے ایک گوشہ مقرر کر دیں۔ ہر دفعہ تین چار مضامین دے دیا کریں گوشہ ہو جایا کرے گا۔

نظموں میں انور سدید کی نظم دریوزہ گر، اعزاز احمد آذر کے ماہیے، فوقیہ مشتاق کی نظم ''اُس گھڑی کی ٹوٹی کھڑکی سے'' اچھی لگی۔ افسانوں میں ڈاکٹر ابدال بیلا کا افسانہ ''بین بجاؤ''، عطیہ سیّد کا ''جنازہ''، خاقان ساجد کا ''تہِ سنگ'' اور محمد عباس ثاقب کا افسانہ ''مستحق'' اچھے لگے۔ ابدال بیلا کے افسانے کو پہلا نمبر اس لیے ملا کہ اُس میں ابدال بیلا نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر گرو چیلے کو لوٹنے کے گُر سکھاتا ہے تو دُنیا والے بھی گرو سے کم نہیں۔ غزلوں میں آصف ثاقب، امین راحت چغتائی، انور سدید، انوار فیروز اور طفیل عامر کی غزلیں اچھی لگیں۔ سلیم آغا قزلباش کا انشائیہ ''بادل'' واقعی پڑھنے کے قابل ہے۔ ایک جملہ ہی تمام انشائیہ پر حاوی ہے۔ ''جو بادل گرجتے ہیں وہ برستے نہیں لیکن کیا پتہ وہ کس وقت گرجنا بند کر دیں اور برسنا شروع ہو جائیں۔''

ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں اظہر جاوید کا لکھا ہوا خاکہ بڑا جذباتی اور معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے جناب اظہر جاوید کے نام پر از معلومات خطوط لکھے ہیں اور اظہر جاوید نے بھی بعض احباب کو اچھے مکتوب لکھے ہیں۔ خیال کی دُنیا بھی خوب آباد ہے۔ مجموعی لحاظ سے آپ ''تخلیق'' پیش کرنے میں خاصے کامیاب ہیں۔ اللہ کرے یہ سلسلہ جاری ہے۔ آمین!

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

.....

﴿10﴾ عزیزم سونان اظہر!

جون 2013ء کا شمارہ مجھے مل گیا۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ تمھاری سوچ اور لگن اظہر جاوید کے جس مشن کو جاری رکھنا چاہتی تھی، وہ مجھے مکمل ہوتا نظر آ رہا ہے۔ میں ڈاکٹر انور سدید نہیں ہوں کہ کئی صفحات لکھ دوں۔ یہ قابلیت میرے حصہ میں نہیں۔ صرف آپ کو ان کاوشوں اور محنت پر دلی مبارک باد پیش کر سکتا ہوں۔

اکرام تبسّم (لاہور)

.....

﴿11﴾ محترم سونان اظہر!

''تخلیق'' کا شمارہ 6 جون 2013ء باصرہ نواز ہوا۔ حسبِ روایت ''تخلیق'' کی وہی سج دھج دیکھ کر جو اظہر بھائی کے زمانے میں تھی دل باغ باغ ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اظہر جاوید کی رُوح کی تسکین کا سامان بہم کیا ہے۔ میں اظہر جاوید کے لئے کہوں گا ''ع فخر ہوتا ہے قبیلے کا سدا ایک ہی شخص'' وہ یقیناً اظہر جاوید تھے اور ان کے خالقِ حقیقی کے پاس جانے کے بعد ان کی ''ادب انگیزی'' کو تخلیق کے Catalyst سے سونان نے ایک واضح اور دوٹوک مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ادب سے وابستہ افراد، تخلیق کار اور ان کے چاہنے

اور پڑھنے والے سب کا اکٹھ موجود ہے۔ یہی مشن تھا اظہر جاوید کا جواب سونان نے بیڑہ اٹھایا ہے۔

تازہ شمارے میں اقبال کے حوالے سے اقبال شناس ناقدین کے مضامین سب سے زیادہ مسرت انگیز بلکہ نشاط انگیز رہے۔ اقبال ایک تو ہر عہد کے شاعر ہیں دوسرے ان کی فکری چھاؤں میں ہر نا امید بیٹھ کر اُمید کی دولت حاصل کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا مضمون ''علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم'' مفہوم کے لحاظ سے قیمتی ہے جبکہ اقبال شناسی کے لئے ڈاکٹر انور سدید جیسی بڑی شخصیت کا اظہاریہ ذاتی تجربے کے حوالے سے ہر اس شخص کے لئے ہے جو دبستانِ اقبال کا اب بھی خود کو طالب علم گردانتا ہے۔ اس مضمون میں ابن ارشاد عارف کا واقعہ بڑا دل کشا ہے جبکہ ''اقبال کا فلسفہ خودی اور فکر حاضر'' میں صائمہ نورین بخاری نے عالمی شخصیات کے حوالے سے خودی کو زیرِ بحث لا کر جہاں یہ تاثر بڑی کامیابی سے دیا ہے کہ اقبال رومی کی فکر سے کس قدر متاثر تھے۔ وہاں خودی کے مفہوم تک بھی قاری کو رسائی دی ہے۔ اعزاز احمد آذر کے ''ماہیے'' ہوں یا فوقیہ مشتاق کی ''اس گھر کی ٹوٹی کھڑکی سے'' عفی آفرینی کی رومانویت ارتقائے نظم کے باب کو کشاد کرتی ہے۔ عطیہ سیّد، عذرا اصغر، اظہر جاوید کے افسانے خوب تھے جو گہرے مشاہدے اور پختگی فن کی خوبیوں سے مالا مال تھے۔ غزلوں میں سیّد مشکور حسین یاد، انور سدید، محمود شام، انوار فیروز، سیّد ریاض حسین زیدی نے پہلے جبکہ کرشن کمار طور، عمرانہ مشتاق، نجمہ شاہین کھوسہ نے تازہ کاری کے اگلے لمحے پر تخلیقی شعور دو چند کیا اور فہم و فراست کے باب کشاد کئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں اظہر جاوید مرحوم کا خاکہ بار بار پڑھا اور ہر بار لطف اندوز ہوا۔ پنجاب رنگ میں حنیف باوا، انوار فیروز اور شگفتہ نازلی کی تحریری پختگی فن اور معنویت کی گہرائی کی عکاس تھیں۔ کچھ منتخب اشعار جو دل کو چھو کر گزرے:

تو جانتا ہے میں واپس پلٹ نہیں سکتا　　اے عشق مجھ کو تو بے کار کھینچتا کیوں ہے
(میثم علی آغا)

میرے کاندھے پر ہے جگنو کی ردا　　ظلمتوں کو یہ بتا آئی ہوں میں
(ایم زیڈ کنول)

ہم اپنے سینے پہ تمغے سجا کے نکلیں گے　　تمھارے نیزہ و خنجر ہمیں بلاتے ہیں
(آصف ثاقب)

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ان تمام اراکینِ ''تخلیق'' کو جو اس کی تزئین، تدوین اور تخلیقات سے منتخب کلام کو زیبِ تخلیق کرنے میں مصروفِ عمل ہیں کامیاب و کامران کرے اور ان کی ادبی خدمات کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

خورشید بیگ میلسوی (میلسی)

.....

﴿12﴾ عزیزی سونان اظہر جاوید!

اس بار ''تخلیق'' کا سرورق بڑا خیال انگیز اور سادگی و پرکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ جانِ عزیز! اب یہ دُکھ دل کا داغ بن کر رہ گیا ہے کہ مرحوم اظہر جاوید سا شجر سایہ دار مجھے بہت دیر سے ملا اور بہت جلد بچھڑ گیا۔ ہائے.....اتنی جلدی تو چمن سے بہار بھی رخصت نہیں ہوتی۔

آپ کی یہ شرط کڑی ہے کہ بے جا تعریف و توصیف کی بجائے ''تخلیق'' کے مندرجات پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار

فرمائیں۔ بوڑھا طوطا اتنا علم کہاں سے لائے؟ پھر خاکسار نہ نقاد نہ تبصرہ نگار، بھائی جس کا کام اُسی کو ساجھے۔ اللہ آپ کو خوش وخرم رکھے اور بس اللہ کافی باقی ہوس!

عزیز میرٹھی (لاہور)

.....

﴿13﴾ مکرمی سونان اظہر جاوید!

آپ کی عنایت ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ جون 2013ء میرے ہاتھوں میں ہے۔ صائمہ نورین بخاری کا مقالہ ''اقبال کا فلسفۂ خودی اور فکرِ حاضر'' گرچہ مختصر ہے لیکن شاعرِ مشرق کو سمجھنے میں ممد ومعاون ہے، بقول اقبالؔ:

''اسلام چاہتا ہے کہ ہر انساں کی خودی نہ صرف قائم رہے بلکہ ارتقائی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جو اس کے لیے مقدر ہے اور جس سے بڑا کوئی مقام انسانی تصور میں نہیں آ سکتا۔''

مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران، ہندستان سے آئے ایک بزرگ دینی عالم سے ملاقات ہوئی، یہ جان کر کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ یوں گرویدہ ہوئے ''آپ خوش قسمت ہیں کہ اقبالؔ آپ کو حاصل ہے، جس نے ساری اُمتِ اسلامیہ کے اقبال کو بلند کرنے میں اپنی زندگی کھپا دی۔'' مختصر سی نشست میں انھوں نے اقبال کے بے شمار اشعار سنائے۔'' پروفیسر جمیل آذر نے ''پیار کا امرت رس'' میں اظہر جاوید کی شاعری کے اس نمایاں رنگ کو خوب اُجاگر کیا جسے پیار، محبت، مودّت، انسیت اور اُلفت کہتے ہیں۔ حسن پرستی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو گی: ''اللہ جمیل ویحب جمال'' امجد اسلام امجد کی مختصر سی آزاد نظم ''ایسے میں کوئی کیا کرے'' وارداتِ قلبی کا بھرپور اظہار، سلاست بیانی اپنے عروج پر اور آخری سطر ''بجلی کی طرح کوندے اور سن سے گزر جائے'' کا جواب نہیں۔ ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد کی روایت کو برقرار رکھنے والا افسانہ نگار، ابدال بیلا، ماضی سے اپنے رشتے کو مضبوطی سے تھامے، مستقبل کی راہ دکھانے میں مصروف۔ ان کا افسانہ ''بین بجاؤ'' سانپ چھوڑ کر سانپ پکڑنے والے سپیرے سے جنگل کا اصلی زہریلا سانپ پکڑوانے کی جستجو میں یہ قوم لگی ہوئی اور مسائل حل کرنا چاہتی ہے انجام تو سمجھ لینا چاہیے۔

پروین عاطف کا ''فرار'' مصنوعی زندگی اور بناوٹ والے پیار کا رنگ ایک روز اُتر ہی جاتا ہے۔ پھر سوائے فرار کے کوئی راستہ نہیں رہتا۔ کسی گیانی نے کہا ''پرماتما، سچے سکھ نہیں دیتا نہ دے، دکھ تو سچے دے۔'' عطیہ سیّد کا افسانہ ''جنازہ'' زندگی کے لیے موت سے زیادہ عبرت کا سامان اور کہاں ہو سکتا ہے لیکن اس مشینی اور مصنوعی زندگی پر تُف کہ اب کسی کی موت بھی ہمیں دنیا سے بیزار نہیں کرتی۔ اس حادثے کو بھی ہم مصلحت کی عینک لگائے دیکھتے ہیں۔ عذرا اصغر کا ''وقت تتلی تھا'' اس افسانے کا سارا حسن اس کے ٹریٹمنٹ میں ہے جسے مصنفہ نے خوب نبھایا ہے: O جانوروں سے محبت عین عبادت ہے O جو جانور کو بھی بھوکا نہ دیکھ سکے، یہ تقویٰ ہے کچھ ایسی ہی کیفیتوں سے گزر کر عذرا نے یہ افسانہ بُنا ہے۔ اس کا شمار ان کے خوبصورت افسانوں میں ہوگا۔

بچوں سے محبت انسان کی فطرت ہے۔ نہ جانے لوگ کیسے اپنی فطرت کو بگاڑ لیتے ہیں۔ اس کا احساس انہیں کبھی نہ کبھی ضرور ہوتا ہے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ خاقان ساجد کا افسانہ ''تہہ سنگ'' ایک معصوم کی داستان جو کسی بلّے کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں بیٹے کا جنازہ باپ کے کاندھے پر بہت بھاری ہوتا ہے اور باپ معذور بھی ہو تو اس حادثے کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن ڈاکٹر

زین السالکین سالک نے افسانہ ''میرا کنبہ'' میں کردار کے دُکھوں کا بیان تو خوب کیا لیکن افسانے کی بُنت میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ شفیع ہمدم کا ''خوف کے سائے'' احتیاط بڑی اچھی چیز ہے لیکن غیر ضروری احتیاط زندگی کو مشکل بنا دیتی ہے۔ لیکن ایسا کوئی جان بوجھ کر نہیں کرتا بلکہ یہ اسکی فطرت بن جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ احوال شفیع صاحب نے عدیل کا پیش کیا ہے جو اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا۔ محمد عباس ثاقب کا افسانہ ''مستحق''۔ یہ میں کہیں اور بھی پڑھ چکا ہوں۔ دوسروں کے دُکھ بانٹنے والا اپنے دُکھ سے کسی حد تک غافل ہوسکتا ہے۔ بس کسی حد تک۔ انسان بڑا کمزور واقع ہوا ہے ایک لمحے میں ٹوٹ سکتا ہے۔ اظہر جاوید کا افسانہ ''گھر، کون سا گھر'' حنیف باوا کی توسط سے ہمیں ترجمہ پڑھنے کو ملا اور بے ساختہ افتخار عارف کا یہ شعر زبان پر آ گیا ؎

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے　　جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

نجیب عمر (کراچی)

.....

﴿14﴾ سونان اظہر جاوید!

اے گُل بہ تُو خُورسندم، تُو بوئے کسے داری! تازہ شمارہ ''تخلیق'' کا انتظار کی گھڑیاں گھٹا گیا۔ ملا تو رسید دینے میں تساہل ہوتا رہا۔ 21/جون (بڑے دن) کے موقع پر وقت زیادہ مل رہا ہے تو حاضر ہوں! آپ نے رسالے پر ہی چند جملے لکھ دیئے ہیں۔ یہ کفایت شعاری کی اچھی رَوش ہے۔ مَیں نے کبھی نہیں کہا ''تفصیلی طور پر لکھوں گا اور کان کھینچوں گا'' : ''یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے''

آپ میرے محبِّ عزیز، اپنے والدِ گرامی کے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بڑی بات ہے۔ اوّل اوّل کے حالات و واقعات سے قطعِ نظر بالآخر آپ سعادت مندی کے معیار کو بلند کر رہے ہیں کہ: ''نامص نیک رفتگاں ضائع مَسکن''

ناصر زیدی (لاہور)

.....

﴿15﴾ سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا نیا شمارہ ملا۔ شکریہ اور میری طرف سے مبارک باد۔ آپ نے بہت کم وقت میں ''تخلیق'' کو ہر اعتبار سے بہت خوبصورت اور قابلِ قدر رسالہ بنا دیا ہے جس کی آپ سے اُمید بھی تھی۔ اپنی خودنوشت ''بیتے کل کا پَل''..... میں کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا انتساب ''اظہر جاوید کے نام'' ہی ہوگا۔ اظہر جاوید اگر اس آپ بیتی کے ابواب کی اشاعت کا وعدہ نہ کرتے تو مجھ سے اتنا کچھ اتنے اچھے انداز میں لکھا نہ جاتا۔ خدا کرے آپ سب اچھے ہوں۔

نذیر فتح پوری (مدیر ''اسباق''۔ پونے۔ انڈیا)

.....

﴿16﴾ محترمی!

جون 2013ء کا ''تخلیق'' مل گیا ہے۔ سرورق کو دیکھتے ہی اس میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ آپ نے کسی حد تک لکھنے والوں کو کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر پیش کرنے پر راغب کر لیا ہے۔ اس طرح کافی لکھنے والوں کو شمارہ میں چھپنے کا موقعہ فراہم ہو رہا ہے۔ سیّد مشکور حسین یاد صاحب کا انشائیہ بہت پسند آیا۔ سلیم آغا قزلباش نے بھی کیا خوب بارش کے قطرے برسائے ہیں۔ ایک طرف سیّد صاحب نے

رکوع کوانسان کے لئے قدرت کا عطیہ قرار دیا ہے تو دوسری طرف سلیم آغا جی نے بادل کی متلون مزاجی کو موسمیاتی اداروں کی بے بسی بنا دیا ہے۔ حنیف باوا نے اظہر جاوید کا افسانہ ''گھر۔ کونسا گھر'' کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ اظہر پیارے دوستوں، خوبصورت بیوی اور بچوں کے باوجود بھی اپنی تنہائی میں قید رہے۔ خدا جانے وہ ان سب میں رہ کر بھی ان میں کیوں گھل مل نہ سکا۔ یہی اُس کی زندگی کا المیہ تھا۔ نورزمان ناوک کے دوہے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا خوب بات ہے کہ گندم کے چسکارے نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ یہ جس کے منہ لگی ہے وہ اس سے علیحدگی اختیار نہیں کر سکا۔ ڈاکٹر ابدال بیلا نے کیا مزے کی بات کہی ہے۔ ''بین بجاتے رہو، آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔ ایسا نہ ہو کہ زیادہ بوجھ اکٹھا ہو جائے اور ہم کوئی کام بھی نہ کر سکیں۔''

آفتاب راجا (جوہر آباد) .....

﴿17﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

جون 2013ء کا ''تخلیق'' خوبصورت سرِ ورق اور معیاری ادبی معیار پر مبنی رسالہ موصول ہوا۔ رسالہ کے اندر ایک جگہ یہ نوٹ بھی نظروں سے گذرا کہ قارئین تعریفی خطوط کی بجائے تنقیدی خطوط ارسال کیا کریں۔ یہ نوٹ آپ کی کشادہ دلی کا ثبوت ہے ورنہ کچھ مدیر حضرات فرمائشی تعریفی خطوط خود لکھوا کر اپنے رسائل میں چھاپتے ہیں۔ بہرحال آپ کے اِس نوٹ سے میرا حوصلہ بڑھا ہے اور اب کچھ عرض کرنے لگا ہوں کہ ''تخلیق'' رسالہ پچھلے کئی برسوں سے یکسانیت کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ مخصوص نام جو برسوں سے جس ترتیب سے چھپتے تھے وہ ترتیبی روایت اب تک قائم و دائم ہے۔ سینئر بزرگ تخلیق کار ابھی تک آپ کے ساتھ تعاون کر رہے، یہ اُن کا آپ پر اور رسالے پر احسانِ عظیم ہے لیکن نئے لکھنے والوں کو بھی ''تخلیق'' میں جگہ ملنی چاہیے اُن کا ایک الگ حصہ بنایا جا سکتا ہے تاکہ کچھ تازگی کا بھی احساس ہو۔ یکسانیت بعض اوقات اکتاہٹ بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اس موسمِ تخلیق کے جمود کو توڑنے کی ضرورت ہے۔

اسلم سحاب ہاشمی (ساہیوال) .....

﴿18﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

تازہ ''تخلیق'' موصول ہوا جو میں نے از اوّل تا آخر بصد شوق پڑھا۔ زیادہ تر سلسلے پرانے ہیں ہر چند کہ آپ پرچے کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ نامی گرامی شعرا اور تخلیق کاروں کا تعاون آپ کو حاصل ہے۔ اس لیے آپ ثروت مند ہیں۔ تصویر کا دوسرا رُخ البتہ بھیانک ہے۔ (پرچے کا حصول مفت) مجھ سمیت ہر قاری اور لکھاری کی دیرینہ خواہش اور تقاضا ہے۔ ادب کی ترویج و ترقی کیونکر ممکن ہے؟ آپ نے اپنے اداریے میں کھل کر اس بات اور ان خدشات کا اظہار کیا۔ حصہ نظم و نثر سے ''تخلیق'' کا معیار سابقہ روایات کا آئینہ دار ہے۔ آپ اور آپ کے رفیق کار بہتری کے لیے سرگرداں نظر آتے ہیں۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔ غزلیات کے باب میں آپ نے محترم آصف ثاقب کو اُن کے اصل مقام و مرتبہ سے گرا دیا ہے۔ میں اپنے تئیں اس ناانصافی اور بے قدری کی شدید الفاظ میں مذمت کرتا ہوں۔ کم و بیش پانچ جونیئر شاعروں کو موصوف پر فوقیت دی گئی۔ (قبل ازیں) امید ہے آپ ازالہ کریں گے۔ ''انجمن خیال'' خیالات اور تاثرات کے ذیل میں پڑھی گئی۔

تصور اقبال (فتح جنگ)

.....

﴿19﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ ''تخلیق'' جون 2013ء کا شمارہ موصول ہوا۔ سرِ ورق بہت خوب تھا۔ مضامین میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا ''علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم'' ڈاکٹر انور سدید کا ''اقبال سے شناسائی'' اور پروفیسر جمیل آذر کا ''پیار کا امرت رس'' بہت پسند آئے۔ انشائیہ رُکوع میں جانے کی ادا بہت متاثر کن اور منفرد تھا۔ سیّد مشکور حسین نے بہت خوبصورتی سے یہ انشائیہ تخلیق کیا ہے۔ وزیر آغا سے متعلق اظہر جاوید کا تحریر کردہ خاکہ ''وزیر آغا۔ عظیم اہلِ قلم بے مثال انسان'' سے آغا صاحب کی شخصیت کے کئی گوشے سامنے آئے۔ خاکہ وزیر آغا سے اظہر جاوید کی محبت کا عکاس ہے۔

ندیم ہاشمی (کراچی)

.....

﴿20﴾ برادرم سونان اظہر جاوید صاحب!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ شکریہ! آپ جس توجہ اور لگن سے ''تخلیق'' کو شائع کر رہے ہیں، آپ کو اس کی داد دیتا ہوں۔ دیپک بدکی صاحب نے اظہر جاوید صاحب کے حوالے سے مضمون بھیجا تھا جو میرے رسالہ ''فکرِ نو'' میں شامل ہے۔''

مسعود تنہا (مدیر فکرِ نو لاہور)

.....

﴿21﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ مضامین کا آغاز ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم پر لکھی تحریر سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نظم کے کئی نئے پہلو اجاگر کئے۔ انور سدید کے لئے تو دل سے انکی درازی عمر کیلئے دعائیں نکلتی ہیں۔ وہ الحمرا اور تخلیق کی جان ہیں۔ پروفیسر جمیل آذر نے اظہر جاوید کو محبت سے یاد کیا ہے اور ان کے مجموعہ کلام ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کا ذکر کر کے ایک مرتبہ پھر اس کا مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ حصہ نظم کا آغاز نسرین نکہت سبزواری کی دلکش حمد سے ہوئی ہے۔ جس کے پہلے شعر ہی میں کیا حقیقت بیان کی ہے :

جو بھی مل جائے، ہے خوشی تیری خواب میرے ہیں، زندگی تیری

امجد اسلام امجد کی نظم پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ اعزاز احمد آذر کے ماہیے اور نور زمان ناوک کے دوہے بھی خوب ہیں۔ خصوصاً اس دوہے کا جواب نہیں۔

لاکھوں دیکھے کرتے ہیں بھگوان کا جو انکار گندم کا منکر نہ دیکھا ڈھونڈ پھرے سنسار

افسانوں میں سب سے پہلے مفتی جی کے پیروکار ابدال بیلا ''بین بجاؤ'' لے کر آئے ہیں۔ ابدال بیلا میرے پسندیدہ مصنف ہیں۔ ان کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' پر میں نے کتابی سلسلہ ''اجمال'' میں تبصرے کی ناچیز کوشش کی تھی۔ اس انتہائی دلچسپ ناول کا میں نے کہیں اور ذکر نہیں سنا۔ بین بجاؤ میں بھی ابدال بیلا نے منفرد انداز میں اپنے ہی سانپ سے دنیا کو بیوقوف بنانے والوں کا ذکر کیا ہے۔ کیا عمدہ پیغام ہے۔ عطیہ سید اور پروین عاطف کے افسانے بھی اچھے ہیں۔ لیکن عذرا اصغر کے

نعیم الرحمٰن (کراچی)

افسانے ''وقت تتلی تھا'' نے جانوروں کے بارے میں لکھنے والے منفرد افسانہ نگار سید رفیق حسین کی یاد تازہ کر دی۔ اس انوکھی تحریر کے ذریعے عذرا اصغر نے بے زبان جانور کی وفاداری کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

﴿22﴾ محترم سونان اظہر!

جون کے ''تخلیق'' میں تخلیق کاروں کی تحریریں جاندار و شاندار لگیں، ''تخلیق ایوارڈ'' کا اجراء قابلِ تحسین قدم ہے۔ آپ کے معاونین یقیناً اس کو کامیابی سے ہمکنار کریں گے۔ علامہ اقبال پر ڈاکٹر زکریا کا مضمون بے حد معلوماتی ہے۔ فارسی زبان کی اپنی ایک لذت ہے۔ پروفیسر جمیل آذر صاحب نے محترم اظہر جاوید صاحب کے محبت سے بھرپور اشعار اپنے مضمون میں رنگ بھرے اور تحریر کا حُسن نکھر گیا۔ جنسِ مخالف پر محسوسات کا اثر قلبی اور جذباتی انداز میں جس طرح ان پر وارد ہوا، اشعار میں ان کا اظہار مطالب کو واضح کر گیا۔

اشعار کی خوشبو بھری محفل میں نگہت سبزواری، امجد اسلام امجد، اعزاز احمد آذر نے خوب رنگ جمایا۔ پروین عاطف کی ''فرار'' ایک ایسے انسان کی بپتا محسوس ہوئی جو محبت سے فرار چاہتا تھا۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو محبت سے قطعی بے بہرہ ہوں۔ ''جنازہ'' اعصاب شکن تحریر لگی۔ تمکین کی موت جسمانی تو تھی ہی مگر روحانی طور پر وہ کب کی مردہ ہو چکی تھی۔ محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ دماغ سے ہوتا تو .....نظر انداز کر دیتا۔ مگر یہ دل کے معاملے بھی بے حد نازک ہوتے ہیں۔ ''تہہ سنگ'' بھی ایسی تحریر ثابت ہوئی۔ میرا کنبہ، خوف کے سائے، نیل کی واپسی، مستحق، بے مثال تحاریر تھیں۔ اظہر جاوید کا تخیلاتی افسانہ ''گھر، کونسا گھر'' دلگداز تحریر تھی۔ آج کے دور کے موافق حالات کے مطابق غربت اور عید کا تعلق چوٹی اور آنسو جیسا ہے۔

ڈاکٹر طاہرہ بخاری نے جس انداز میں اظہر جاوید صاحب سے ملاقاتوں پر مضمون لکھا اسے پڑھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جہتوں کا ایک چشمہ تھے وہ جس سے بے شمار لوگ سیراب ہوئے اور اب تشنگی محسوس کر رہے ہیں۔ ''تخلیق'' کو رہتی دنیا تک اسی طرح شاد و آباد رہنا چاہیے، تاکہ اظہر صاحب کا نامِ گرامی بھی اسی طرح دمکتا رہے۔ آمین!

فصیحہ آصف خان (ملتان)

.....

﴿23﴾ برادرم سونان اظہر جاوید!

جب بھی ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ آتا ہے، اظہر جاوید کا یہ جملہ سماعتوں سے ٹکراتا ہے کہ ''تخلیق سے رابطہ رکھنا، شاد رہیں آباد رہیں۔ رب راکھا'' تو کلیجہ منہ کو آتا ہے ''مَیں اپنے من کو اب تک نہیں سمجھا سکا کہ اظہر جاوید کے علاوہ کسی اور کو مخاطب کر سکوں۔ آج بھی یہی کیفیت طاری ہے اور جب قلم اٹھایا تو بے ساختہ درج ذیل قطعہ موزوں ہو گیا ؎

یہ کان ترستے ہیں ترستے ہی رہیں گے — الفاظ تو موجود ہیں لہجہ نہ سُنیں گے
یہ کس نے کہا پیکرِ اخلاص ہیں معدوم — جبرانؔ مگر اب ہمیں اظہرؔ نہ ملیں گے

اللہ تعالیٰ آپ کو ''تخلیق'' جاری رکھنے کا حوصلہ اور ہمت دے۔ اس دفعہ کے ''بیلاگ'' میں اظہر جاوید صاحب کی غزلیں شامل ہیں۔

عزیز جبران انصاری (مدیر 'بیلاگ' کراچی)

◆◆◆

ماھنامہ 'تخلیق' کو موصول ھونے والے رسائل

سہ ماہی **اسباق** پونہ۔انڈیا مدیر : نذیر فتح پوری	ماہنامہ **شاعر** بمبئی انڈیا مدیر : افتخار امام صدیقی	ماہنامہ **انشا** کلکتہ۔انڈیا مدیر : ف۔س۔اعجاز
سہ ماہی **سرسبز** انڈیا مدیر : کرشن کمار طور	سہ ماہی **انتساب** انڈیا مدیر : سیفی سرونجی	ماہنامہ **غالب نما** نئی دہلی۔انڈیا مدیر اعلیٰ : پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
سہ ماہی **جزیرہ** جرمنی مدیران : طاہر عیدم۔عابد خورشید	ماہنامہ **شاداب** لاہور چیف ایڈیٹر : ڈاکٹر کنول فیروز	سہ ماہی **ماہِ نو** لاہور مدیر اعلیٰ : صفدر بلوچ
ماہنامہ **احساس** پشاور مدیر : ناصر علی سیّد	ماہنامہ **الحمرا** لاہور مدیر : شاہد علی خان	ماہنامہ **بیاض** لاہور مدیر : عمران منظور
ماہنامہ **ادبِ لطیف** لاہور چیف ایڈیٹر : صدیقہ بیگم	ماہنامہ **ادب دوست** لاہور مدیر اعلیٰ : خالد تاج	ماہنامہ **نیرنگ خیال** راولپنڈی مدیر اعلیٰ : سلطان رشک
ماہنامہ **سفید چھڑی** سرگودھا مدیر : پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال	ماہنامہ **چہارسو** راولپنڈی مدیر مسؤل : گلزار جاوید	سہ ماہی **شعر و سخن** مانسہرہ مدیر : جان عالم
ماہنامہ **صبحِ بہاراں** گوجر خان چیف ایڈیٹر: ذکاء اللہ شیخ	ماہنامہ **سپوتنک** لاہور مدیر اعلیٰ : آغا امیر حسین	ماہنامہ **حکایت** لاہور مدیر : عارف محمود
سہ ماہی **بیلاگ** کراچی مدیر اعلیٰ : عزیز جبران انصاری	ماہنامہ **ہمدرد صحت** کراچی مدیر اعلیٰ : سعدیہ راشد	ماہنامہ **تارکینِ وطن** لاہور چیف ایڈیٹر : منظور شاہد
ماہنامہ **پکھیرو** لاہور چیف ایڈیٹر : اصغر سہیل	ماہنامہ **خزینہ علم و عمل** لاہور مدیر اعلیٰ : خالد مقبول عارف	سہ ماہی **پاک جمہوریت** لاہور مدیر اعلیٰ : سیّد عاصم حسنین
سہ ماہی **ادبی ڈائجسٹ** کراچی مدیر : ضیاالرحمٰن ضیاء	ماہنامہ **روشنائی** کراچی مدیر : احمد زین الدین	ماہنامہ **سوجھرو** کراچی ایڈیٹر : تاج بلوچ
ماہنامہ **آہنگ** کراچی مدیر اعلیٰ : کنور مومن خان مومنؔ	ماہنامہ **منشور** کراچی چیف ایڈیٹر : طفیل عباس	ششماہی **عمارت کار** کراچی مدیر : حیات رضوی امروہوی

﴿ادارہ ''تخلیق'' تمام مدیران کا شکر گزار ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ اپنے رسائل بھجوا رہے ہیں﴾

ماھنامہ 'تخلیق' کو موصول ھونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	پبلشر	قیمت
-1	موسم کبھی بدلے	حسن عسکری کاظمی	اظہار سنز، لاہور	300/-
-2	وجدانِ سجدہ	بشیر زیدی اسیرؔ	کلاسیک، دی مال لاہور	250/-
-3	بابونگر (طنز و مزاح)	حسین احمد شیرازی	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	1000/-
-4	فخرِ دو عالم	رشید آفرین	الحمد پبلی کیشنز، لاہور	400/-
-5	نمک پارے	مبشر علی یزدی	شہزاد، کراچی	250/-
-6	پہلا آدمی (افسانے)	شاہد رضوان	دانیال پبلشرز، چیچہ وطنی	250/-
-7	غالبؔ۔فکر و آہنگ	ڈاکٹر تحسین فراقی	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی انڈیا	150/-
-8	منظر بچشمِ غالب	پروفیسر وہاب قیصر	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، انڈیا	200/-
-9	آؤ بھائی کھیلیں (افسانے)	نجم الدین احمد	بک ہوم، لاہور	400/-
-10	خوشبو ہے تو بکھر جائے گی	سیمی کرن	ساگر پبلی کیشنز، لاہور	300/-
-11	سفرِ حج	شاہین زیدی	علم و عرفان پبلشرز، لاہور	200/-
-12	یادوں کی بارشیں	بسمل صابری	جمہوری پبلی کیشنز، لاہور	550/-
-13	سوچیں	ذوالفقار علی قادری	نقش پبلی کیشنز	500/-
-14	غالب نامہ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، انڈیا	100/-
-15	غالب اور جہانِ غالب	پروفیسر حنیف نقوی	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، انڈیا	200/-
-16	خدا بخش لائبریری جرنل	ڈاکٹر امتیاز احمد	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	400/-
-17	خدا بخش لائبریری جرنل	ڈاکٹر امتیاز احمد	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	400/-
-18	پھولوں کی رفوگری	دردانہ نوشین خان	بیکن بکس، اُردو بازار، لاہور	160/-
-19	خامہ بہ جوش	فصیح الدین	گوشۂ ادب، جناح روڈ، کوئٹہ	495/-
-20	طوفان کے بعد	سیما پیروز	دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد	290/-

﴿تبصرے کے لیے کم از کم دو کتابیں ارسال فرمائیے.....ادارہ ''تخلیق''﴾